ہندوستانی معاشیات کے مبادی

سلسلۂ مطبوعات انجمن طیلسانیین عثمانیہ
(۱۴)

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

(مع)

خصوصی تفصیلات مملکت آصفیہ

(از)

شرف الدین، بی، اے (عثمانیہ)
اعزازی معتمد مجلس نمائش معاشی کمیٹی حیدرآباد

طبع ثانی ۱۹۴۶ء ۵۰۰ — مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن — قیمت دو روپیے آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ:- دفتر انجمن امداد باہمی بلا سودی طیلسانیین عثمانیہ نمائش گاہ باغ عام حیدرآباد دکن۔

مؤلف کی جانب سے اس تالیف کو عالی جناب نواب
زین یار جنگ بہادر صدر مجلس نمائش معاشی کمیٹی و معزز
صدر المہام تعمیرات سرکار عالی) کے نام سے معنون کیا جاتا ہے۔

فہرست مضامین

ب

ہندوستان میں تحریک امداد باہمی۔ زرعی قرضہ کی بنیادی انجمن کا دستور اور کام تحریک امداد باہمی کے فوائد مملکت آصفیہ اور امداد باہمی کی تحریک۔ امداد باہمی کے بعض اصلاحی تدابیر۔ زمین گروی بنک۔ سررشتۂ زراعت کا ارتقا، سررشتۂ زراعت کا کام۔ سررشتۂ زراعت سرکار آصفیہ۔ دیہی تنظیم دیہی تنظیم مملکت آصفیہ میں۔ جنگ کے زمانہ میں زرعی پالیسی۔ ہندوستان کی مالگذاری پر تاریخی نظر۔ دوامی بندوبست و عارضی بندوبست۔ بندوبست کی قسمیں تشخیص مالگذاری کا اصول۔ نظریہ رکارڈو اور ہندوستان میں مسئلہ مالگذاری۔ حیدرآباد کا نظام مالگذاری۔

چوتھا باب (۱۲۱ تا ۱۶۴)

صنعتی ترقی

صنعتی ترقی کے فوائد۔ ہندوستان کی حالیہ صنعتی تاریخ کی چند عہد آفریں خصوصیتیں۔ حکومت کی صنعتی پالیسی۔ تامین اور حکومت کی امداد۔ زمانۂ جنگ میں حکومت کی صنعتی تامنیں۔ سرکار عالی اور صنعتی ترقی۔ ہندوستانی صنعتیں۔ حیدرآباد کی صنعتیں۔ گھریلو صنعتوں کی بقا۔ مملکت آصفیہ کی گھریلو صنعتیں گھریلو صنعتوں کے امداد کے طریقے۔ سرکار عالی اور گھریلو صنعتیں۔

ہندوستانی مزدوروں کی خصوصیات۔ مزدوروں کے مفاد کیلئے قانون سازی۔ قوانین کارخانہ سرکار عالی۔ مکانات۔ رفاہی کام۔ تحریک مزدور سبھا۔ ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی کا نقص صنعتی ہم آہنگی۔

پانچواں باب (۱۶۵ تا ۲۰۰)

حمل و نقل اور تجارت

حمل و نقل کی اہمیت ریلوے کی قدیم تاریخ۔ ریلوے کی حالیہ تاریخ۔ ریلوں کے معاشی اثرات۔ ریلوں کی مزید ترقی کی ضرورت۔ مملکت آصفیہ میں ریلوے۔ سڑکوں کی حالیہ تاریخ۔ ہندوستانی سڑکوں کی اہم خصوصیت۔ مزید سڑکوں کی ضرورت۔ ریلوے لائن اور سڑکوں کے مابین ارتباط۔ سڑکوں کی جدید پالیسی حیدرآباد میں سڑکیں۔

اندرون ملک کی آبی راہیں۔ بحری حمل و نقل۔ ہندوستانی تجارتی جہاز رانی۔ ہوائی جہاز۔ حیدرآباد میں ہوائی حمل و نقل۔

چھٹا باب (۲۰۱ تا ۲۴۱)

زر۔ قیمتیں۔ اور بنک کاری

ساتواں باب (۲۴۲ تا ۲۷۰)

مالیات

پیش لفظ

زیر نظر کتاب "ہندوستانی معاشیات کے مبادی" میرے عزیز شاگرد شرف الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کی تالیف ہے شرف الدین صاحب علاوہ اپنی سرکاری ملازمت کے گذشتہ سات سال سے مجلس نمایش معاشی کمیٹی حیدرآباد کے اعزازی معتمدی کا کام سرگرمی سے انجام دے رہے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ باوجود ان مصروفیتوں کے اس علمی خدمت کے لئے بھی وقت نکال سکے۔

اس تالیف میں انگریزی کتاب (THE ELEMENTS OF INDIAN ECONOMICS 1941.) مصنفہ جتھار و بیری سے بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے، اور اکثر اعداد و شمار بھی اسی سے لئے گئے ہیں۔ اولاً وہ مجلۂ طیلسانیئین میں قسط وار شائع ہوتی رہی، اور اب کتابی صورت میں منظر عام پر لائی گئی ہے۔ اس کتاب میں برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کی معاشی زندگی سے متعلق بھی اجمالی حالات ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اور اس غرض کے لئے زیادہ تر "قلمرو آصفی کی دولت" مصنفہ (حافظ محمد مظہر صاحب) انگریزی کتاب (THE ECONOMIC LIFE OF HYDERABAD, 1937.) اور نظم و نسق کی سرکاری رپورٹوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

بہر حال اردو زبان میں عملی معاشیات پر یہ عام فہم کتاب اس بات کی مستحق ہے کہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یقین ہے کہ وہ اردو داں طبقے کے لیے عموماً اور معاشیات کے طلبہ کے لئے خصوصاً بہت مفید ثابت ہوگی۔ فقط۔

مورخہ یکم مئی ۱۹۴۵ء
حیدرآباد دکن

حبیب الرحمن
ناظم سررشتہ تجارت و حرفت سرکار عالی

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

پہلا باب

قدرتی ذرائع اور آبادی

معاشیات ہند کا مفہوم عام طور پر معاشیات ہند سے مراد ہندوستان کے معاشی مسائل کا مطالعہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے معاشی حالات اور ان سے متعلقہ امور کی تشریح و نیز اصلاحی تدابیر سے بحث کی جائے اس بحث سے مقصد محض علم کی تحصیل نہیں ہے بلکہ اس کے سوا یہ دریافت کرنا بھی ہے کہ کس طرح ملک اور اہل ملک کو دولتمند اور خوشحال بنایا جاسکتا ہے

بیان کی وسعت اس باب میں ہندوستان کی ہیئت طبعی، قدرتی ذرائع، کیفیت آبادی، عمرانی اور مذہبی اداروں کے معاشی پہلو سے بحث کرنی مقصود ہے اس سلسلہ میں مملکت حیدرآباد کے متعلق بھی ضروری امور کی صراحت کی جائے گی

ہیئت طبعی اور قدرتی ذرائع

(معاشی جغرافیہ ہند)

رقبہ اور آبادی سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق برطانوی ہند کا رقبہ دس لاکھ ۹۶ ہزار ایک سو ۷۱ مربع میل اور آبادی ۲۹ کروڑ ۶۰ لاکھ نفوس ہے اس کے علاوہ دیسی ریاستوں اور ایجنسیوں کا رقبہ ۷ لاکھ ۱۱ ہزار ۳۲ مربع میل اور آبادی ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ اس طرح مجموعۂ ملک کا کل رقبہ ۱۸ لاکھ ۷ ہزار دو سو تین

مربع میل اور آبادی ۳۸ کروڑ ۹۰ لاکھ نفوس ہے ملک کا طول شمالاً جنوباً تقریباً دو ہزار میل اور شرقاً غرباً تقریباً دو ہزار ایک سو میل ہے سرحدی رقبہ تقریباً چار ہزار چھ سو اور ساحلی علاقہ چار ہزار تین سو میل کے قریب ہے اس طرح ہندوستان بجائے خود ایک دنیا ہے۔ جو برطانیہ عظمیٰ سے تیرہ گنا اور روس کو نکال کر پورے براعظم یورپ کے برابر ہے اور اس کی آبادی دنیا کی مجموعی آبادی کا ۱/۵ حصہ ہے۔ مملکت حیدرآباد کا رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ ۶۳ لاکھ ۳۸ ہزار ۵ سو ۳۴ نفوس ہے۔ ملک برار کا رقبہ سترہ ہزار سات سو دس مربع میل ہے۔

جغرافی محل وقوع ہندوستان کی قدرتی سرحدیں بہت نمایاں ہیں۔ شمال میں ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے شمال مغرب میں کوہ ہندوکش اور کوہ سلیمان اور شمال مشرقی سرحد پر برما ہے جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے قبل برطانوی ہند میں شامل تھا۔ درۂ خیبر اور درۂ بولان ہندوستان کے واحد خشکی کے راستے ہیں جو ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر واقع ہے اور ہندوستان کو افغانستان و بلوچستان سے ملاتے ہیں۔ ہندوستان کا ساحل مغرب میں بحیرۂ عرب اور مشرق میں خلیج بنگال سے گھرا ہوا ہے۔ اس طرح سمندری راستے سے ہندوستان میں آمد و رفت بہت آسان ہے دنیا کے دیگر حصص کے مقابلہ میں ہندوستان کو بین الاقوامی تجارت کے لیے بہت اچھے مواقع حاصل ہیں کیونکہ یہ ملک مشرقی نصف کرہ کے درمیان واقع ہے۔ اور اس طرح اس کو ہر سمت کے تجارتی راستوں پر قابو حاصل ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں قدرتی بندرگاہوں کی کمی ہے۔ اسکی وجہ سے جدید طرز کے بڑے جہازوں کو ٹھیرانے میں مشکل پیش آتی ہے۔ مغربی ساحل پر صرف کراچی، بمبئی، گوا اور کوچن کی بڑی بندرگاہیں ہیں مشرقی ساحل پر کوئی قدرتی بندرگاہ نہیں ہے۔ مدراس کی بندرگاہ کی موجودہ اہمیت کثیر اخراجات کی رہین منت ہے اسی ساحل پر ویزاگاپٹم واسحاق پٹن، والٹر کی بندرگاہیں تدریجاً اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہیں خلیج بنگالہ کے ساحل پر کلکتہ کا محل وقوع قدرتاً بہت اچھا ہے۔ لیکن ہگلی کی وجہ سے مزاحمت ہوتی ہے اور کیچڑ کو ہمیشہ صاف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چٹاگانگ کی بھی یہی حالت ہے۔ اس لیے بڑی آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہندوستان کی تجارت خارجہ بڑی حد تک صرف چار بندرگاہوں، یعنے کلکتہ، بمبئی، مدراس اور کراچی تک ہی کیوں محدود ہے۔ ساحلی اور سمندری تجارت کے مفاد کی غرض سے جدید

اور قدیم اجڑی ہوئی بندرگاہوں کی از سر نو تعمیر فوری طور پر اختیار کی جا رہی ہے۔

ہندوستان کی موجودہ جہاز رانی کی حالت ناقابل اطمینان ہے۔ بمشکل ہی کوئی تجارتی جہاز ایسا ہوگا جو ہندوستان کی قدیم جہاز رانی کی روایات کو برقرار رکھتا ہو، جہاز رانی کے سلسلے میں ایک قومی اقدامی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت پر باب پنجم میں بحث کی گئی ہے۔

جہاں تک اندرونی حمل و نقل کا تعلق ہے ہندوستان کی بڑی بندرگاہوں کو تجارتی مرکزوں سے متحد کرنے کے لئے ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ داخلی حمل و نقل کیلئے شمالی ہند میں سندھ اور گنگا، جیسے قابل جہاز رانی دریاؤں کی وجہ سے سہولتیں موجود ہیں۔ اور وسیع میدانوں کی بدولت سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر میں آسانی ہوتی ہے۔ جنوبی ہند میں ایسی سہولتیں پائی نہیں جاتیں کیونکہ یہ علاقہ ناہموار اور پہاڑی ہے اور سال تمام بہنے والے بڑے دریاؤں کی کمی ہے ہندوستان کے دیہی علاقوں میں ذرائع حمل و نقل یعنے ریل اور سڑک کی حالت بہت خراب اور فوری توجہ کی محتاج ہے۔ ڈاکخانہ اور تار گھر اب ہندوستان میں کافی طور پر مانوس اور وسعت پذیر ہیں۔ لیکن ٹیلیفون اور لاسلکی جن کی اہمیت موجودہ تجارت اور معاشی جدوجہد میں پوری طرح مسلم ہو چکی ہے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہیں۔ ٹیلیفون کا استعمال صرف بڑے شہروں تک محدود ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی اندرونی حمل و نقل کی جدید سہولتوں کے باعث شہری آبادی سے دیہاتی معاشی زندگی کی بیگانگی اب افسانۂ ماضی بن چکی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم ہندوستان حسب ذیل تین نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے تین نمایاں حصوں ہیں۔ (۱) جزیرہ نمائے دکن (۲) دریائے سندھ اور گنگا کا میدان (شمالی ہندوستان) (۳) کوہستان ہمالیہ

(۱) جزیرہ نمائے دکن یہ ایک بلند سطح مرتفع ہے۔ جسے بندھیاچل اور ست پڑا کے پہاڑی سلسلے دریائے سندھ اور گنگا کے میدانوں سے جدا کرتے ہیں۔ اس کے متصل ساحلی سلسلے ہیں جو مغربی گھاٹ اور مشرقی گھاٹ کے نام سے موسوم ہیں یہ ایک مثلث نما حصہ ہے

جس کا سرا راس کماری کہلاتا ہے دکن کی یہ سطح مرتفع ناہموار اور پتھریلی ہے یہ پہاڑیوں کی چوٹیاں جنگلی درختوں سے کم و بیش ڈھکی ہوئی ہیں مغربی گھاٹ کا سلسلہ ایک مسلسل بحری دیوار کا کام دیتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلے باد برشگال کو روکتے ہیں۔ جس کے باعث بارش لازماً پہاڑی حدود اور سمندر کے درمیانی تنگ قطعہ پر ہی جو کوکن کہلاتا ہے ہوتی ہے لامحالہ اندرونی حصہ خشک اور قحط زدہ رہتا ہے

مملکت حیدرآباد بھی اسی جزیرہ نما میں واقع ہے اس مملکت کو دو نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک مغربی حصہ اور دوسرا مشرقی حصہ۔ پہلا حصہ مرہٹواڑی کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ تلنگانہ۔ یہ حصے نہ صرف معاشرتی لحاظ سے بلکہ طبعی لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

دکن کے بڑے دریا نربدا، تاپتی، مہاندی، کرشنا اور کاویری ہیں، ان دریاؤں کا انحصار بارش پر ہے اور ہمالیہ کے دریاؤں کی طرح ہمیشہ بہتے نہیں رہتے۔ جہاں برف پگھلنے کی وجہ سے موسم گرما میں بھی پانی موجود رہتا ہے۔ جنوبی ہند کے دریا نہ صرف موسم گرما میں خشک ہی ہوجاتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض دریاؤں کا راستہ پہاڑی دروں میں سے ہوکر گزرتا ہے جس کی وجہ سے جہاز رانی ناممکن اور مصارف آبپاشی گراں ہوجاتے ہیں۔

مملکت آصفیہ میں دو بڑے دریا گوداوری اور کرشنا بہتے ہیں، دریائے گوداوری ممالک محروسہ کے ضلع اورنگ آباد میں داخل ہوتا ہے اور آٹھ اضلاع کے حدود سے گزرتا ہوا شمالی سرکار میں داخل ہوجاتا ہے۔ دریائے گوداوری مملکت آصفیہ میں چھ سو میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ اس کے معاون دریاؤں میں پین گنگا، وردھا، مانجرا اور مانیر قابل تذکرہ ہیں۔ دریائے کرشنا مملکت کے جنوبی اضلاع میں سات سو میل سے زاید مسافت طے کرتا ہے۔ اس کے اہم معاون بھیما، موسیٰ اور تنگبھدرا ہیں۔

دکن کی اصلی پیداوار باجرا، چاول، روغنی تخم، نیشکر، دالیں، کپاس، چائے، کافی اور مسالے ہے ساگوان، سال، صندل اور ناریل، اس علاقہ کے خاص درخت ہیں۔

(۲) سندھ اور گنگا کا درمیانی علاقہ۔ یہ علاقہ جزیرہ نمائے دکن اور کوہ ہمالیہ کے درمیان

واقع ہے جس کو دو دریا عرضاً ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہیں۔ اس طرح دریائے سندھ اور
اس کے معاون مغرب میں اور دریائے گنگا اور اس کے معاون مشرق میں اس علاقہ کو سیراب کرتے
ہیں سندھ اور گنگا کا درمیانی علاقہ دریاؤں اور ان کے کاد پر مشتمل ہے جو بہت زرخیز اور دنیا کا
وسیع ترین اور مسطح زراعتی رقبہ ہے اس کے ہمالیائی دریا ہمیشہ رواں رہتے ہیں۔ یہ زرخیز علاقہ
قدیم آریائی اور ماقبل آریائی تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ اور یہ ملک کا قدرتی گودام بھی ہے۔ بعض دریا
مثلاً برہمپترا، گنگا اور سندھ کشتی رانی کے قابل ہیں۔ ریلوں کے جاری ہونے سے قبل یہی دریا
زیادہ تر تجارتی حمل و نقل کی شاہ راہ کا کام انجام دیتے تھے، ان دریاؤں کے پانی سے ہی کارہائے
آب رسانی کا وہ کام لیا جاتا ہے جس پر پنجاب، سندھ اور صوبہ متحدہ کی خوش حالی کا بڑی حد
تک انحصار ہے۔ سندھ و گنگا کے میدان کی خاص پیداوار گیہوں، جو، جوار، نیشکر، روغنی تخم، چاول،
کپاس، جوٹ، نیل اور افیون ہے، ترکاریاں بکثرت اور مختلف اقسام کی ہوتی ہیں۔ شمالی حصہ میں
سال، صوبہ متوسط میں ساگوان اور بنگال میں شہتوت کے درخت پائے جاتے ہیں۔ زرخیزی کی
وجہ سے سندھ، گنگا کا درمیانی علاقہ ہندوستان کا سب سے زیادہ آباد خطہ ہے۔

(۳) کوہستان ہمالیہ۔ شمال میں سندھ و گنگا کے میدانوں پر کوہستان ہمالیہ گویا اپنا
سایہ ڈالے ہوئے ہے ہمالیہ کے پہاڑ دنیا کے بلند ترین پہاڑ شمار ہوتے ہیں۔ ان کی لمبائی ۱۵۰۰ میل
ہے اور پورے کوہستان ہمالیہ کا طول دو ہزار میل سے زیادہ ہے، یہی پربت ہندوستان کو وسطی
ایشیا سے جدا کرتا ہے۔ ناقابل عبور ہونے کے اعتبار سے ہمالیہ کے پہاڑ ہندوستان کی سیاسی
حیثیت پر ہمیشہ سے اثر انداز ہیں اس سے قطع نظر بارش، موسمی ہواؤں، گرمی، سردی، رطوبت
اور کاشت پر بھی ان پہاڑوں کا اثر پڑتا ہے اور اس طرح ملک کے معاشی حالات بہت نمایاں
طریقے پر متاثر ہوتے ہیں۔ اس سے باد برشگال کیا ٹکراتی ہے، جل تھل ایک ہو جاتے ہیں۔ ہمالیائی
دریاؤں کے معاشی فوائد کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ہمالیہ کے آبشاروں میں آبی
قوت برقی کے بھی امید افزا امکانات پائے جاتے ہیں یہ نباتات کی روئیدگی کا بہترین ذریعہ ہوتے

کے علاوہ ان سے قیمتی جنگلات کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ جو بالآخر خود بارش کا موجب ہو جاتے ہیں
آب و ہوا اور موسم ۔ یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا کے متعلق کسی عمومی رائے
کا اظہار کیا جائے ہر قسم کی آب و ہوا جو منطقہ ہائے حارہ و معتدلہ کی خصوصیت ہے یہاں پائی
جاتی ہے بحیثیت مجموعی ہندوستان کی آب و ہوا نیم گرم کہلائی جا سکتی ہے جنوبی ہند کا درجۂ
حرارت جو خط استوا کے قریب واقع ہے سال بھر بہت بلند رہتا ہے۔ اس لئے موسموں میں کوئی
نمایاں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند کی خصوصیت یہ ہے کہ شدت کی سردی اور
گرمی پڑتی ہے۔ جیکب آباد میں تو بعض وقت موسم گرما میں حرارت سایہ میں ۱۲۵ درجہ پہنچ جاتی
ہے موسم سرما میں پارہ ۲۵ درجہ تک نیچے اتر آتا ہے ہندوستان کے جن حصوں میں موسم کی
تفریق پائی جاتی ہے وہاں موسم تین ہوتے ہیں۔

(۱) سرد و خشک موسم یعنی موسم سرما جبکہ شمالی تجارتی ہوائیں چلتی ہیں (۲) مرطوب موسم
جبکہ جنوب مغربی باد برشکال چلتی ہے (۳) گرم و خشک موسم بارش سے قبل عموماً اس زمانہ
میں سخت طوفان کے ساتھ موسم اچانک بدلا بھی کرتا ہے۔

مملکت حیدرآباد کی آب و ہوا سال کے بڑے حصے میں خوشگوار رہتی ہے۔ یہاں تین نمایاں
موسم پائے جاتے ہیں۔ (۱) جاڑا۔ جو اکتوبر سے شروع ہو کر جنوری کے آخر تک رہتا ہے۔
(۲) گرمی۔ فروری سے شروع ہو کر جون تک رہتی ہے۔ (۳) بارش اسکا موسم جولائی سے ستمبر
تک رہتا ہے۔

بارش ۔ ہندوستان کی آب و ہوا کی طرح یہاں کی بارش میں بھی نمایاں اختلاف
پایا جاتا ہے۔ مثلاً چراپونجی میں جو آسام کی پہاڑیوں میں واقع ہے سالانہ ۴۶۰ - انچ بارش کا تخمینہ
کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف شمالی سندھ میں سال بھر میں ۳ - انچ سے بھی کم بارش ہوتی ہے۔
آب و ہوا کے اعتبار سے جزیرہ نمائے ہند الیشائی برشکالی خطہ کا حصہ ہے اور دوسرے خطوں
کے مقابلہ میں اس حصے کو موسمی ہوائیں پوری طرح مستفید کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندوستان

میں بارش کا ایک خاص موسم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انگلستان میں کسی وقت بھی بارش
ہو سکتی ہے۔ باد برشگال یا مانسون کی اصطلاح ہواؤں کی تبدیلی کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔
باد برشگال سارے ملک میں چلتی ہیں اور موسم کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ ان ہواؤں
کو جنوب مغربی باد برشگال اور شمال مشرقی باد برشگال کہا جاتا ہے۔ موسم گرما میں زمین بحر
ہند کی موجوں سے زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ جون کے مہینہ میں مرطوب ہوائیں بحر ہند سے خشکی
حصوں کیطرف چلتی ہیں۔ ۱۵ جولائی تک جنوب مغربی باد برشگال تمام ہندوستان میں پھیل
جاتی ہے۔ یہ ہوائیں دکن میں جنوب مغربی گنگا کے ڈیلٹا میں جنوبی اور وادی گنگا میں جنوب
مشرقی رُخ پر چلتی ہیں۔ دریائے سندھ کی وادی میں سب سے آخر میں یہ ہوائیں پہنچتی ہیں
اور ختم بھی سب سے پہلے یہیں ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں سالانہ بہت کم بارش ہوتی
ہے۔ باد برشگال پہلے مغربی گھاٹ سے ٹکراتی ہے۔ اس لئے بارش یہاں شدت سے ہوتی
ہے۔ پھر ہمالیہ پر ان ہواؤں سے بارش کی شدت اپنا زور دکھاتی ہے۔ ستمبر میں باد برشگال
کا زور تیزی کیساتھ گھٹنے لگتا ہے جنوب مغربی باد برشگال سے تمام ہندوستان میں بارش ہوتی
ہے اور ملک کی مجموعی بارش کا تقریباً نوے فیصد حصہ اسی باد برشگال کا نتیجہ ہے۔ اس باد برشگال
سے ہندوستان میں ہواؤں کے دو دھارے پیدا ہوتے ہیں ایک بحیرۂ عرب کا دھارا اور دوسرا
خلیج بنگال کا دھارا۔ پہلے دھارے سے ہندوستان کے مغربی ساحل جزیرہ نمائے ہند، ہند
متوسط اور راجپوتانہ میں بارش ہوتی ہے۔ خلیج بنگال کے دھارے سے بنگال، آسام اور بہار
میں بمقدار کثیر بارش ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ دھارہ ہمالیہ پہ جاکر رک جاتا ہے۔ اس کے
بعد یہ مغرب کی طرف پلٹتا اور بحیرۂ عرب کے دھارے سے جا ملتا اور پنجاب سے بنگال
کے تمام خطوں میں ایک معتدل بارش کا سبب ہو جاتا ہے۔

شمال مشرقی باد برشگال سے جو بارش ہوتی ہے۔ اس کی مقدار مجموعی سالانہ بارش
کا ۱۰ فیصدی حصہ ہے یہ درحقیقت جنوب مغربی باد برشگال کی رجعت ہے موسم سرما میں

زمین سمندر سے زیادہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور مرطوب ہوائیں خشکی سے سمندر کی طرف چلتی ہیں جس کی وجہ سے شمال مشرقی بادپرشکال وجود میں آتی ہے اس مرہائی بادپرشکال سے مدراس کے شمالی اور جنوبی علاقوں میں اکتوبر سے دسمبر تک بارش ہوتی ہے۔ ہندوستان کے دوسرے اقطاع مثلاً حیدرآباد، برار، صوبہ متوسط کا کچھ حصہ بمبئی اور پنجاب کو بھی اس شمال مشرقی بادپرشکال سے خاص فائدہ پہنچتا ہے۔

ہندوستان میں بادپرشکال ہی سے فصلوں کے اوقات معین ہوتے ہیں۔ پہلی فصل جو خریف کہلاتی ہے جون میں بوئی جاتی ہے اور موسم خزاں میں کاٹی جاتی ہے۔ خریف کی پیداوار، چاول، کپاس اور باجرہ ہے۔ دوسری فصل بادپرشکال کے اختتام پر وسط ستمبر میں بوئی جاکر جنوری اور مارچ کے درمیان کاٹی جاتی ہے۔ اس کو فصل ربیع کہتے ہیں۔ گیہوں، جو اور السی ربیع کی پیداوار ہے۔

سالانہ بارش کو ملک کیلئے خاص اہمیت حاصل ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی زندگی کا دارومدار زراعت پر ہو تو مقدار بارش میں تغیرات، تقسیم اور اس کے اوقات ہی پر اہل ملک کے افلاس یا خوشحالی کا انحصار ہوتا ہے۔ بارش کا اثر ملک کے ہر شعبہ زندگی پر پڑتا ہے ملک کی صنعت و حرفت تجارت اور مالیات کی بہتری کا انحصار زراعت پر ہے اور زراعت کی بہتری بادپرشکال اور خصوصاً جنوب مغربی بادپرشکال کے رحم و کرم پر موقوف ہے۔

سالانہ بارش میں جو عدم یکسانیت ہے اس کے نظر کرتے ملک کے حسب ذیل خطے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

(۱) یقینی بارش کا خطہ۔ مثلاً آسام، مشرقی اور جنوبی بنگال اور مغربی ساحلی میدان۔

(۲) غیر معین بارش کا خطہ۔ مثلاً اودے پور، اجمیر، بمبئی، دکن جس میں مغربی گھاٹ شامل نہیں ہے

(۳) خشک سالی کا خطہ۔ مثلاً شمالی سندھ، مغربی راجپوتانہ اور مغربی پنجاب۔

مملکت حیدرآباد میں بارش کا سالانہ اوسط تقریباً ۳۱ انچ ہے۔ جنوب مغربی پرشکالی ہواؤں

سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ شمال مشرقی برشکالی ہواؤں سے بھی اوسطاً پانچ انچ تک بارش ہوجاتی ہے

مٹی کسی ملک کی ارضیاتی ترکیب کی مساحت میں بالائی سطح اور زیر زمینی سطح پر غور کیا جاتا ہے
ہندوستان میں طبقات الارض کی حسب ذیل شکلیں موجود ہیں۔

(۱) گادکا خطہ - یہ بہت وسیع خطے ہیں۔ اور زراعت کے اعتبار سے بہت ہی اہم، اس میں سندھ کا بیشتر حصہ، گجرات، راجپوتانہ، پنجاب، صوبہ متحدہ، بنگال اور مدراس کے اضلاع، گوداوری، کرشنا اور تنجاور شامل ہیں

گادکا ایک خطہ جزیرہ نمائے دکن کے مغربی اور مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے
گادکی مٹی جو قیمتی کیمیائی اور نامیاتی اجزا پر مشتمل ہوتی ہے بہت زرخیز ہوتی ہے۔ معتدل اور ایک متناسب تقسیم شدہ بارش سے خریف اور ربیع کی اکثر فصلیں اُگا سکتی ہیں۔

(۲) دکن ٹراپ - (سنگریزہ زمین) اس میں صوبہ بمبئی کا بیشتر حصہ، برار، صوبہ متوسط کا ایک تہائی مغربی حصہ اور حیدر آباد (دکن) کا مغربی حصہ شامل ہے، اس خطے کی زمینات اپنے خواص اور زرخیزی کے اعتبار سے باہم بہت مختلف ہیں۔ کپاس پیدا کرنے کی اصلی سیاہ مٹی دکن ٹراپ کے پہاڑوں کے دامن میں پائی جاتی ہے تاپتی اور نربدا کی وادیوں، گجرات کے میدانوں، کاٹھیاواڑ، کرناٹک اور صوبہ مدراس کے چند اضلاع میں یہ سیاہ مٹی کپاس اور جوار کی کاشت کے لئے مشہور ہے، اسمیں گیہوں السی اور چنا بھی اُگتا ہے۔ اس نوعیت کی زمینوں میں رطوبت کو جذب کرنے اور تری کو باقی رکھنے کی بھی بڑی صلاحیت ہے۔

(۳) خطہ کرسٹلائین - (قلم نما خطے) ہندوستان کی باقی زمینات کرسٹلائین خطہ سے موسوم ہیں، اس میں مدراس میسور، جنوب مشرقی بمبئی، مشرقی حیدر آباد اور صوبہ متوسط کا دو تہائی حصہ شامل ہے یوں بحیثیت مجموعی یہ خطہ کم زرخیز ہے۔ لیکن بعض نوعیتیں خصوصاً سرخ یا بھوری، سرخ چکنی مٹی اور میسور، و مدراس کی چکنی مٹی بہت زرخیز ہے۔ جہاں نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے وہاں اوسط درجہ کی کرسٹلائین مٹی کی خاص پیداوار چاول ہے۔ دوسری قیمتی فصلیں بھی تالابوں اور کنوؤں کی آبپاشی سے حاصل ہوتی ہیں۔

معدنیات - صنعتی کمیشن بابتہ ۱۹۱۸ء کی رائے میں ہندوستان کی معدنی دولت اس کی اکثر کلیدی صنعتوں کے لئے خام اشیاء کی پوری طرح سربراہی کرسکتی ہے۔ انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی ابتدا تک ہندوستانی معدنیات کو ترقی دینے کے سلسلہ میں کوئی عملی کام انجام نہیں دیا گیا۔ بہرحال بعد کی تحقیقات سے ایسے کئی اقسام کی معدنیں دریافت ہوچکی ہیں۔ جن سے دیہاتی صنعتوں کے فروغ کا امکان پیدا ہوگیا ہے۔ موجودہ ذرائع حمل و نقل کی ترقی ۱۹۱۴ء کی جنگ اور ہندوستان کی عام صنعتی ترقی سے معدنی پیداوار کو دیرپا فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

دوسری جنگ جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں آغاز ہوئی اس سے ہندوستان کی معدنی دولت کو بھی مزید ترقی حاصل ہورہی ہے۔

ہندوستان کے خاص معدنیات میں کوئلہ، لوہا، منگنیز، سونا، چاندی، سیسہ، جست، مٹی کا تیل، ابرق، گندک، نمک، شورہ، عمارت کے پتھر، اور سمنٹ سازی کی اشیاء شامل ہیں خاص خاص معدنی اشیاء کی مختصر کیفیت درج ذیل ہے

(۱) کوئلہ - ہندوستان میں سلطنت متحدہ امریکہ کے سوا برطانوی شہنشاہیت کے سب علاقوں سے زیادہ کوئلہ نکلتا ہے ۱۹۳۹ء میں ۲۷ء۷ ملین ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ ہندوستان کے کوئلہ کا بیشتر حصہ بنگال، بہار اور اڑیسہ (گونڈوانہ) کی کانوں سے نکلتا ہے۔ ان صوبوں کے علاوہ کوئلہ کی کانیں صوبہ متوسط - وسط ہند، پنجاب، راجپوتانہ، آسام، اور بلوچستان میں واقع ہیں۔ ہندوستان میں کوئلہ کی تقسیم بہت غیر مساوی ہے۔ جنوبی ہند میں اسکی خاص طور سے کمی ہے اسلئے بمبئی میں مغربی گھاٹ سے برقابی قوت حاصل کی گئی ہے صوبہ مدراس کوئلہ کی کمی کی وجہ سے صنعتی ترقی میں بہت پیچھے ہے اس علاقہ میں کوئلہ کیساتھ لوہے کی بھی کسی کان کی کوئی دریافت اب تک عمل میں نہیں آسکی۔ ہندوستانی کوئلہ دوسرے ملکوں کے کوئلہ کے مقابلہ میں عام طور پر خراب قسم کا ہے۔ صرف بنگال کا دہاتی کوک دوسرے ملکوں کے کوئلہ کا مقابلہ کرسکتا ہے ہندوستانی کوئلہ کی کمیٹی کی سفارش پر ۱۹۲۶ء میں کوئلہ کی درجہ بندی کی ایک مجلس قائم کی گئی تاکہ کوئلہ کی

خوبی میں اضافہ ہو۔ ہندوستان میں اچھے کوئلہ کی حفاظت کے ذرائع بھی اختیار کرنے کی ضرورت کا احساس کرکے ۱۹۳۹ء میں کوئلہ کے کانوں کے تحفظ کا قانون منظور ہوا اس قانون کی یہ غرض تھی کہ کوئلہ کے اسراف کا سدباب ہو۔

ہندوستان میں کوئلہ کی صنعت کا آغاز ریلوں کے جاری ہونے سے ہوتا ہے اور بعد میں لوہے فولاد اور دوسری صنعتوں کیوجہ سے معدنی کوئلہ کی طلب میں بہت اضافہ ہوگیا۔

مملکت حیدرآباد میں کوئلہ کی کانیں ضلع ورنگل میں بمقام سنگارینی، کوتھا گوڈم اور تانڈور واقع ہیں ان کانوں سے ۱۹۴۲ء میں ۱۲ لاکھ ۷۷ ہزار ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ جس سے حکومت سرکارعالی کو حق شاہی کے طور پر دو لاکھ ۹۶ ہزار روپیہ کی رقم وصول ہوئی۔ حکومت ہند کی تحریک پر گورنمنٹ آف انڈیا کول مائنس اسٹوائنگ ایکٹ کے تحت مملکت میں جو کوئلہ نکالا جاتا ہے اس پر یکم ڈسمبر ۱۹۳۹ء سے دو آنہ فی ٹن کا محصول عائد کیا گیا اس رقم کو ایک خاص مد میں جمع کیا جاتا ہے۔ جو کوئلہ کے جمع کرنے اور اسکی حفاظتی تدابیر پر صرف کیا جائیگا۔ حکومت سرکارعالی نے کوئلہ کی کھدائی سے متعلق حقیقی نگرانی سنگارینی کمپنی سے معاوضہ دیکر حال ہی میں حاصل کرلئے ہیں۔

(۲) لوہا۔ لوہے کی بڑی کانیں بہار، اوڑیسہ میں سنگھبوم، کیونجھار، بونائی اور مایور بھنج میں واقع ہیں۔ حالیہ انکشافات سے وہاں یہ پتہ چلا ہے کہ مسلسل چالیس میل تک خام لوہے کا ایک ذخیرہ پھیلا ہوا ہے۔ لوہے کی کانیں بنگال، صوبہ متوسط، مدراس اور ریاست میسور میں بھی ہیں۔ بنگال میں باراکار آئرن ورکس ۱۸۷۴ء میں قائم ہوا یہ کارخانہ موجودہ زمانہ میں بنگال آئرن کمپنی محدود میں تبدیل ہوگیا ہے اس کی وجہ سے ہندوستان میں لوہے کی جدید صنعت کا آغاز ہوا ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کی بدولت لوہے کی کچی دھات کی پیداوار میں قابل لحاظ ترقی ہوئی۔ اس کا افتتاح ۱۹۱۱ء میں بمقام سکچی (جمشید پور) ہوا۔ یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ سرمایہ بھی ہندوستانی ہے۔ اور ہندوستانی صنعتی اولوالعزمی کا مظہر ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ۲۷ لاکھ ۴۳ ہزار ٹن لوہا کانوں سے نکالا گیا۔ حالیہ جنگ کیوجہ سے لوہا زاید مقدار میں نکالا گیا۔

مملکت آصفیہ میں بھی لوہے کی کانیں پائی جاتی ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہاں کی کانوں سے جو لوہا
نکالا جاتا تھا وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دنیا میں مشہور تھا۔ چنانچہ بیدر کا فولادی کام اپنی آپ
نظیر سمجھا گیا لیکن سستے قسم کے لوہے کی درآمد اور دوسرے اسباب کی بناء پر لوہے کی صنعت حیدرآباد
میں زوال پذیر ہونے لگی۔ اس کی کانیں ناندیڑ۔ بیڑ۔ بیدر۔ عثمان آباد۔ ورنگل اور عادل آباد میں
پائی جاتی ہیں۔

(۳) مینگنیز۔ یہ ایک بہت قیمتی اور صنعتی دھات ہے۔ فولاد بنانے میں خاص طور پر اس کی
ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ بھاری کیمیائی، برقی اور شیشے کی صنعتوں میں اس کو استعمال کیا جاتا ہے ۱۹۰۷ء
تک دنیا میں سب سے زیادہ مینگنیز ہندوستان میں ہی پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اسکے بعد روس سبقت
لے گیا ۱۹۲۷ء میں اسکی رسد ۱۰۱ ملین ٹن تک پہونچ گئی تھی لیکن ۱۹۳۳ء کی کساد بازاری کیوجہ
سے اسکی رسد ۲ لاکھ ۱۸ ہزار تین سو سات ٹن تک گھٹ گئی ۱۹۳۸ء میں اسکی رسد میں مزید اضافہ ہوا
اور اسکی مقدار ۹ لاکھ ۶۷ ہزار نو سو انتیس ٹن ہو گئی۔ موجودہ زمانہ کی جنگ سے مینگنیز کی صنعت کو بھی ترقی
حاصل ہو رہی ہے۔ مینگنیز پیدا کرنیوالے بڑے علاقے صوبہ متوسط، مدراس، بمبئی اور میسور ہیں۔

(۴) سونا۔ دنیا کی سونے کی پیداوار کا صرف تین فیصدی حصہ ہندوستان میں حاصل ہوتا ہے،
اور اسکا بڑا حصہ کولار (مشرقی میسور) سے برآمد کیا جاتا ہے ۱۹۳۸ء میں ہندوستان سے ۳ لاکھ اکیس
ہزار ایک سو اٹھتیس اونس سونا نکالا گیا جسکی قیمت ۳ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے تھی۔

مملکت حیدرآباد میں بمقام ہٹی (ضلع رائچور) ۱۸۹۱ء سے ۱۹۲۰ء تک سونا نکالا جاتا تھا اور ۱۹۳۷ء
میں تلاش کا کام پھر آغاز کیا گیا اور اسکے لئے دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ کی زاید رقم منظور کی گئی تھی۔

(۵) پٹرولیم۔ ہندوستان میں معدنی تیل کے دو حلقے ہمالیہ کے دو طرف واقع ہیں ایک
مغرب میں ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں آسام شامل ہے اور مجموعی مقدار کا ۸۵ فی صدی
یہیں سے نکلتا ہے۔ دوسرا مشرق میں ہے جس میں پنجاب اور بلوچستان شامل ہیں۔ ہندوستان
میں ۱۹۳۹ء میں ۸۷ ملین گیلن پٹرولیم برآمد ہوا جسکی قیمت ایک کروڑ ۶۵ لاکھ روپے تھی ہندوستان

میں پٹرولیم جس مقدار میں نکالا جاتا ہے وہ پٹرولیم پیدا کرنیوالے ممالک کے مقابل بہت قلیل ہے جدید زمانے میں ہندوستان میں معدنی تیل اور پٹرول کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ اور طلب سے رسد کم ہے۔ہندوستان کو بہت جلد اس کا بدل تلاش کرنا ضروری ہوگا۔

(۶) **ابرق** ۔ابرق زیادہ تر برقی صنعت میں حاجز واسطے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے اس کی پیداوار میں ہندوستان کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے ۔ اور دنیا کی مجموعی پیداوار کا ۳/۵ حصہ یہاں سے ہی نکلتا ہے ۔ ابرق بہار، مدراس، ٹانکور، اجمیر میواڑ، راجپوتانہ اور مملکت حیدرآباد کے ضلع ورنگل میں پائی جاتی ہے۔

(۷) **شورا** ۔ شورے کی طلب صنعتی اغراض مثلاً شیشہ سازی، غذا کے تحفظ اور کھاد کی تیاری کیلئے بہت زیادہ ہے۔ شورا زیادہ تر بہار، صوبہ متحدہ اور پنجاب میں نکلتا ہے تقریباً تمام پیداوار برآمد کردی جاتی ہے اور بہت تھوڑا حصہ ملک میں خصوصاً آسام کی چائے کے باغات میں کھاد کیلئے رکھ لیا جاتا ہے۔کسی زمانہ میں ہندوستان کو تمام دنیا میں نائٹریٹس کی رسد کا اجارہ حاصل تھا۔ اس کو بارود اور کیمیائی کھاد کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ تو بھاری برآمدی محصول اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر ہندوستان میں شورے کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔ بیرونی بازاروں میں چلی کے نائٹریٹس اور فرانس کے پوٹاش نمک کی مسابقت کے باعث ہندوستانی شورے کی برآمد پر ناموافق اثر پڑا۔

(۸) **نمک** ۔تقریباً تین چوتھائی نمک جو ملک میں صرف ہوتا ہے وہ اندرون ملک ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی رسد ۳۶-۱۹۳۵ء میں ۱۵ لاکھ ۹۳ ہزار چھ سو ۹۳ ٹن رہی۔ نمک کا تقریباً ۶۰ فیصدی حصہ بمبئی اور مدراس کے ساحلوں سے سمندر کے پانی کے عمل تبخیر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ایک دوسرا ذریعہ معدنی نمک ہے۔ جو پنجاب میں کوہاٹ کی کانوں سے نکالا جاتا ہے ۔جھیلوں کا پانی خشک کرکے راجپوتانہ میں جھیل سانبھر سے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ کچھ میں کھارے پانی کو گڑھوں میں جمع کیا جاتا ہے ۔پانی خشک ہوجاتا ہے تو نمک نکال لیا

جاتا ہے۔ بیرون ہندوستان سے نمک زیادہ تر بنگال میں درآمد کیا جاتا ہے ۱۹۲۹ء میں ٹیرف بورڈ
نے نمک کو ہندوستان کے لئے خود مکتفی بنانے کے مسئلہ پر غور کیا۔ اس نے یہ رائے قائم کی کہ بنگال کے
لئے عمدہ سفید نمک کی کل طلب کو ہندوستان سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۳۱ء
میں بیرونی نمک پر زائد تابینی محصول درآمد ساڑھے چار آنے فی من کے حساب سے عاید کیا گیا۔ لیکن
۱۹۳۳ء میں اس کو ڈھائی آنہ تک اور ۱۹۳۶ء میں ڈیڑھ آنہ تک گھٹا دیا گیا۔ اور ۱۹۳۸ء میں برخواست
کر دیا گیا۔ تابینی محصول کے زمانہ میں ملکی نمک کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور اب توقع ہے کہ ہندوستان
نمک کے لئے خود مکتفی ہو جائیگا۔

(۹) **سمنٹ سازی کی اشیاء** - کھریا، چونا اور چکنی مٹی ریاست بندی (راجپوتانہ) اور
کٹنی میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ کاٹھیاواڑ میں پوربندر اور لکھنؤ، کانپور کے قرب و جوار میں بھی یہ
اجزاء دستیاب ہوتے ہیں۔ سمنٹ سازی کی صنعت کا مستقبل نہایت ہی امید افزا ہے۔
ضلع گلبرگہ علاقہ حیدرآباد میں بھی سمنٹ سازی کے اشیاء کثیر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔
۱۹۴۱-۴۲ء میں شاہ آباد سمنٹ کمپنی محدود نے ایک لاکھ چھیالیس ہزار ٹن سمنٹ تیار کی
کمپنی نے حق شاہی کی بابتہ حکومت کو تقریباً ایک لاکھ روپے کلدار ادا کئے۔

(۱۰) **دوسری معدنی پیداواریں** - کمتر اہمیت کی دوسری معدنی پیداواریں حسب ذیل ہیں
سیسہ۔ ٹن۔ تانبا۔ جست۔ چاندی۔ المونیم۔ کرومائٹ۔ یشب، پوٹاش، عنبر الماس
یاقوت اور گندھک۔

نباتاتی ذرایع - جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے واضح ہوگا۔ منطقہ حارہ اور منطقہ معتدلہ
کی اکثر اجناس کی ہندوستان میں کاشت کی جاتی ہے۔

(۱) خوردنی اجناس

چاول، بنگال، بہار، اوڑیسہ، مدراس بمبئی اور حیدرآباد کے علاقہ تلنگانہ میں
گیہوں، شمال مغربی ہندوستان اور حیدرآباد کے علاقہ مرہٹواڑی میں **جوار اور باجرہ**

بمبئی، مدراس اور حیدر آباد میں۔ **جو**، صوبہ متحدہ اور بہار میں **راگی**۔ مدراس، صوبہ متحدہ اور بمبئی میں **مکائی**۔ بہار، اوڑلیسہ، صوبہ متحدہ اور پنجاب میں **چنا**۔ پنجاب، صوبہ متحدہ، بہار اوڑلیسہ اور صوبہ متوسط میں۔

(۲) جڑی بوٹیاں

گرم مسالے، مدراس، بمبئی اور بنگال میں، نیشکر۔ کل ہندوستان خصوصاً صوبہ متحدہ میں

کافی۔ مدراس اور کورگ میں چائے۔ آسام اور بنگال میں

(۳) روغن دار تخم۔ السی، تل، سرسوں، رائی، مونگ پھلی، اور ارنڈی وغیرہ مدراس صوبہ متحدہ صوبہ متوسط، صوبہ بمبئی اور حیدر آباد کے علاقہ تلنگانہ میں۔

(۴) ریشے۔

کپاس۔ بمبئی، برار، پنجاب، مدراس اور حیدر آباد کے علاقہ مرہٹواڑی میں۔

جوٹ۔ بنگال میں۔

(۵) متفرق

افیون۔ صوبہ متحدہ اور راجپوتانہ میں۔ تمباکو۔ بنگال، بہار، بمبئی، مدراس اور حیدر آباد میں

چارہ کی فصلیں۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ میں۔ سنکونا (کونین) جنوبی ہند میں

ربر۔ آسام کی پہاڑیوں میں۔

جنگلات۔ ہندوستان کے بیش بہا قدرتی ذرائع میں اس کے بڑے بڑے جنگلات کا بھی تذکرہ ضروری ہے۔ جنگلات کا انحصار زیادہ تر بلندی اور بارش پر ہے۔ جہاں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں تاڑ، فرن، بانس، اور ربر کے سدا بہار جنگل نظر آتے ہیں۔ اوسط درجے کی بارش کے مقامات میں ساگوان، سال وغیرہ کے برگ ریز جنگل موجود ہیں۔

برطانوی ہند کے مجموعی رقبہ کا ١/٥ حصہ سررشتہ جنگلات کے زیر نگرانی ہے۔ آسام میں سب سے زیادہ جنگلات ہیں۔ انسانی اور قدرتی معاشی نظام میں جنگلات سے بالواسطہ اور بلاواسطہ بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں جنگلات سے جو افادہ حاصل ہوتا ہے۔ اسکی چند مثالیں یہ ہیں کہ چوبینہ اور

جلانے کی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ مختلف صنعتوں میں جنگلات کی پیداوار کام آتی ہے۔ مویشیوں کیلئے چراگاہیں میسر آتی ہیں۔ جنگلات سے خام پیداوار حاصل کرنے کثیر افراد کیلئے روزگار فراہم ہوتا ہے۔

جنگلات کی پیداوار دو قسموں میں منقسم ہوسکتی ہے۔

(۱) اصلی پیداوار۔ مثلاً چوبینہ اور جلانے کی لکڑی (۲) ذیلی پیداوار۔ مثلاً لاک اشیائے دباغتی تارپین اور رال وغیرہ۔ جنگلاتی پیداوار کی تحقیقات سے کاغذسازی میں جس وقت سے بانس کی افادیت ثابت ہوئی۔ ٹیرف بورڈ کی سفارش پر حکومت نے ۱۹۲۵ء میں کاغذسازی کی صنعت کو تامین عطا کی۔

جنگلات کی بالواسطہ افادیت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی جنگلات کی وجہ سے آب و ہوا میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ بارش کے موسم میں جنگلات کی وجہ سے زمین کے زرخیز عناصر سیلابی نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں۔ جنگلات کی وجہ سے پانی کے بہاؤ میں جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اس کی بدولت دریاؤں میں پانی زیادہ تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہوتا ہے، مویشیوں اور کارآمد پرندوں کو جائے پناہ ملتی ہے۔

غرض جنگلات کی حفاظت ہر ملک کے لئے بیحد ضروری ہے۔ قدرت کی اس میراث کو انسانوں کی حرص و آز سے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ برطانوی حکومت سے قبل صدیوں تک جنگلات اہل ہند کی غفلت کے نذر ہوتے رہے۔ اضافۂ آبادی توسیع کاشت مویشیوں کی تعداد میں اضافہ اور ریلوں کے لئے چوبینہ اور جلانے کی لکڑی کی طلب کے باعث برطانوی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں بھی جنگلات کو بہت ضائع کیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی کے دورِ حکومت میں جنگلات کی حفاظت کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ۱۸۵۵ء میں اس کی جانب پہلا منظم قدم اُٹھایا گیا۔ بڑے بڑے صوبوں میں ۱۸۶۴ء میں سررشتۂ جنگلات ایک صدر ناظم جنگلات کے زیرِ نگرانی قائم کیا گیا، اُس وقت سے سررشتۂ جنگلات برابر ترقی کررہا ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا برطانوی ہند کے مجموعی رقبہ کا ⅕ حصہ سررشتۂ جنگلات کے زیرِ نگرانی ہے۔

ہندوستانی جنگلات کی حسب ذیل قسمیں قرار پاتی ہیں :-

(۱) محفوظ ۔ (۲) حفاظتی (۳) عام جنگلات

جنگلات کے انتظام کا منشا یہہ ہے کہ ان کو غیر ضروری قطع و برید سے بچا کر ان کی نشوونما میں اضافہ کیا جائے ۱۹۰۶ء میں ڈیرہ ڈون میں جنگلات کا ایک تحقیقاتی ادارہ قائم ہوا یہہ ادارہ مفید تحقیقاتی کام انجام دیرہا ہے ۔ زرعی کمیشن (۱۹۲۸ء) نے اس بات پر زور دیا کہ کاشتکاروں کیلئے جنگلات کی افادیت میں اضافہ کیا جائے ۔ چنانچہ حسب چند عملی تدابیر اختیار کی گئیں ۔

مملکت آصفیہ کے مجموعی رقبہ (۸۲۶۹۸) مربع میل میں سے (۹۵۱۶) مربع میل یا ۵ء۱۱ فیصد رقبہ سررشتہ جنگلات کی نگرانی میں ہے ۔ اضلاع عادل آباد، ورنگل، کریم نگر اور محبوب نگر میں سب سے زیادہ جنگلات ہیں ۔

سررشتہ جنگلات سرکار عالی کا قیام ۱۸۶۷ء میں عمل میں آیا ۔ اور گذشتہ ۸ سال سے یہہ سررشتہ مسلسل ترقی کر رہا ہے ۔ یلندو میں مدرسہ جنگلات قائم ہے جہاں صحرا داری اور نائب امینؔ کے امیدواروں کو تعلیم دی جاتی ہے ۔ گذشتہ پانچ سال کے عرصہ میں سڑک ہائے صحرائی کی تعمیر صحرائی عجائب خانہ کا قیام، یوم تقسیب اشجار، لکس پروری، گھریلو صنعتوں کی احیاء صنعتی و معاشی سروے، صنعتی نمائش میں شرکت اور جنگلاتی رسائل و کتابچوں کی اشاعت سے جنگلات کی ترقی کیلئے ایک عام ذہنیت اور بیداری ترقی پذیر ہے ۔

کارخانہ کاغذ سازی سرپور کے قیام سے فروخت بالنس پر حق شاہی کی وصولی سے سررشتہ کی آمدنی میں معتد بہ اضافہ ہوا ۔

حیوانات ۔ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں حیوانات کی اہمیت کے اظہار میں بھی مبالغہ درست ہے ۔ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے یہاں قدرتی طور پر قسم قسم کے جانور پیدا ہوتے ہیں ۔ انمیں اہم سندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) گائے اور بھینس جنکی خاص طور پر دودھ کی خاطر پرورش کیجاتی ہے ۔

(۲) بیل ۔ ہندوستان کے زرعی نظام معیشت میں لادنے اور کاشتکاری کے جانور کی حیثیت سے

اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

(۳) بھیڑ، بکری سے گوشت اور اون کے علاوہ کھاد بھی حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے جانوروں میں گدھوں اور یابوؤں کا بھی شمار ہے جن سے ہر جگہ بار برداری اور سواری کا کام لیا جاتا ہے۔

اونٹ سے ریگستان (مثلاً سندھ) میں اور عموماً شمالی ہند میں حمل و نقل کا کام لیا جاتا ہے۔

بنگال آسام اور جزیرہ نمائے ہند کے ساحلی علاقوں میں مچھلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کے وسیع جنگلوں میں قسم قسم کے وحشی جانور حشرات الارض اور پرندے پائے جاتے ہیں سنہ ۱۹۴۰ء کی بہائم شماری کے مطابق مملکت آصفیہ میں ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ۵۹ ہزار آٹھ سو تین مویشی پائے جاتے ہیں جن میں گائے، بیل، بھینس بھینسے، بکری، گھوڑے، خچر، اونٹ اور گدھے شامل ہیں تعداد کے لحاظ سے مملکت حیدرآباد کو ہندوستان میں دوسرا درجہ حاصل ہے۔

ذرائع قوت۔ ہندوستان میں کوئلہ، لکڑی، ایندھن، تیل، الکوہل، ہوا اور پانی کی قوت حاصل کرنیکے خاص ذرائع ہیں۔ اس سے قبل ذکر ہوچکا ہے۔ کہ دکن میں کوئلہ کی غیر مساوی تقسیم اور قلت کے باعث پانی کے سوا قوت حاصل کرنے کے دوسرے ذرائع قابل اطمینان نہیں ہیں۔ ہندوستان میں موجودہ زمانہ میں پانی ہی سب سے زیادہ امید افزا ذریعہ قوت سمجھا گیا ہے۔ آبی قوت برقی کے استعمال میں گوکاک ملز کو اولیت حاصل ہے جو جنوبی مہاراسٹر (بمبئی) میں آبشار گوکاک کے قریب واقع ہے۔ موجودہ دور میں ہائیڈرو الکٹرک کے وسیع انتظامات کی طرف خاص توجہ کی جارہی ہے مثلاً میسور میں بمقام سواسمدرم دریائے کاویری کے پانی سے برقی قوت پیدا کی گئی ہے جس سے کولار کی سونے کی کانیں اور میسور کے مختلف مقامات پر بڑے بڑے کارخانے چل رہے ہیں سنہ ۱۹۰۳ء میں کشمیر دریائے جہلم کے پانی سے برقی قوت جاری کیگئی اور مغربی گھاٹ صوبہ بمبئی میں ٹاٹا ہائیڈرو الکٹرک ورکس (سنہ ۱۹۱۵ء) وجود میں آیا۔ اور یہ سب برقی قوت کے ذخیرے ہندوستان کی صنعتی ترقی میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں ٹاٹا ہائیڈرو الکٹرک ورکس سے (۲۴۶۰۰۰) گھوڑوں کی طاقت کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے بمبئی جیسے عظیم الشان صنعتی شہر مضافات بمبئی، تھانہ کلیان

اور پونہ کے بڑے حصوں کے لئے برقی طاقت مہیا ہوتی ہے۔ بمبئی کے قرب وجوار میں کوئلہ کی جو کمی ہے اس کی تلافی پانی سے حاصل کی ہوئی اس قوت سے ہوجاتی ہے۔ ہائیڈرو الکٹرک کی ایک دوسری تجویز مانڈی علاقہ پنجاب میں بھی ہے یہاں بھی کوئلہ کی کمی ہے۔ اس لحاظ سے یہ اسکیم جب پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی تو اس سے بہت بڑے صنعتی مرکزوں کے لئے برقی قوت مہیا ہوسکے گی جس میں دہلی جیسے دور دراز مقامات بھی شامل ہیں۔ مدراس میں پالی کارا ہائیڈرو الکٹرک اسکیم کا کام ۱۹۲۹ء میں شروع کیا گیا۔ منور ہائیڈرو الکٹرک اسکیم جو مشہور منور آبپاشی اسکیم کے ساتھ شامل ہے ۱۹۲۹ء میں آغاز کی گئی۔ صنعتی کمیشن کی سفارش کے مطابق حکومت ہند نے ۱۹۱۸ء میں ہائیڈرو الکٹرک کی وسیع پیمانہ پر تحقیقات کی جس سے ہمالیہ کے آبشاروں اور دریاؤں سے بھی برقی قوت حاصل کرنے کے مختلف امید افزا امکانات کا علم ہوا۔ مملکت حیدرآباد میں دریائے گوداوری کرشنا تنگبھدرا، مانجرا، پورنا اور پین گنگا سے برقابی قوت حاصل کیجاسکتی ہے۔ ابتدائی تحقیقات مکمل کرلیگئی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ ہندوستان ایک نہایت ہی زرخیز ملک ہے جسکو مختلف النوع قدرتی ذرائع حاصل ہیں۔ قدرت نے اپنی نعمتیں فراخدلی کیساتھ اس ملک کو دے رکھی ہیں لیکن اس کے باوجود اہل ملک ان سے پوری طرح مستفید ہونے میں ناکام ہیں یہی وجہ ہے کہ ملک میں قدرت کی مہربانیوں اور انسان کے افلاس کا ایک عجیب و غریب تضاد پایا جاتا ہے۔

آبادی

مجموعی آبادی۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۸ کروڑ ۸۸ لاکھ ہے جس میں سے برطانوی ہند میں ۲۹ کروڑ ۶۰ لاکھ نفوس آباد ہیں۔ ریاستوں کی آبادی ۹ کروڑ تیس لاکھ ہے۔ گو ہندوستان رقبہ میں ممالک متحدہ امریکہ کا نصف ہے۔ لیکن ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی سے ہندوستان کی آبادی قریب قریب تین گنا زیادہ ہے۔ ہندوستان کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا تقریباً $\frac{1}{5}$ حصہ ہے۔

صوبوں اور ریاستوں کی آبادی۔ ذیل کی جدول میں مجموعی آبادی اور برطانوی ہند کے مختلف صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کی وسعت ظاہر کی گئی ہے۔ یہ اعداد حکومت ہند کے جاری کردہ اطلاعات سے ماخوذ ہیں۔

صوبہ، ریاست یا ایجنسی	آبادی ۱۹۳۱ء میں	آبادی ۱۹۴۱ء میں
(۱) اجمیر مارواڑ	۵۰۷۰۰۰	۵۸۴۰۰۰
(۲) آسام	۸۶۲۳۰۰۰	۱۰۲۰۵۰۰۰
(۳) برطانوی بلوچستان	۴۶۴۰۰۰	۵۰۲۰۰۰
(۴) بنگال	۵۰۱۱۴۰۰۰	۶۰۳۱۴۰۰۰
(۵) بہار	۳۲۳۷۱۰۰۰	۳۶۳۴۰۰۰۰
(۶) بمبئی	۱۷۹۹۲۰۰۰	۲۰۸۵۸۰۰۰
(۷) اڑیسہ	۸۰۲۶۰۰۰	۸۷۲۹۰۰۰
(۸) صوبہ متوسط و برار	۱۵۳۲۳۰۰۰	۱۶۸۲۲۰۰۰
(۹) کورگ	۱۶۳۰۰۰	۱۶۹۰۰۰
(۱۰) دہلی	۶۳۶۰۰۰	۹۱۷۰۰۰
(۱۱) مدراس	۴۴۲۰۵۰۰۰	۴۹۳۴۲۰۰۰
(۱۲) صوبہ سرحدی	۲۴۲۵۰۰۰	۳۰۳۸۰۰۰
(۱۳) پنجاب	۲۳۵۸۱۰۰۰	۲۸۴۱۹۰۰۰
(۱۴) صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ	۴۸۴۰۹۰۰۰	۵۵۰۲۱۰۰۰
(۱۵) آسام کی ریاستیں مانی پور اور کھاسی	۶۲۶۰۰۰	۷۲۵۰۰۰
(۱۶) بلوچستان کی ریاستیں	۴۰۵۰۰۰	۳۵۶۰۰۰

(۱۷) ریاست بڑودہ	۲۴۴۸۰۰۰	۲۸۵۵۰۰۰
(۱۸) بنگال کی ریاستیں	۱۸۶۳۰۰۰	۲۱۴۲۰۰۰
(۱۹) اڑیسہ کی ریاستیں	۲۶۸۳۰۰۰	۳۰۲۵۰۰۰
(۲۰) بمبئی کی ریاستیں	۳۷۲۳۰۰۰	۴۲۴۳۰۰۰
(۲۱) وسط ہند کی ایجنسی	۶۶۴۸۰۰۰	۷۵۰۲۰۰۰
(۲۲) صوبہ متوسط کی ریاستیں	۳۵۴۸۰۰۰	۴۰۵۴۰۰۰
(۲۳) ریاست گوالیار	۳۵۲۳۰۰۰	۳۹۹۲۰۰۰
(۲۴) حیدر آباد	۱۴۴۳۶۰۰۰	۱۶۳۳۸۰۰۰
(۲۵) ریاست جموں و کشمیر	۳۶۴۶۰۰۰	۴۰۲۱۰۰۰
(۲۶) مدراس کی ریاستیں	۴۵۳۰۰۰	۴۹۹۰۰۰
(۲۷) ریاست میسور	۶۵۵۷۰۰۰	۷۳۲۹۰۰۰
(۲۸) شمالی مغربی سرحدی صوبہ (ایجنسیاں اور قبائلی علاقہ)	۲۲۵۹۰۰۰	۲۳۷۸۰۰۰
(۲۹) پنجاب کی ریاستیں	۴۴۹۷۰۰۰	۵۴۵۹۰۰۰
(۳۰) راجپوتانہ ایجنسی	۱۱۵۷۱۰۰۰	۱۳۶۷۰۰۰
(۳۱) ریاست سکم	۱۱۰۰۰۰	۱۲۲۰۰۰
(۳۲) صوبہ متحدہ کی ریاستیں	۸۵۶۰۰۰	۹۲۸۰۰۰
(۳۳) مشرقی ہند کی ریاستوں کی ایجنسی	۴۲۲۲۰۰۰	۴۹۰۱۰۰۰
(۳۴) ریاست کوچین	۱۲۰۵۰۰۰	۱۴۲۳۰۰۰
(۳۵) ریاست ٹراونکور	۵۰۹۶۰۰۰	۶۰۷۰۰۰۰

کثرتِ آبادی کے عوامل - ہندوستان میں فی مربع میل آبادی کا اوسط ۱۹۵ نفوس

ہے ایک خطہ سے دوسرے خطہ میں کثرت و قلت آبادی کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں کثرت آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے تقریباً ۴۰ انچ سالانہ بارش کافی ہو جاتی ہے بعض حصوں میں قلت بارش کی تلافی آبپاشی کے مصنوعی ذرائع سے کی جاتی ہے کثرت و قلت آبادی میں دوسری قابل لحاظ چیز زمین کی ساخت ہے جہاں زمین مسطح ہوتی ہے ایک انچ زمین بھی غیر مزروعہ باقی نہیں رکھی جاتی۔ اس لئے ایسے مقامات پر ایک کثیر آبادی کی پرورش ہوسکتی ہے۔ اگر پہاڑوں اور وادیوں کیوجہ سے زمین ناہموار ہو تو وہاں کاشت مشکل ہوتی ہے۔ لامحالہ آبادی منتشر اور قلیل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زمین کی زرخیزی کا اثر بھی آبادی پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اقطاع جو بارش کے لحاظ سے موزوں مقام پر واقع ہیں اپنی زرخیزی اور موزوں ساخت کے ساتھ کثرت آبادی میں بھی نمایاں ہیں جیسے بنگال و صوبہ متحدہ جہاں وسیع مسطح میدان موجود اور زمین زرخیز ہے۔ بقدر مناسب بارش بھی ہوتی ہے قدرتاً آبادی بھی زیادہ ہے مگر بعض اقطاع میں غیر صحت بخش آب و ہوا کی وجہ سے زمین کی ساخت اور زرخیزی سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ہے۔ وہاں لازماً آبادی کی کثرت نہیں ہوتی جیساکہ آسام ہے۔

آبادی کی تقسیم بلحاظ پیشہ ۔ ہندوستان میں تقریباً ۷۰ فیصدی لوگ زراعت اور اس کے متعلقہ پیشوں کے ذریعہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں صنعت و حرفت سے تقریباً (۱۰) فیصدی آبادی کی پرورش ہوتی ہے اور اہل ملک کی ایک بڑی تعداد غیر منظم صنعتوں میں مشغول ہے ان صنعتوں سے جو گھریلو ضروریات کی اشیاء اور سادہ آلات اور اوزار فراہم کئے جاتے ہیں صرف ۵ء۱ فیصدی افراد منظم صنعتوں میں مشغول ہیں۔ تجارت اور حمل و نقل میں تقریباً ۸ فیصدی کی کھپت ہوتی ہے انتظام ملکت اور حفاظت ملک تقریباً ۵ء۱ فیصدی لوگوں کے ذمہ ہے یہ اعداد اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ زراعت ہندوستان کی عظیم اکثریت کا ایک اہم پیشہ ہے۔

قصبات اور دیہات ۔ زراعت کی غالب حیثیت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ یہاں قصبات کے مقابلہ میں دیہات کی تعداد اور اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان میں تقریباً سات لاکھ دیہات

کے مقابلہ میں صرف دو ہزار پانچ سو پچہتر قصبات ہیں۔ مملکت آصفیہ میں قصبات کی تعداد ۱۳۲
اور دیہات کی تعداد ۲۱۲۲۳ ہے۔ قصبہ سے مراد ایسی بستی ہے جس میں پانچ ہزار سے زیادہ لوگ
آباد ہوں یا جسے بلدی حکومت خود اختیاری حاصل ہو۔ قصبات میں جملہ آبادی کا صرف گیارہ
فیصد حصہ مقیم ہے جب اس کا مقابلہ غیر ممالک سے کیا جاتا ہے تو بہت فرق معلوم ہوتا ہے مثلاً
انگلستان میں قصباتی آبادی کی تعداد اسّی فیصد ہے ممالک متحدہ امریکہ میں ۵۶ فیصد اور فرانس
میں ۴۹ فیصد ہے۔

ہندوستان کے دیہات اور قصبات کی آبادی غیر متناسب طور پر جس طرح منقسم ہے وہ
ایک عام پستی کی علامت ہے۔ تہذیب و تمدن کی شمع ہمیشہ شہروں سے روشن ہوتی ہے اور یہاں
سے اس کی کرنیں دیہات تک پہونچتی ہیں۔ جدید صنعتی ترقی سے قصبات کی آبادی میں اضافہ
کی امید ہے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی ملک نہ صرف معاشی لحاظ سے بلکہ ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی
سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔

صنفی تقسیم ۔ ہندوستان کی آبادی کی ایک اور قابل لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ یہاں مردوں
کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے اس حقیقت کے باوجود کہ خواتین جسمانی اعتبار سے قوی تر ہیں۔ ان
کا اوسط فی ہزار مرد ۹۴۰ ہے اس کمی کی توجیہہ یہ ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کی اموات
کا تناسب زیادہ ہے جو کمسنی کی شادی، کثرت اولاد اور ماہر دائیوں کی کمی کے باعث واقع ہوتی ہیں۔

قابل کار آبادی ۔ یورپ میں قابل کار آبادی کی عام حد پندرہ اور ساٹھ سال کی عمر کے درمیان
ہے مگر ہندوستان میں پندرہ سے چالیس سال ہے۔ اس لئے کہ یہاں بڑھاپا جلد ظاہر ہونے
کے باعث کام کرنے کی صلاحیت زیادہ مدت تک باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے ہندوستان میں
قابل کار آبادی کا تناسب مجموعی آبادی کے تناسب کے مقابلہ میں صرف چالیس فیصد ہے۔ اس کے
برخلاف انگلستان میں یہ تناسب ۶۰ فیصد اور فرانس میں ۵۳ فیصد ہے۔

شرح پیدائش اور شرح اموات ۔ ہندوستان کی شرح پیدائش اور شرح اموات

دنیا کے اور ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے (شرح پیدائش ۳۶ فی ہزار نفوس اور شرح اموات ۲۶ فی ہزار نفوس ہے) ایک ایسی شرح پیدائش جو بلند اور قابو سے باہر ہو عموماً بلند شرح اموات کا باعث ہوتی ہے ممالک یورپ میں شرح پیدائش اور اس کے ساتھ شرح اموات کو بھی گھٹانے کی کوشش کرنے کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔ وہاں شرح پیدائش اس لئے گھٹ رہی ہے کہ لوگ دیر سے شادیاں کرتے اور خاندان کو محدود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچے اگر تعداد میں کم ہوں تو اچھی طرح ان کی پرورش ہو سکتی ہے اور ان کی بڑی تعداد بڑی عمر میں باقی ہے ہندوستان میں شرح اموات عام طور پر افلاس اور کم توانائی کی وجہ سے بہت زیادہ ہے۔ بچوں اور عورتوں میں اموات کی شرح خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہے۔ بچپن کی شادی بھی شرح اموات میں اضافہ کا باعث ہے۔ کیونکہ اس سے ماں کی زندگی پر تباہ کن اثر پڑتا ہے۔ نتیجتاً بچہ کمزور اور بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اصول حفظ صحت کی ناواقفیت اور غیر ماہر دائیوں کی وجہ سے بھی بہت خراب نتائج رونما ہوتے ہیں۔ بلاشبہہ یہ تمام نقائص تعلیم اور دوسرے قوی اثرات کے تحت آہستہ آہستہ دور ہو رہے ہیں لیکن یہ رفتار اس قدر سست ہے کہ غالباً اصلاح کیلئے صدیاں درکار ہونگی

حیدرآباد کی آبادی۔ حیدرآباد میں سب سے پہلی مردم شماری ۱۸۸۱ء میں کیگئی اس وقت جملہ آبادی ۹۸۴۵۵۹۴ تھی ۱۸۹۱ء میں ۱۶۹۱۴۴۶ نفوس یا ۱۷٫۱ فیصد کا اضافہ ہوا اور مجموعی تعداد ۱۱۵۳۷۰۴۰ ہو گئی۔ اضافہ کا بڑا سبب شرح اموات کے مقابلہ میں شرح پیدائش کی زیادتی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ۳۹۵۸۹۸ نفوس یا ۳٫۵ فیصد کی کمی ہوئی اور مجموعی آبادی گھٹ کر ۱۱۱۴۱۱۴۲ رہ گئی۔ کیونکہ شرح پیدائش کے مقابل شرح اموات اسقدر زیادہ تھی کہ توطن کی بدولت تقریباً ۴۸ ہزار افراد کا آبادی میں اضافہ ہونے کے باوجود مجموعی آبادی میں تخفیف ہوئی۔ شرح اموات کی زیادتی کی ایک اہم وجہ موسموں کی ناموافق حالت تھی۔ ۱۸۹۶ء کا سال "سال قلت" کے نام سے مشہور ہے ۱۸۹۷ء میں ملک کے مختلف حصوں میں پلیگ کی وبا پھیل گئی۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں قحط نمودار ہوا جس کے اثرات بہت وسیع رہے۔

الیسے وبات کی بنا پر آبادی میں مجموعی طور پر ۳٫۵ فیصد کی کمی ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں ۲۲۲۳۳۵۴۴ نفوس یا ۳٫۰ فیصد کا اضافہ ہوا اس طرح مجموعی آبادی بڑھکر ۱۱٬۳۷۴۶۷۶ ہوگئی اس اضافہ کی سب سے اہم وجہ شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش کی زیادتی تھی۔ شرح پیدائش کے موافق حالات میں ذرائع آبپاشی کی توسیع، رقبہ کاشت اور مقدار پیداوار میں اضافہ، سکندرآباد تا منماڑ ریلوے لائن کی وجہ تجارت میں سہولت اور آبادی کی صحت کا معیار مقابلۃً بہتر رہا اور اس طرح آبادی میں ۳٫۰ فیصدی کا اضافہ ممکن ہوسکا۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں آبادی میں ۹۰۲۹۰۶ نفوس یا ۶٫۸ فی صد کی تخفیف ہوئی اور مجموعی تعداد گھٹ کر ۱۲۴۷۱۷۷۰ رہگئی۔ ترک وطن اور جنگ عظیم کی وجہ سے آبادی میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ نفوس کی کمی ہوئی۔ شرح اموات کی زیادتی کی وجہ یہ تھی کہ ناموافق موسموں کی وجہ سے فصلیں خراب ہوگئیں اجناس کی قلت کی وجہ سے قیمتیں بڑھ گئیں۔ قلت غذا کی شدت اور عوام میں قوت خرید کی کمی بالآخر اموات کی صورت میں نمودار ہوئی قلت غذا کے ساتھ ساتھ طاعون اور انفلوئنزا کی وجہ سے بہت سی جانیں ضائع گئیں۔ اور مجموعی آبادی میں ۶٫۸ فیصد کی کمی ہوگئی۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۹۶۴۳۷۸ نفوس یا ۱۵٫۸ فیصد کی زیادتی ہوئی اور آبادی کی مجموعی تعداد ۱۴۴۳۶۱۴۸ تک بڑھ گئی یہ اضافہ شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش کی زیادتی کا نتیجہ تھا۔ اس دور میں قحطوں کی وبا دور ہوگئی بحیثیت مجموعی موسمی حالات خوشگوار رہے۔ جدید ذرائع آبپاشی تعمیر کئے گئے۔ زرعی اصلاح اور ترقی کیلئے حکومت کی جانب سے توجہ کی گئی، صنعت و حرفت کی ترقی کیلئے جداگانہ محکمہ قائم کیا گیا۔ ذرائع حمل و نقل اور ذرائع خبر رسانی کی ترقی سے دولت کی پیدائش میں سہولت ہونے لگی۔ صحت عامہ کو بہتر بنانے کے لئے طبی امداد کے ذرائع فراہم کئے گئے۔ اس لئے آبادی میں ۱۵٫۸ فیصدی کا اضافہ ہوسکا۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں آبادی میں ۱۶۵۸۱۷۵۱ نفوس یا ۱۳٫۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اور جملہ تعداد ۱۶۳۳۸۵۳۴ تک پہنچ گئی ہے۔ اس دور میں ۱۵ لاکھ افراد کے ترک وطن کی وجہ سے زیادتی ہوئی۔ باقی

اضافۂ شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش کی زیادتی کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ حیدرآباد کی معاشی تاریخ میں گذشتہ دس سال نمایاں اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اس دور میں زراعت، صنعت و حرفت، تجارت اور حمل و نقل میں مجموعی طور پر نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ صحت عامہ کی بہتری کیلئے کثیر رقومات خرچ کی گئیں۔

حیدرآباد میں اگر ایک طرف دولت اور ذرائع معاش میں اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری طرف آبادی بھی تقریباً اسی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ عام باشندوں کے معیار زندگی میں سالہائے ماسبق کے مقابل کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ گذشتہ بیس پچیس سال میں بہت کچھ شہری ترقی ہوئی (دارالحکومت حیدرآباد کی آبادی ۷۳۹۱۵۹ ہے جو بلحاظ آبادی ہندوستان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ شہر ورنگل کی آبادی ۹۲۸۰۸ ہے۔ شہر گلبرگہ کی آبادی ۳۵۵۱۵ ہے اور شہر اورنگ آباد کی آبادی ۵۰۹۲۴ ہے) اعلیٰ اور متوسط طبقوں کی حالت میں نمایاں تغیر نظر آتا ہے لیکن ان طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد مقابلتاً بہت محدود ہے۔

ہندوستان میں مسئلہ آبادی سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۴۱ء کے درمیان ہندوستان کی آبادی تقریباً ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ سے ۳۸ کروڑ ۸۸ لاکھ تک پہنچ گئی۔ دس سال میں ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ کا اضافہ مجموعی آبادی کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہے۔ لیکن حیرت انگیز ضرور ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان میں اس قدر ذرائع مہیا ہیں کہ اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کی پرورش کا سامان ہو سکے۔ کسی ملک کے معین حالات کے تحت بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں ٹھیک متوازن آبادی کیا ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کی متوازن آبادی کے متعلق بھی کوئی قطعی رائے نہیں دیجا سکتی۔ اس لحاظ سے گو صحیح نتیجہ پر پہونچنا ممکن نہیں۔ بہرحال ہم عام حالات کے تحت ایک مناسب اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس طور سے ایسا عام اندازہ قائم کرنیکے لئے حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۱) اضافۂ آبادی پر قابو پانے کے مناسب ذرائع موجود ہیں یا نہیں۔

(۲) کسی فوری اور غیر معمولی معاشی ترقی کے امکانات پائے جاتے ہیں یا نہیں۔

(۳) ایجابی موانعات اپنا عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔ مثلاً اگر شرح اموات خصوصاً بچوں کی بہت بلند ہے تو ہم اس سے بلاشبہہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسا ملک کثرت آبادی کا شکار ہے۔

انہیں اصولوں کے تحت ہندوستان کے حالات پر غور کرنا چاہیئے۔

یہ امر کہ ہندوستان کی آبادی پر انسدادی قابو رکھنے کے اہم اصول عمل پیرا نہیں ہیں۔ بہ آسانی ثابت کیا جا سکتا ہے مثلاً یہاں ہر شخص شادی کرتا ہے اور جتنا جلد ممکن ہو شادی کر لیتا ہے۔ مذہبی احکام سے بھی شادی کی حمایت ہوتی ہے ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ اولاد پیدا کرنے کے لئے ہر ہندو کو شادی کرنی چاہیئے۔ اگر لڑکے پیدا ہوں تو بہت اچھا ہے تاکہ باپ کے کریا کرم کی رسوم ادا کر سکیں ورنہ باپ کی روح تکلیف اور بےچینی کے ساتھ بھٹکتی پھرتی ہے۔ سماج کی بدگوئی سے بچنے کے لئے لڑکیوں کی شادی سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے کرنی پڑتی ہے۔ مشترکہ خاندانی زندگی کی وجہ سے بچپن کی شادی کی ترغیب ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص جو شادی کرتا ہے روزی کمانے کے بھی قابل ہو۔ خاندان کے دوسرے ارکان شادی شدہ جوڑے کی امداد کر دیا کرتے ہیں لوگوں کے افلاس کی وجہ سے بھی کمسنی کی شادی ضروری ہے کیونکہ گھر کے کام کاج کے لئے بیوی کی ضرورت ہے جو اکثر کھیتوں اور دوسرے پیشوں میں اپنے شوہر کی امداد کرتی ہے معیار زندگی اتنا ادنیٰ ہے کہ بچوں کی پرورش میں زیادہ صرفہ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بد احتیاطی اور اچھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے اکثر بچے فوت ہو جاتے ہیں اور جو زندہ رہتے ہیں جلد کام سے لگ جانے پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ بچوں کو بغیر کسی خاص تربیت کے کام سے لگا دینا معاشرہ کے لئے نتیجتاً مضر ثابت ہوتا ہے لیکن غریب آدمی مستقبل کے ان تصورات کو پیش نظر نہیں رکھ سکتا فوری فائدہ چاہے وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو خیال و ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اضافہ آبادی کو روکنے کے لئے شادی سے احتراز یا اس کا التواء ہندوستان میں عملاً موجود نہیں ہے لہذا یہ قابل تعجب نہیں ہے کہ ہندوستان کی شرح اموات دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

جہاں تک معاشی ترقی کے امکانات کا تعلق ہے بلاشبہہ زراعتی اور صنعتی نظام کی اصلاح کے ذریعہ بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے زراعتی مسائل کا سطحی مطالعہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا

ہے کہ اس راستہ کی مزاحمتیں اور مشکلات اس قدر شدید ہیں کہ رفتار ترقی میں کوئی قابل لحاظ سرعت پیدا نہیں ہو سکتی صنعتی میدان میں دوسری قومیں ہندوستان سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں کامیابی کے ساتھ ان سے سابقت بھی کوئی آسان کام نہیں ہے فرض کیجئے کہ بیرونی مال پر محصول لگا کر اسکی در آمد روک بھی دیجائے تب بھی تیزی سے ترقی کا امکان نہیں ہے کیونکہ اس میں بیرونی مقابلے کے علاوہ دوسرے موانعات بھی ہیں۔ محنت اور سرمایہ کے نقائص کو دور کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے ہندوستان کے اکثر حمایت پسندوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آبادی کے ساتھ ہندوستان میں غیر معمولی اضافہ دولت کے ذرائع فراہم نہیں ہو سکتے ایسے ذرائع انگلستان میں اضافہ آبادی کے باوجود صنعتی انقلاب کی وجہ سے وجود میں آئے۔

گو ہندوستان میں متعدد مہلک امراض جیسے پلیگ، انفلوانزا کا بھی دور دورہ رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً آبادی کا ایک کثیر حصہ ان کی نذر ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہاں شرح اموات دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور خاص طور پر بچوں کی شرح سب سے بڑھ کر ہے۔ اس طرح ہندوستان میں کثرت آبادی کی بہت سی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ موجودہ حالات اور مستقبل قریب میں معاشی ترقی کے امکانات کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہندوستان کی عام فلاح و آسائش کیلئے یہ امر ضروری ہے کہ یہاں بچوں کی شرح پیدائش کو کسی قدر سست کر دیا جائے۔ چنانچہ مصنوعی ضبط تولید کی تحریک ملک میں شروع ہو چکی ہے اور واقف حال رائے عامہ کا حکومت سے یہ مطالبہ ہے کہ اس تحریک کی تبلیغ میں مدد دیجائے۔ ضبط تولید کے دواخانہ قائم ہوں اور ایسے مراکز مقرر کئے جائیں جہاں لوگوں کو اسکے متعلق مشورے دیئے جائیں۔ لیکن ضبط تولید کے جیسے بعید ذرائع اختیار کرکے آبادی کی تعداد کو محدود کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ زراعتی اور صنعتی ترقی میں ممکنہ کوشش کیجائے تاکہ زیادہ کمانے سے آبادی کے افراد کا معیار زندگی بلند ہو سکے۔ زندگی بسر کرنے کا معیار جیسے بلند ہوتا جائیگا۔ ہندوستانی معاشرہ کی بیسیوں خرابیاں خود بخود دور ہوتی جائیں گی۔

عمرانی اور مذہبی اداروں کا معاشی پہلو

ذات پات - ہندوستان میں معاشی زندگی کے مختلف مسائل نے اہل ملک کے عمرانی اداروں کی خصوصیات کے باعث عجیب و غریب شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ ایک ایسا ادارہ ذات پات کا نظام ہے جس کو ہندوستان کی آبادی کا کثیر حصہ عامل ہے۔ ایک زمانے میں شاید ذات پات کے نظام کی حمایت، معاشی قوت اور کارکردگی کی بنا پر ہوا کرتی تھی۔ جس کا دارومدار تقسیم عمل کے اُصول پر تھا۔ یہ نظام اس وقت کیلئے موزوں تھا جبکہ صرف چند نمایاں پیشوں کا وجود تھا۔ جبکہ مہارت کا انحصار دستکاریوں پر تھا اور بیٹا آسانی کیساتھ اپنے باپ سے اسکے ہنر کو سیکھتا تھا۔ لیکن اب متعدد پیشوں اور مشنری کی ایجاد سے دستکاری کی اہمیت مقابلتاً کم ہوگئی ہے۔ اسطرح ذات پات کا نظام ممد و معاون ہونیکے کے بجائے رکاوٹ بن گیا۔ یہ نظام پیشہ کے انتخاب میں فطری رجحان کے مطابق عمل کرنے سے روکتا ہے۔ جو نہ صرف انفرادی بلکہ عمرانی نقطۂ نظر سے بھی نامناسب ہے۔ اس نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ذاتیں ادنیٰ اور بعض اعلیٰ تصور کیجاتی ہیں اور ادنیٰ پیشہ حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ بلاشبہ ہندوستان کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ اس نظام معاشرت کا پابند نہیں ہے۔ اس کا اصول معاشرت یہ ہے کہ ہر جائز پیشہ قابل عزت ہے۔ کمتری اور برتری کا معیار نسل اور خاندان نہیں بلکہ فطری قابلیت ہے۔ جو کسی خاص ذات کا اجارہ نہیں ہے۔ یہ اصول آہستہ آہستہ سہی لیکن مستقل طور سے اپنا اثر پھیلاتا جارہا ہے اور یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں ذات پات کا نظام عمرانی اور سیاسی کمزوری کا باعث ہے اور جسقدر جلد اس کا انسداد ہوجائے ملک اور قوم کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ مسلمانوں کی معاشرت کے اثرات اور مغربی تعلیم و تمدن ذات پات کے نظام کو بلاشبہ کمزور کردیں گے۔ لیکن دوسرے قوی اثرات مثلاً سیاسی اقتدار کے لئے کشمکش جو سیاسی اصلاحات کے وقت رونما ہوتی ہے۔ ذات پات کے اختلافات کو تیز کردیتی ہے۔

مشترکہ خاندانی زندگی - ہندوستان میں عمرانی زندگی کی ایک اور خصوصیت مشترکہ خاندانی زندگی ہے اس نظام میں جو چند خوبیاں ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر فرد خاندان کی پرورش ہوتی ہے۔ بیواؤں اور یتیموں کو

اپنے خاندان میں پناہ ملتی ہے۔ اس لحاظ سے حکومت کو مغربی ممالک کے مقابلے میں مصیبت زدوں کی زیادہ دیکھ بھال نہیں کرنی پڑتی۔ جب لوگوں کی ایک بڑی تعداد مل جل کر رہتی ہے جیسا کہ مشترکہ خاندانی زندگی میں ہوتا ہے تو خاندانی اخراجات میں بچت ہو جاتی ہے۔ مشترکہ خاندانی زندگی کی وجہ سے انضباط، قربانی، اطاعت اور ادب جیسی عمدہ صفات پیدا ہوتی ہیں لیکن موجودہ حالات کے تحت مشترکہ خاندانی زندگی پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ نظام ایسے کاہلوں کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے جنہیں عزت نفس اور احساس ذمہ داری کا فقدان ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر لوگ روزی کی تلاش میں خاندان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کوئی شبہہ نہیں کہ مغربی اثرات کی وجہ سے مشترکہ خاندانی زندگی کا رواج کم ہو چلا ہے۔ لیکن اس خصوص میں بھی مسلمانوں کو مغربی اثر قبول کرنے کے لئے اپنے معاشرہ کے کسی قدیم اصول کو ترک کر دینا نہیں پڑے گا۔ ان کے معاشرہ کی بنیاد خود انفرادی آزادی پر ہے۔

قوانین وراثت ۔ ہندوستان کے قوانین وراثت انگریزی قانون کے بالکل برعکس ہیں۔ یہاں غیر منقولہ جائداد و شمار کے کثیر التعداد ادمیں منقسم ہوتی ہے۔ انگلستان میں قانون حق اولاد اکبر کی وجہ سے غیر منقولہ جائداد صرف چند لوگوں کے قبضہ میں جاتی ہے۔ جائداد اور دولت کی وسیع پیمانہ پر تقسیم ارتکاز دولت کی بہ نسبت معاشرتی مساوات کے تصور سے زیادہ مطابق ہے۔ ہندوستان میں مساوی تقسیم دولت کے اصول کی وجہ سے تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں دولت کا اجتماع ہو جانے کی وجہ سے پیمانہ کبیر کی مسابقت میں رکاوٹ ہوتی ہے لیکن یہ مسئلہ زندگی کے دو نظاموں کے بنیادی اختلاف کا مبدا ہے اور دنیا کو ابھی مسئلہ حل کرنا ہے۔

مذہب ۔ یہ اکثر بیان کیا جاتا ہے کہ ہماری موجودہ معاشی پستی کا سبب ہماری قسمت پرستی اور آخرت کا تخیل ہے موت کے بعد روح کی نجات کے مسئلہ میں ہم اسقدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ اس کرۂ ارض میں دنیادی فلاح و بہبود نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ یہ امر آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام کی طرح عیسائی بھی آخرت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن آخرت کا تصور عیسائی قوم کی مادی ترقی میں حارج نہیں ہوا۔ یہ حقیقت ہمیں فراموش نہ کرنی چاہئے کہ گذشتہ دور کی تاریخ

ہیں اہل ہند کو بانی سلطنت، فاتح، اور نو آبادیات کار کا امتیاز حاصل رہا ہے۔ حکمیاتی علوم مثلاً ریاضی اور ہیئت میں ان کے کارنامے نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ کسی زمانہ میں ہندوستانی دستکاری کو عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ یہ ہرگز ممکن نہ ہوتا اگر ہندوستانی روحانیت کا تصور معاشی اور دوسری جدوجہد کو مفلوج کر دیا ہوتا۔ موجودہ حالت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ بعض فرقے (جیسے مارواڑی، جین، بھاٹیا، میمن، بوہرے) جو ملک کی جدید تجارتی اور صنعتی زندگی میں نمایاں حصہ لیتے ہیں اور بڑی اولعزمی دکھاتے ہیں۔ انتہا درجہ قدامت پرست ہیں۔ اور موجودہ آزاد خیالی سے انھیں کوئی مس نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشی محرکات مغربی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی بہت قوی ہیں۔ قسمت پرستی کا تعلق مذہبی تعلیمات سے بہت کم ہے۔ یہ تاریخی اور سیاسی اسباب کا نتیجہ ہے۔ جب لوگوں کو سیاسی اور دوسرے اسباب کی بناء پر اپنی محنت کا ثمرہ حاصل کرنے کا یقین نہیں ہوتا تو وہ لامحالہ قسمت پرست ہو جاتے ہیں جب حالات مستقل اور زیادہ قابل اطمینان ہوتے ہیں تو انسان کے قدرتی محرکات زندگی کے محاسن کی تخلیق اور ان سے لطف اندوزی کی راہیں اختیار کرتے ہیں۔ اگر مذہب اس رجحان کی قدر افزائی نہ کرے تو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ قدیم کتابوں کی جدید تعبیر ہونے لگتی ہے۔ یہی یورپ میں پیش آیا اور یہی ہندوستان میں پیش آرہا ہے۔ ہندو مت کے بعض خصوصی عقاید مثلاً کرما کے عقیدہ کے متعلق اکثر ہندو مفکرین کا یہ خیال ہے کہ ترک علائق کی بجائے یہ عقیدہ جدوجہد کی تعلیم دیتا ہے۔ مسلمانوں کی حد تک بھی قسمت پسندی کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے ساکت و صامت ہو جائے ان کے مذہبی تعلیمات سے قطع نظر خود ان کی ۱۳½ سو سال کی تاریخ عمل اور جدوجہد کی ہی مظہر ہے۔

الغرض یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں مذہب مادی ترقی کا مخالف ہے دوسرے اثرات مثلاً سیاسی مزاج کا اس صورت حال کی تخلیق میں بہت بڑا حصہ ہے۔ مصائب بھی مثلاً قحط اور بیماریاں جیسے ملیریا وغیرہ جس سے جسمانی کمزوری لاحق ہوتی ہے۔ اہل ملک میں مردنی اور قنوطیت پیدا کرتے ہیں۔

دوسرا باب

ہندوستان میں معاشی تغیّر

ہندوستان میں معاشی تغیر۔ اب مختصر طور سے معاشی نظام اور تنظیم کے ان بنیادی تغیرات کا تذکرہ مناسب ہے جو گذشتہ سو سال میں ہندوستان کی عام زندگی اور محنت پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ جو تغیرات عمل میں آئے ہیں۔ ان کو ایک حد تک صنعتی انقلاب سے موسوم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تبدیلیاں اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر مکمل اور انقلابی ثابت نہیں ہوئیں جیسے کہ انگلستان میں "صنعتی انقلاب" کی وجہ ظہور پذیر ہوئیں۔ قدیم نظام کے اثرات دیہی علاقوں میں خصوصاً ابھی تک موجود ہیں۔ ہندوستان کے معاشی نظام کی تبدیلی کو صنعتی انقلاب کے بجائے معاشی تغیر سے موسوم کرنا مناسب ہوگا۔ ہندوستان میں قدیم و جدید معاشی نظام دوش بدوش پایا جاتا ہے۔

قدیم معاشی نظام کی خصوصیات۔ ماہرین نے معاشی اعتبار سے دنیا کے ملکوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) وہ ملک جو قدیم معاشی نظام کے تحت ہیں اور وہاں کوئی صنعتی انقلاب پیدا نہیں ہوا مثلاً ہندوستان اور مصر۔

(۲) وہ ملک جنہوں نے جدید معاشی نظام اختیار کر لیا ہے۔ جہاں درحقیقت صنعتی انقلاب رونما ہوا

مثلاً انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ

قدیم معاشی نظام کے ممالک کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسابقت اور معاہدے کے بجائے رواج اور قدیم حیثیت کا غلبہ۔

(۲) ناقص ذرائع حمل ونقل کی وجہ سے دیہات کی خود مکتفی زندگی بسر اور شہروں سے ان کی بیگانگی

(۳) زراعت کی فوقیت دوسرے پیشوں پر اور نتیجتاً دیہی آبادی کا شہری آبادی پر غلبہ۔

(۴) بازار کے محدود ہونے کی وجہ سے تقسیم عمل کی سادہ حالت۔

(۵) گھریلو صنعتوں اور دستکاری کا پیمانہ صغیر پر چلایا جانا۔

(۶) زر کی عدم موجودگی اور تبادلہ اشیاء کا رواج

(۷) اعتبار کا فقدان ربا کا رواج

ان کے برخلاف جدید معاشی نظام سے تعلق رکھنے والے ممالک کی حسب ذیل خصوصیات ہوتی ہیں۔

(۱) معاہدے اور مسابقت کی آزادی

(۲) ترقی یافتہ ذرائع حمل ونقل کی وجہ سے صنعتی دنیا کے مختلف حصوں کے باہمی قریبی تعلقات

(۳) صنعت اور تجارت کی اہمیت اور شہری آبادی کی دیہی آبادی پر غلبہ۔

(۴) بازار کی وسعت اور مشنری کے استعمال کی وجہ سے بہتر تقسیم عمل۔

(۵) کثیر سرمایہ کے ساتھ پیمانہ کبیر کی صنعت اور بڑے بڑے کار خانوں اور صنعتی شہروں میں مزدوروں کا اجتماع۔

(۶) تبادلہ اشیاء کے طریقہ کے بجائے زر کا نظام۔

(۷) اعتبار اور بنک کاری کی ترقی اور ربا کی عدم موجودگی۔

یہ امر لازم نہیں ہے کہ مذکورہ بالا خصوصیات سب کے سب کسی ملک میں پائے جائیں۔ اس امر کا امکان ہے کہ پہلی قسم کے ممالک دوسرے قسم کے ممالک کی خصوصیتیں اختیار کرلیں اور فی الوقت ہندوستان معاشی تغیر کی حالت سے گزر رہا ہے اور دونوں طرح کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔

لیکن ترقی کا رخ دوسرے نظام کی خصوصیات کی طرف بہت زیادہ ہے۔

ہندوستان کی قدیم معاشی تنظیم

دیہات ۔ قدیم زمانہ میں ہندوستان دیہات کا ملک تھا اور آج کل بھی یہی حالت پائی جاتی ہے۔ خود مکتفی گاؤں قدیم ہندوستان کے نظام معشیت کا ایک لازمی عنصر تھا۔ شمالی ہندوستانی گاؤں زیر کاشت رقبوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں کچھ بنجر زمینات ہوتی بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتی ہیں۔ عموماً اس کا ایک مرکزی حصہ ہوتا ہے۔ جہاں مکانات واقع ہوتے ہیں۔ گاؤں کی زمینات چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ دیہات میں اکثر درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ایک چاوڑی ہوتی ہے جس کو دفتر کہنا چاہیئے یہاں عہدہ داران دیہی اپنا دفتر رکھتے ہیں اور کام چلاتے ہیں۔

ہندوستان میں گاؤں کے انتظام کی دو خاص نوعیتیں ہیں۔ (۱) رعیت واری (۲) زمینداری۔ رعیت واری گاؤں میں ہر کاشتکار زمین کے علحدہ حصہ کا مالک ہوتا ہے۔ وہ براہ راست حکومت کو مالگذاری ادا کرتا ہے۔ (بمبئی، مدراس اور برار میں یہ طریقہ رائج ہے) ممالکت آصفیہ میں بھی رعیت داری طریقہ رائج ہے۔ دوسرا زمینداری طریق جو صوبۂ متحدہ اور پنجاب میں رائج ہے۔ گاؤں کی زمین کا مالک زمیندار ہوا کرتا ہے۔ یا ایسے شرکا ہوتے ہیں جو مشترکہ طور پر مالگذاری کی ادائی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ گاؤں خواہ کسی نوعیت کا ہو قدیم زمانہ میں خود مکتفی ہوتا تھا۔ اس کی زراعتی اور حرفتی ضروریات کے لئے محنت، سرمایہ اور مہارت جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی خود اسی کے حدود میں دستیاب ہو جاتی۔ باشندگان دیہات کے تین طبقے ہیں۔

۱۔ **کاشتکار** ۔ جن کی دیہی آبادی میں کثرت ہوتی ہے۔ دو گروہوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ زمیندار اور پٹہ دار۔ ان کی زمینات کے رقبہ عموماً چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور کاشتکار اپنے ارکان خاندان کی مدد سے کاشت کرتے ہیں۔ وہ خطرات برداشت کرتے ہیں۔ یا تو خود اپنا ذاتی سرمایہ استعمال کرتے ہیں یا گاؤں کے ساہوکار سے قرضہ لیتے ہیں اور کبھی کبھی نمک اور دوسری اشیائے احتیاج اور آسائشی

چیزوں کے لئے جو گاؤں میں نہیں ملتی کسی قریبی بازار میں اپنی پیداوار سے تبادلہ کرتے ہیں۔

(۲) **دیہی عہدہ دار۔** ہر گاؤں کے عہدہ دار ہوتے ہیں۔ اور ہر گاؤں جس طرح سابق میں انتظام مملکت کی اکائی ہوا کرتا تھا۔ اب بھی ہے۔ گاؤں کا اعلیٰ حاکم پٹیل یا نمبردار ہوتا ہے۔ مملکت آصفیہ میں پٹیل کا لفظ رائج ہے۔ یہ موروثی ہوتا ہے اور گاؤں کے امن و امان کا ذمہ دار ہے۔ مالگزاری بھی وصول کرتا ہے اس کو خدمات کے صلہ میں وطن داری زمین حاصل رہتی ہے۔ اس کے سوا گاؤں میں کلکرنی یا پٹواری ہوتا ہے۔ مملکت آصفیہ میں پٹواری کا لفظ مستعمل ہے۔ یہ گاؤں کے دستاویزات اور حسابات کی حفاظت کرتا اور ان کے تمام اخراجات کا داخلہ رکھتا ہے۔ ان دو عہدہ داران دیہی کے علاوہ گاؤں میں چوکیدار بھی ہوتا ہے۔ جو جرائم کی نگرانی کرتا ہے۔ مجرموں کو گرفتار اور پولیس کی امداد کرتا ہے۔ گاؤں میں ہرکارہ بھی ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں پنچایت یعنے گاؤں کے بزرگوں کی ایک جماعت بھی ہوتی تھی جو تنازعات کا فیصلہ کرتی اور عام طور سے اہل دیہات کو متحد رکھتی تھی۔

(۳) **گاؤں کے دستکار۔** بڑھئی۔ لوہار، کمہار، موچی، ساہوکار (جو عام طور سے تھوک فروش بنیا بھی ہوتا ہے) سنار اور تیلی ہر گاؤں میں ہوتے ہیں۔ دستکار گاؤں کے باشندوں کی خدمت انجام دینے کے لئے موروثی طور سے ذمہ دار ہوتے ہیں ان کو گاؤں میں مکانات دیئے جاتے ہیں اور اپنی خدمات کا معاوضہ زمین یا غلہ کی صورت میں سالانہ پابندی کے ساتھ پاتے ہیں۔ دست کار جو اشیا رتیار کرتے ہیں چونکہ ان کے لئے بازار محدود ہوتا ہے۔ اس لئے تقسیم عمل بہت ناقص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی صنعت ہنوز بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔

قدیم دیہی زندگی۔ ہر گاؤں تقریباً خود مکتفی اور آزاد تھا۔ صرف نمک اور چند اشیائے تعیش گاؤں کے میلے یا بیرونی سوداگروں سے خریدے جاتے تھے۔ بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات منقطع تھے اور باہمی تبادلہ صرف ان ہی اشیا تک محدود ہوتا تھا جن کو آدمی یا بارکش جانور لے جا سکتے تھے۔ اچھی سڑکیں بڑی تعداد میں مفقود تھیں۔ البتہ شیر شاہ سوری نے سڑکیں بنانے کی جو ابتدا کی وہ مابعد دور میں بھی باقاعدگی کے ساتھ جاری رہی۔ سندھ اور گنگا کے صرف چند قدرتی دریائی

راستے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ داخلی تجارت کافی طور سے ترقی نہ کر سکی۔ ہر ایک گاؤں کو اپنی احتیاجات کا خود کفیل ہونا پڑتا تھا۔ معمولی حالات میں زندگی بسر ہو جاتی تھی۔ لیکن قحط کے زمانہ میں سخت مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ زر کا کم استعمال تھا اور اشیاء کا اشیاء سے تبادلہ ہوا کرتا تھا۔ چونکہ عام طور پر غلّہ کی ہی مانگ رہتی تھی۔ اس لئے یہی معیار قدر شمار ہوتا تھا۔ گاؤں کے دستکاروں کی اجرت کا تعین بہت پیچیدہ تھا۔ لیکن عمل درآمد کی بناء پر جو اجرت ادا کی جاتی تھی اس کو چاروناچار قبول کرنا ہی پڑتا تھا۔ مسابقت کے مقابلہ میں عمل درآمد پر ہی معاشی تعلقات کا مدار تھا۔ مشترکہ خاندانی زندگی، ذات پات کے طریقے اور اہل دیہات کی قدامت پرستی کی وجہ سے مزدوروں کا نقل وطن ممکن نہ تھا۔ گاؤں میں موجودہ زمانہ سے زیادہ اس وقت اتحاد اور یکجہتی پائی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر گاؤں کے تالاب مناور اور راستے خود گاؤں والے ہی مفت تعمیر کر دیتے تھے۔ اس زمانہ میں اس اجتماعی زندگی کی کمزوری بہت تشویش انگیز ہے۔ رسوم۔ رواج پیدائشی حیثیت ہی کو گاؤں کی زندگی میں حاکمانہ اہمیت حاصل تھی رسوم ورواج سے ہندوستان کے قدیم معاشی نظام میں لگان اجرت اور قیمت کا تعین عمل میں آتا تھا۔ اور رواج میں تبدیلی ناممکن تھی۔ کسی خاص ذات اور خاندان میں پیدا ہونے کے بعد سماج میں اس کی حیثیت متعین ہو جاتی تھی اور تعلقات کی آزادی باقی نہیں رہتی تھی۔

دیہاتی نظام زندگی میں تغیر۔ انتظامی مرکزیت اور مغربی تہذیب کے اثرات سے انفرادی آزادی کے تخیل کی وسعت پذیری اور ذرائع حمل ونقل میں انقلاب کی وجہ سے دیہات کی معاشی زندگی کا نظام بدل رہا ہے۔ مالگذاری پولیس اور عدالت کے جدید انتظامی مرکزیت نے قدیم گاؤں کی خود مختارانہ حکومت کو کمزور کر دیا ہے۔ مغربی انفرادیت کے اثر سے ہندوستانی دیہات میں قدیم اجتماعی احساسات زائل ہو رہے ہیں۔ ریلوں کا جال بچھ جانے سڑکوں کی تعمیر اور موٹر بس کے جاری ہونے سے ذرائع حمل ونقل میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اور شہروں سے گاؤں کی بیگانگی باقی نہ رہی۔

تغیر پذیر دیہات کی بنیادی خصوصیتیں۔

(۱) سب سے پہلے گاؤں کی قدیم خود مکتفی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب اہل دیہات کپڑے

گیاس کا تیل، الومنیم کے برتن، شکر، چائے، دیاسلائی، چھتری، قینچیاں، سینے کی مشینیں، وغیرہ باہر سے خریدتے ہیں اور ان کے معاوضہ میں مختلف زرعی پیداواریں بازار کے لئے مہیا کرتے ہیں جن سے بیرونی دنیا میں ان اجناس کا تبادلہ عمل میں آتا ہے۔

(۲) قحط کی مصیبت کم ہوگئی ہے کیونکہ دور دراز مقامات سے غلہ کی درآمد میں سہولتیں مہیا ہوگئیں ہیں۔ قحط پہلے غذا اور زر دونوں کا ہوا کرتا تھا۔ اب قحط قلت زر کی وجہ سے واقع ہوتا ہے اور قحط زدہ علاقوں میں عارضی بے روزگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن فاقہ کشی کی نوبت نہیں آتی ممکن ہے کہ کسی سال کسی خاص گاؤں میں کوئی پیداوار نہ ہو لیکن دوسرے مقامات سے درآمد کے ذریعہ اس کی تلافی کیجا سکتی ہے لیکن بنگال کے قحط کو ایک استثنائی صورت خیال کرنا چاہیئے۔

(۳) اشیاء سے اشیاء کے تبادلہ کے بجائے زر کا نظام رواج پاگیا ہے کیونکہ بیرونی دنیا سے تجارت وسعت پاگئی ہے۔ اور جو لوگ گاؤں سے باہر تلاش روزگار میں جاتے ہیں وہ گھروں کیلئے نقد رقم بھیجا کرتے ہیں۔ مالگذاری اور دوسرے محاصل، لگان، سود اور اجرت کو اب بڑی حد تک نقد ادا کرنا پڑتا ہے۔ دستکاروں وغیرہ کی خدمات کے معاوضہ میں غلہ دینے کا قدیم طریقہ اب بھی گو کسی قدر باقی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت بڑی حد تک گھٹ گئی ہے۔

(۴) اہل دیہات کی بود و باش کا قدیم غیر تبدیل پذیر طریقہ اب بدل رہا ہے۔ اکثر اپنی آمدنی میں توفیر کی غرض سے شہروں میں نقل وطن کرنے لگے ہیں۔ نقل وطن معاشی ضرورت کی خاطر ہوتا ہے اور ترقی یافتہ ذرائع حمل ونقل کی وجہ سے سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں۔

(۵) مسابقت اور معاہدہ کی وسعت سے اب عمل درآمد اور پیدائشی حیثیت کی اہمیت تدریجاً کم ہورہی ہے۔ ذات پات اور مشترکہ خاندانی زندگی کے طریقے کسی قدر کمزور ہوچکے ہیں۔ لگان، قیمتیں اور اجرتیں مسابقت کے زیر اثر آتی جارہی ہیں۔ پٹہ داروں کے مابین سخت مسابقت کی وجہ تحفظ مفاد کی خاطر قانون پٹہ داران کی ضرورت داعی ہوئی۔ مغربی تہذیب، زر کے استعمال اور نقل وحمل کی ترقی نے اس تبدیلی میں مزید سرعت پیدا کردی ہے۔

زراعت اور دیہی دستکاریوں کے تغیرات - (۱) زراعت کا نظام تجارتی بنیاد پر قائم ہو گیا اور دیہات سارے ملک سے وابستہ ہو گئے - ہندوستان کی زرعی پیداوار مثلاً کپاس، جوٹ روغنی تخم، گیہوں اور چاول کو دنیا کے بازاروں میں جگہ حاصل ہے - ۱۸۶۹ء میں نہر سوئیز کے افتتاح کی وجہ سے زرعی پیداوار کے بازار تمام دنیا میں قائم ہو گئے - مختلف فصلوں کو مختلف علاقوں سے مخصوص کرنے کا رجحان بھی پیدا ہو رہا ہے - مثلاً بمبئی میں کپاس پنجاب میں گیہوں اور بنگال میں جوٹ - زراعت میں تجارتی مفاد پیش نظر ہو جانے کے باعث غیر غذائی اشیاء مثلاً کپاس اور جوٹ غذائی اشیاء کی جگہ حاصل کر رہے ہیں -

بندرگاہوں اور اندرونی تجارتی مرکزوں میں ایک جامد اور پیچیدہ تجارتی تنظیم وجود میں آ رہی ہے - جو درمیانی افراد، تھوک فروش اور برآمد کرنے والے تاجروں کے قابو میں ہے - زمین کی قوت نمو پر بہت بار پڑ چکا ہے - اور زمینات تیزی کے ساتھ تقسیم ہوتی جا رہی ہیں - لیکن قدیم زراعتی طریقہ اب تک برابر جاری ہے -

(۲) دیہات کی دستکاریاں بھی تغیر کی حالت سے گزر رہی ہیں - مشین کی بنی ہوئی سستی اشیاء، کپڑے، الومنیم کے برتن اور گیاس کے تیل نے، باففدوں، کمہار اور تیلیوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے - اب دیہات کو تمام دستکاروں کی احتیاج ناگزیر نہیں رہی ہے - بڑھئی اور سناروں نے .... قصبات میں توطن اختیار کر کے اپنی حالت درست کر لی ہے - جن دستکاروں نے ایسا نہیں کیا وہ مشکلات سے دوچار ہو رہے ہیں - بعض پیشہ وروں نے اپنے آبائی پیشے ترک کر دیئے اور گاؤں کے مزدوروں کی صف میں شامل ہو گئے یا قصبات میں نقل مقام کر گئے -

قصبات اور صنعتیں قدیم معاشی نظام میں - اگرچہ کہ برطانوی دور حکومت سے قبل ہندوستانی آبادی کی اکثریت دیہات میں آباد تھی لیکن اسکے ساتھ قصبات کی ترقی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر دیا گیا تھا - بعض شہر مثلاً اجمیر، بنارس، اور الہ آباد زیارت گاہیں تھیں - دہلی، لکھنؤ گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ، بیجانگر، اورنگ آباد، وغیرہ سلطنتوں کے پایہ تخت یا صوبوں

کے مستقر تھے ۔ مرزاپور اور سورت تجارتی مراکز تھے ۔ شہری صنعت زیادہ ترقی یافتہ حالت میں تھی دیہی صنعت کے مقابلہ میں یہاں تقسیم عمل کافی ترقی یافتہ ہوچکی تھی ۔ حرفتی پیشہ وروں کے جتھوں نے اپنی حالت منظم کرلی تھی ۔ زر اور ہنڈیوں کا استعمال عام طور پر مروج تھا ۔ دور گذشتہ میں ... ہندوستان اس زمانے کے معیار کے مطابق نہ صرف ایک زرعی ملک بلکہ ایک عظیم صنعتی ملک بھی تھا ۔ قدیم زمانے سے ہندوستان کی ہنرمندی اور دستکاری کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ پارچہ بافی اس ملک کی گویا قومی صنعت تھی ۔ سوتی صنعت کے اہم مراکز ڈھاکہ، لکھنو، احمد آباد، ناگپور، ناندیڑ اور مدورا تھے ۔ دیہات کی صنعتی اسلحہ سازی، ڈھال، بناکاری کے برتن، جواہرات سونا چاندی کے تار ۔ سنگ تراشی، دباغت اور چمڑے کا کام، کاغذ سازی اور عطر سازی کی بھی صنعتیں موجود تھیں ۔ جہاز سازی ترقی یافتہ حالت میں تھی اور لوہے کی صنعت کو بڑا عروج حاصل تھا ۔

قدیم صنعتوں کے زوال کے اسباب ۔ مندرجہ ذیل اسباب ہندوستانی صنعتوں کے زوال کے باعث ہوئے ۔

(۱) قومی سلطنتوں کا مفقود ہوجانا جس کی وجہ سے صدہا صنعتیں اہل دربار اور امرا کی سرپرستی سے محروم ہوگئیں (۲) بیرونی اثرات کا مخالفانہ عمل ۔ برطانوی حکومت کے قیام سے بالواسطہ قدیم حرفتی جتھے کمزور ہوگئے ۔ اہل ملک بالخصوص تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کا مذاق بدل گیا ۔ انھوں نے حکمران قوم کے معیار کو اختیار کرلیا ۔ اور مغربی مصنوعات زیادہ پسندیدہ قرار پاگئیں (۳) ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پارلیمان کا طرز عمل ۔ انیسویں صدی کے وسط میں قبل اس کے برطانیہ اعظمی میں آزاد تجارتی مسلک اختیار کیا گیا ۔ قدیم نوآبادیاتی مسلک کے تحت ہندوستانی صنعتیں انگریزی صنعتوں کے تابع کی گئیں اور برطانیہ عظمی میں اس پر گراں محاصل عائد کئے گئے ۔ (۴) مشین سے تیار کی ہوئی مصنوعات سے مسابقت ۔ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کے زوال کی ایک اہم وجہ مشین کا بنا ہوا مال ہے ۔ یہ مال برطانیہ عظمی اور دوسرے ممالک سے درآمد ہونے لگا ۔ ہندوستان میں ریل اور سڑکوں کی وسعت کی وجہ سے بھی یہ مسابقت تیز ہوگئی (۵) تجارتی معاملات میں

حکومت ہند کی عدم مداخلت۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے آغاز تک حکومت ہند کی پالیسی یہ تھی کہ صنعتوں کو اس کے حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ریلوں کی وجہ سے ایک طرف بیرونی مصنوعات کی درآمد میں اور دوسری طرف خام پیداواروں کی برآمد میں سہولتیں بہم پہنچنے لگیں۔ ان اسباب کی وجہ سے ملک کی معاشی زندگی پر دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ملکی صنعتوں کے زوال کی وجہ سے دیہات کے توطن میں وسعت پیدا ہوگئی۔ تقریباً تین چوتھائی لوگوں کی زندگی کا انحصار زراعت پر رہگیا پہلے شاید ۶۰ فیصدی آبادی کا انحصار زراعت پر تھا اور ۴۰ فیصدی صنعت و حرفت کے ذریعہ زندگی بسر کرتے تھے گو ملک کی بیرونی تجارت میں اضافہ ہوا لیکن برآمد زیادہ تر زرعی پیداوار اور درآمد زیادہ تر مصنوعات پر مشتمل تھی۔ اس طرح ملک کی قومی معاشی زندگی میں ترقی کے لئے صرف ایک ذریعہ رہگیا

صنعت و حرفت میں تغیرات۔ ۱۸۷۰ء ہی سے جبکہ ہندوستان کی صنعتی حالت بہت ہی پست ہوچکی تھی۔ مغربی طرز کی جدید منظم صنعتوں کی ترقی کا سلسلہ آغاز ہوا۔ اس وقت سے انگریز تاجر اور سرمایہ داروں نے چائے کافی اور نیل کی کاشت شروع کی اس سے ہندوستانی خصوصاً بمبئی کی تجارت پیشہ جماعت کو اس قسم کے کاروبار شروع کرنے کی ترغیب ہوئی بمبئی والوں کو اس معاملہ میں ہندوستان کی رہنمائی کا شرف حاصل ہے۔ اس طرح بمبئی کو ہندوستان کے صنعتی صدر مقام کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہاں پارچہ بافی کے کارخانے قائم ہوئے۔ اس زمانہ میں جوٹ کے کارخانے کلکتہ کے اطراف و جوانب میں قائم ہوئے۔ لیکن سرمایہ اور ہمت اہل یورپ کی تھی اس کے بعد معدنی اور دوسری مختلف صنعتوں مثلاً روئی اوٹنے اور دابنے، لوہے اور فولاد کے ڈھالنے، چاول پینے اور روغن نکالنے کے کارخانوں میں صنعتی انقلاب رونما ہوا۔ ابتدائی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ سودیشی تحریک (جسکی ابتداء ۱۹۰۵ء سے ہوئی) اور ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ عظیم صنعتی ترقی کی موجب ہوئی ۱۹۲۳ء میں امتیازی حفاظتی پالیسی مزید ترقی کی محرک ثابت ہوئی۔ اگرچہ کہ اب تک صرف دو فیصد آبادی نے منظم صنعتوں

کو اپنے پیشہ کے طور پر اختیار کیا ہے۔

متذکرۂ بالا معاشی تغیر سے قصبات کی تعداد میں کسی حد تک اضافہ ہوا ہے۔ ریلوے، جہاز رانی اور جدید صنعتوں کی نشو ونما مثلاً ٹاٹا کے آہنی اور فولادی کارخانے کے باعث جمشید پور وغیرہ نئے قصبے آباد ہو گئے۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد برطانیہ عظمیٰ میں جس تیزی سے شہریت کو ترقی ہوئی اس سے مقابلہ کیا جائے تو ہندوستان میں رفتار ترقی بہت سست ہے۔ شہری آبادی ہندوستان میں اب بھی مجموعی آبادی کا صرف گیارہ فیصدی ہے۔ تجارتی راستوں کے بدل جانے اور دستکاری کے زوال کی وجہ سے چند قصبات کو زوال ہوا۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کی ترقی کے ضروری ذرائع اپنے اثرات کو برابر محسوس کر رہے ہیں۔

خلاصہ۔ ہندوستان ایک معاشی تغیر کے دور سے گزر رہا ہے۔ اگر ایک طرف ہم بعض شہروں مثلاً بمبئی اور کلکتہ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ یورپ و امریکہ کے اکثر ترقی یافتہ ممالک کی معاشی حالت کی سطح پر پہنچ رہے ہیں۔ اور دوسری طرف وسیع دیہی رقبوں میں قدیم نظام کی جھلک اب تک باقی ہے۔ گو اب یہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ عام رجحان یہ ہے کہ یہاں ابھی ان ہی ممالک کے حالات پیدا کئے جائیں جہاں صنعتی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ صنعتی ترقی میں دوسرے ممالک کی طرح بعض نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کارخانوں کے شہروں میں کثرت آبادی، گھریلو صنعتوں کا زوال، عورتوں اور بچوں سے محنت کا استحصال ناجائز۔ لیکن ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ یہ نقائص ناگزیر ہیں۔ بلکہ قانون سازی اور دوسرے طریقوں سے ان کا انسداد ممکن ہے۔

زراعت

ہندوستان میں زراعت کی اہمیت۔ ہندوستان کی تقریباً تین چوتھائی آبادی کا ذریعہ معیشت زراعت ہے۔ زراعت ہی اس ملک کا گویا سب سے بڑا قومی پیشہ ہے۔ لیکن قلیل پیداوار، چھوٹے اور منتشر رقبہ اراضی کاشتکار کی مقروضیت اور مارکٹنگ کے نقائص کے اعتبار سے اس پیشہ کی حالت نہایت پست ہے۔

زرعی پیداوار

برطانوی ہند میں مختلف فصلوں کے رقبہ وار اعداد و شمار

دیہی کاغذات بابتہ ۴۰-۱۹۳۹ء کے مطابق برطانوی ہند کا کل رقبہ ۵۱ کروڑ دس لاکھ ایکڑ ہے جنگلات کا رقبہ ۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۱۳٫۳ فیصدی ہے۔

ناقابل کاشت رقبہ ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۱۷٫۴ فیصدی۔

مزروعہ افتادہ رقبہ ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۱۹ فیصدی

غیر مزروعہ رقبہ ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۹٫۳ فیصدی

زیر کاشت رقبہ ۲۰ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ مجموعی رقبہ کا ۴۱ فیصدی

مجموعی مزروعہ رقبہ - ۴۲ کروڑ ۸۰ لاکھ ایکڑ (اس میں آبپاشی کا رقبہ ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ ہے)

مملکت آصفیہ میں علاقہ دیوانی کا مجموعہ رقبہ ۳ کروڑ ۱۳ لاکھ ایکڑ یا مملکت کے مجموعی رقبہ کا ۵۹،۲۴ فیصد ہے - باقی ۲ کروڑ ۱۵ لاکھ ایکڑ علاقہ صرفخاص مبارک پائیگاہوں اور جاگیرات وغیرہ پر مشتمل ہے -

مملکت آصفیہ میں حسب ذیل رقبہ جات ہیں -

جنگلات کا رقبہ	۶۳ لاکھ ۹۹ ہزار ایکڑ
ناقابل کاشت رقبہ	۹۹ لاکھ ۵۲ ہزار ایکڑ
مزروعہ افتادہ رقبہ	۱۸ لاکھ ۳۶ ہزار ایکڑ
غیر مزروعہ رقبہ	۳۳ لاکھ ۸۶ ہزار ایکڑ
زیر کاشت رقبہ	۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ

ذیل کے جدول سے برطانوی ہند میں سنہ ۱۹۰۱-۲ء کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کی فصلوں کی اضافی اہمیت واضح کی گئی ہے

غذائی اشیاء	سنہ ۱۹۰۱-۲ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ
چاول	۷۰،۰۷	۳۱،۸	۷۰،۱	۲۸،۶
گیہوں	۱۸،۶۱	۸،۴	۲۶،۱۳	۱۰،۷
جو	۶،۲۲	۲،۸	۶،۱	۲،۵
جوار	۲۱،۸۲	۹،۸	۲۱،۶۸	۸،۹
باجرہ	۱۳،۲۰	۵،۹	۱۳،۴۶	۵،۴

غذائی اشیاء	سنہ ۱۹۰۱-۲ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فی صد مقابلہ
راگی	۳،۷۵	۱،۷	۳،۱۴	۱،۴
مکائی	۶،۲۰	۲،۸	۵،۷۷	۲،۳
چنا	۹،۷۸	۴،۴	۱۱،۶۹	۴،۸
دوسرا غلہ اور دالیں	۲۷،۳۵	۱۲،۴	۲۸،۸۲	۱۱،۸
میزان	۱۷۷،۰۰	۸۰،۰	۱۸۷،۰۵	۷۶،۴
ترکاریاں میوے مسالے اور متفرق غذائی فصلیں	۸،۰۳	۳،۷	۶،۷۷	۲،۸
نیشکر	۲،۶۰	۱،۳	۳،۶۳	۱،۵
مجموعی غذائی اشیاء	۱۸۷،۶۳	۸۵،۰	۱۹۷،۴۵	۸۰،۷
روغن دار اشیاء				
السی	۲،۲۷	۱،۰	۲،۴۴	۱،۰
تل	۳،۷۵	۱،۷	۲،۲	،۹
رائی اور سرسوں	۲،۸۸	۱،۳	۳،۵۴	۱،۴
مونگ پھلی			۵،۵۴	۲،۲

روغن دار اشیاء	سنہ ۱۹۰۱-۲ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ
ناریل	—	—	ء۶۸	ء۳
ارنڈی	—	—	ء۴۰	ء۲
دوسرے روغندار تخم	۳ء۰۷	۱ء۴	۱ء۴۹	ء۶
میزان	۱۱ء۹۷	۵ء۴	۱۶ء۲۹	۶ء۶
ریشے دار پودے				
کپاس	۱۰ء۳۰	۴ء۷	۱۳ء۳۴	۵ء۵
جوٹ	۲ء۲۸	۱ء۰	۲ء۱۲	۱ء۳
دوسرے ریشے	ء۵۶	ء۲	ء۰۷	ء۳
میزان	۱۳ء۱۴	۵ء۹	۱۷ء۲۳	۷ء۱
دیگر غیر غذائی اشیاء				
نیل	ء۷۹	ء۴	ء۰۴	ء۰۲
افیون	ء۶۱	ء۳	ء۰۱	ء۰۰۳
کافی	ء۱۲	ء۰۵	ء۱۰	ء۰۴
چائے	ء۴۹	ء۳	ء۷۴	ء۳۰
تمباکو	ء۹۵	ء۴۵	۱ء۱۸	ء۴۸
چارہ کی فصلیں	۲ء۹۴	۱ء۴	۱۰ء۴۷	۴ء۲۸

	سنہ ۱۹۰۱-۲ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء بحساب ۱۰ لاکھ ایکڑ	مجموعی زیر کاشت رقبہ فیصد مقابلہ
متفرق اشیاء	۱،۷۱	،۸	۱،۰۶	،۴۴
میزان	۳۳،۷۲	۱۵،۰	۴۷،۱۲	۱۹،۳۰
مجموعی مزروعہ رقبہ (شمول اس رقبہ کے جس پر ایک سے زیادہ مرتبہ کاشت ہوئی)	۲۲۰،۳۵	۱۰۰	۲۴۴،۵۷	۱۰۰

مندرجہ بالا جدول سے ہندوستان کی وسیع پیداوار کے علاوہ اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ غذائی اشیاء کو غیر غذائی اشیاء پر اہمیت حاصل ہے ملک میں جو خوراک صرف ہوتی ہے وہ سب زرعی پیداوار سے مہیا ہوتی ہے اس کے علاوہ کثیر مقدار میں غیر غذائی پیداوار مثلاً روئی، جوٹ اور روغنی تخم بڑی اور اہم مصنوعات کے کام آتی ہے۔ یہ ہماری خارجی تجارت کا بڑا ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں کاشت وسیع کی ترقی کے لئے جو بھی گنجائش ہے اس سے کہیں زیادہ کاشت عمیق کے لئے گنجائش ہے۔

ہندوستان کی اہم فصلیں

(الف) غذائی اشیاء

(۱) چاول۔ ہندوستان کی فصلوں میں چاول سب سے زیادہ ممتاز پیداوار ہے اور آبادی کے بڑے حصہ کی غذا کا جزو اعظم ہے۔ کل مزروعہ زمین کے ۲۹ فیصدی سے کچھ زیادہ رقبہ پر اس کی کاشت

ہوتی ہے۔ چاول ہندوستان میں مرطوب مقامات میں زیادہ کاشت کیا جاتا ہے۔ بنگال، بہار، اڑلیسہ اور مدراس چاول کی پیداوار کے خاص صوبہ جات ہیں۔ صوبہ متحدہ، صوبہ متوسط، آسام اور بمبئی میں بھی کافی مقدار میں چاول پیدا ہوتا ہے۔ زیادہ تر موسم سرما میں چاول کی کاشت ہوتی اور دسمبر و جنوری میں اسکی فصل کٹتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں دھان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اس زمانہ میں شاہی زراعتی ریسرچ کونسل چاول کی تحقیقات میں خاص طور پر مصروف ہے۔ ۱۹۴۳-۴۴ء میں چاول کا زیر کاشت رقبہ ۸ کروڑ ۹۹ لاکھ ایکڑ تھا اور اس کی پیداوار ۲ کروڑ چھ لاکھ ٹن تھی۔

مملکت آصفیہ میں چاول کی کاشت سمت تلنگانہ میں ہوتی ہے ۱۹۴۳-۴۴ء میں ۱۴ لاکھ ۳۴ ہزار ایکڑ رقبہ پر اس کی کاشت کی گئی اور ۴ لاکھ ۴۳ ہزار ٹن کی پیداوار ہوئی۔ کل ہندوستان میں چاول کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد کا درجہ چھٹواں ہے۔

(۲) **گیہوں**۔ رقبہ کے لحاظ سے چاول کے بعد گیہوں کو اہمیت حاصل ہے۔ کل مزروعہ رقبہ کے گیارہ فیصدی حصہ پر گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ یہ ربیع کی خاص فصل ہے۔ اکتوبر سے دسمبر تک اس کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ اور مارچ سے مئی تک اس کی فصل کاٹی جاتی ہے۔ پنجاب، صوبہ متحدہ اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے باشندوں کے غذا کا دارومدار گیہوں پر ہے دوسرے صوبوں میں اس کی کاشت برآمد کی خاطر کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار کے خاص مقامات پنجاب، صوبہ متحدہ، صوبہ متوسط، و برار وسط ہند کی ریاستیں، بمبئی، بہار اور اڑلیسہ ہیں۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ میں جو رقبہ گیہوں کی کاشت کے لئے مخصوص ہے وہ مجموعی رقبہ کا دو تہائی حصہ ہے۔ جنگ عظیم سے قبل ہندوستانی گیہوں کثیر مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا لیکن خود ہندوستان میں گیہوں کھانے والوں کی آبادی میں اضافہ ہونے کی وجہ اس کی برآمد گھٹ گئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی گیہوں کی تامین کے لئے بیرونی گیہوں پر گراں محصول عاید کردیا گیا ہے کیوں کہ ارزاں بیرونی گیہوں خاص کر آسٹریلیا کا ہندوستانی بازاروں میں بکثرت درآمد ہونے لگا تھا۔

سندھ میں سکھر براج اور پنجاب کی نہری نوآبادیوں کی ترقی سے گیہوں کے رقبہ میں اضافہ ہوا ہے ۴۴-۱۹۴۳ء میں گیہوں کا زیر کاشت رقبہ ۳ کروڑ ۷۳ لاکھ ایکڑ تھا اور اسکی پیداوار ۹۹ لاکھ ٹن رہی۔

مملکت آصفیہ میں مرہٹواڑی اور کرناٹک کے اضلاع کے باشندوں کی خاص غذا گیہوں بھی ہے ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۶ لاکھ ۹۶ ہزار ایکڑ رقبہ پر اس کی کاشت کی گئی۔ اس کی پیداوار ۷۷ ہزار ٹن رہی۔ کل ہندوستان میں گیہوں کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد کا نواں درجہ ہے۔

(۳) **جو**۔ خاص طور پر صوبہ متحدہ، بہار اور پنجاب میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ انسان اور جانور دونوں کی غذا ہے۔ ملک سرکار عالی میں اس کا زیر کاشت رقبہ ۶ ہزار ایکڑ ہے۔ بلدۂ حیدرآباد کے اطراف اور فوجی رقبوں میں اسکی کاشت کیجاتی ہے۔

(۴) **جوار اور باجرہ**۔ یہ دونوں اجناس مدراس اور بمبئی کے ملحقہ علاقوں کے غریب باشندوں کی اہم غذا ہیں۔ ان سے مویشیوں کے لئے بھی چارہ ملتا ہے۔ جوار اور باجرہ کی دکن میں خاص طور پر کاشت ہوتی ہے۔ باجرا خریف کی پیداوار ہے۔ جوار خریف اور ربیع دونوں موسموں میں بوئی جاتی ہے۔ جوار اور باجرہ کی برآمد نہیں ہوتی۔

مملکت آصفیہ میں جوار کا زیر کاشت رقبہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۹۲ لاکھ ۸۱ ہزار ایکڑ ہے جو کل ہندوستان میں سب سے بڑا رقبہ ہے۔ اور باجرہ کا رقبہ ۱۸ لاکھ ۴۸ ہزار ایکڑ ہے۔ ان ہر دو اغذیہ کی پیداوار علی الترتیب ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۱۲ لاکھ ۲۶ ہزار ٹن اور ایک لاکھ ۶۶ ہزار ٹن تھی

(۵) **دالیں**۔ تمام ہندوستان میں بوئی جاتی ہیں اور لوگوں کی عام غذا ہے۔ صوبۂ متحدہ، پنجاب، بمبئی، صوبۂ متوسط اور بنگال میں خاص طور پر ان کی کاشت کی جاتی ہے۔ دالوں میں خاص طور پر چنے کی بہت اہمیت ہے۔ صوبۂ متحدہ میں مجموعی رقبہ کا نصف حصہ چنے کی کاشت کے لئے مختص ہے۔ داخلی طلب زیادہ ہونے کی وجہ سے بہت کم مقدار میں اس کی برآمد ہوتی ہے

مملکت آصفیہ میں چنے کا زیر کاشت رقبہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۵ لاکھ ۷ ہزار ایکڑ تھا اور ۴۴-۱۹۴۳ء میں اس کی پیداوار ۶۰ ہزار ٹن رہی۔

(۶) پھل، ترکاریاں اور مسالے:۔ ہندوستان میں میوہ کی کاشت ترقی یافتہ حالت میں نہیں ہے۔ کیونکہ لوگوں کی غربت کی وجہ سے داخلی طلب بہت کم ہے اور ان کی برآمد کے لئے ذرائع حمل ونقل اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ و نیز ان کے حفاظتی طریقے ناقص اور ان کا بازار بہت محدود ہے۔ سررشتۂ زراعت اب اس کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے۔ چنانچہ پشاور کی وادی میں زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ مسالے مثلاً کالی مرچ، ادرک، الائچی اور سپاری کی کاشت جنوبی ہند کے زیریں علاقہ میں ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ مسالوں کی بعض قسمیں ہر جگہ کاشت کی جاتی ہیں۔
سررشتۂ زراعت سرکار عالی نے باغات کی نسبت تشہیر و اشاعت شروع کی ہے۔ باغ کے مالکوں کے لئے مشورہ و امداد کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔ میوے اور ترکاری کا زیر کاشت رقبہ ۷ لاکھ ایکڑ پر پھیل گیا ہے۔ اور اس سے باغات کی پیداوار میں خاصہ اضافہ رونما ہوا ہے یہاں کے خاص میوے موز اور آم ہیں۔

(۷) نیشکر۔ گنّے کا اصلی وطن غالباً ہندوستان ہے یہاں اس کا زیر کاشت رقبہ دوسرے ملکوں کے رقبہ سے زیادہ ہے لیکن ایک ایکڑ پر جس مقدار میں نیشکر پیدا ہونا چاہئیے اسقدر مقدار کا حاصل نہ ہونا، ملکی طلب کی کثرت۔ جاوا سے شکر کی درآمد کے خلاف عدم تحفظ اور صنعت شکر سازی کی ناقص تنظیم کے باعث گذشتہ زمانہ میں غیر ملکی شکر کی کثیر مقدار میں درآمد ناگزیر ہو گئی تھی۔ لیکن مسرت کا مقام ہے کہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں حفاظتی پالیسی اختیار کی گئی۔ اور شاہی زراعتی مجلس تحقیقات نے نیشکر کی کاشت کی تحقیقات میں کافی دلچسپی لی۔ ہندوستانی شکر کی صنعت سرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہے۔ اور جہاں تک نفیس شکر کا تعلق ہے۔ ملک کی پیداوار خود مکتفی ثابت ہو رہی ہے ہندوستان میں فی الحال نیشکر سے زیادہ تر گڑ حاصل کیا جاتا ہے۔ صوبہ متحدہ، پنجاب، بہار اوڑلیسہ، مدراس اور بمبئی نیشکر کی کاشت کے خاص صوبے ہیں ۴۴-۱۹۴۳ء میں نیشکر کا زیر کاشت رقبہ ۴۱ لاکھ ۱۳ ہزار ایکڑ تھا اور پیداوار ۵۶ لاکھ ۹۶ ہزار ٹن رہی۔
نظام ساگر کی نہروں کی آبپاشی کے علاقے میں نئی قسم کی نیشکر کی کاشت کو رواج دینے کا

ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بودھن ضلع نظام آباد میں نظام شوگر فیکٹری کا کارخانہ قائم ہوگیا۔ اور یہاں شکر بن رہی ہے۔ نیشکر کا زیر کاشت رقبہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۶۳ ہزار ایکڑ تھا۔ اس کی پیداوار ۹۱ ہزار ٹن رہی۔ نیشکر کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد کا دسواں نمبر ہے۔

(ب) غیر غذائی اشیاء

(۱) روغنی تخم۔ ہندوستان میں مختلف روغنی تخم کی کاشت ہوتی ہے۔ مثلاً السی، تل، رائی سرسوں، مونگ پھلی، ناریل، ارنڈی، بنولہ، دھنیاں، زیرہ، اور اجوائن۔ روغنی تخم بہت اہم ہیں اور کل مزروعہ زمین کے تقریباً (۷) فیصدی رقبہ میں ان کی کاشت ہوتی ہے۔ اور سالانہ ایک کثیر مقدار برآمد ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ جنگ عظیم کے بعد بیرونی بازاروں میں بڑھتے ہوئے مقابلہ کی وجہ سے روغنی تخم کی برآمد بہت کچھ متاثر ہوچکی ہے۔ یہ امر محسوس کیا جاتا ہے۔ کہ ہندوستان نے ابھی تک روغنی تخم سے مفید مطلب کام لینا نہیں سیکھا ہے۔ صرف روغن نکالنے کی مقامی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ روغنی تخم میں مونگ پھلی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ صوبۂ متحدہ صوبۂ متوسط، بہار، اوڑیسہ، بمبئی، پنجاب اور مدراس روغنی تخم کی پیداوار کے خاص صوبہ ہیں ۴۴-۱۹۴۳ء میں روغنی تخم کی دو کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ اراضی پر کاشت ہوئی اور اس کی پیداوار ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن رہی۔

مملکت آصفیہ کو روغنی تخم کی پیداوار کیلئے بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہمہ قسم کے روغنی تخم مثلاً مونگ پھلی، ارنڈی، السی، تل، سرسوں، اور رائی یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ مونگ پھلی کے زیر کاشت رقبہ میں کافی توسیع ہورہی ہے ۴۴-۱۹۴۳ء میں مونگ پھلی کا زیر کاشت رقبہ ۱۳ لاکھ ۷ ہزار ایکڑ تھا اور پیداوار ۱۰ لاکھ ۷۵ ہزار ٹن ہوئی۔ حیدرآباد کو اس کی کاشت کیلئے ہندوستان میں تیسرا درجہ حاصل ہے۔

۴۴-۱۹۴۳ء میں ارنڈی کا زیر کاشت رقبہ ۸ لاکھ ۳۲ ہزار ایکڑ تھا اور اس کی پیداوار ۶۶ ہزار ٹن ہوئی۔ ارنڈی کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان میں اس کو پہلا درجہ حاصل ہے۔

ہندوستان کے کل رقبہ کا ۴۳ء۵ فیصدی مملکت آصفیہ ہی میں پیدا ہوتا ہے - ارنڈی کی کاشت کے اصلی مراکز اضلاع نلگنڈہ ورنگل اور محبوب نگر ہیں -

سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں السی کا زیر کاشت رقبہ ۴ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ تھا اور اس کی پیداوار ۳۰ ہزار ٹن ہوئی - السی کی پیداوار کے لحاظ سے اس کو ہندوستان میں تیسرا درجہ حاصل ہے -

سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء میں تل کا زیر کاشت رقبہ ۶ لاکھ ۵۵ ہزار ایکڑ تھا - اور اس کی پیداوار ۴۴ ہزار ٹن ہوئی -

(۲) ریشے - کپاس اور جوٹ اہم پیداواریں ہیں - (الف) کپاس سب سے ممتاز ریشے کی پیداوار ہے - ایک بڑے رقبہ میں اس کی کاشت کی جاتی ہے - کپاس کی زیادہ تر کاشت بمبئی - صوبہ متوسط، برار، پنجاب، صوبہ متحدہ کی ریاستوں اور مدراس میں ہوتی ہے - کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے ممالک متحدہ امریکہ کے بعد ہندوستان ہی کا درجہ ہے ہندوستانی کپاس عموماً چھوٹے ریشہ والی ہوتی ہے - اور اعلیٰ قسم کی صنعت پارچہ بافی کے لئے موزوں نہیں ہے امریکی اور مصری کپاس ہندوستانی کپاس سے اعلیٰ قسم کی شمار ہوتی ہے -

سررشتہ زراعت ملکی کپاس کو ترقی دینے اور ہندوستان میں امریکی قسم کی اعلیٰ کپاس کی کاشت کی افزائش کے لئے کوشش کر رہا ہے - فی ایکڑ زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی بھی کوششیں ہو رہی ہیں - تقریباً ۶۰ فیصدی خام کپاس برآمد کردی جاتی تھی - جاپان، چین اور براعظم یورپ کے بعض ممالک جنگ سے قبل ہندوستانی کپاس کے خریدار تھے - سندھ کے لمبے ریشہ والے کپاس کا لنکاشائر کے کارخانوں میں قابل لحاظ خریداری تھی -

سنہ ۱۹۱۷ء میں انڈین کاٹن کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس نے کپاس کی کاشت اس کی تجارت آمیزش اور ممالک غیر کی کم قیمت کی اشیاء درآمد کے متعلق مختلف سفارشات کیں - اسکی سفارش پر انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی قائم ہوئی تاکہ سررشتہ زراعت اور کپاس کے تاجروں کے مابین قریبی تعلق قائم رہے - انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی نے کپاس کی اصلاح اور قانون سازی میں بہت سی مفید خدمات

انجام دی ہیں۔ کپاس کی تجارت میں اصلاح کے لئے ۱۹۲۲ء میں ایسٹ انڈیا کاٹن ٹریڈ اسوسیئشن قائم ہوئی جو خاص تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہے ۱۹۴۳-۴۴ء میں کپاس کا زیر کاشت رقبہ ۲ کروڑ ۴ لاکھ ایکڑ تھا اور اس کی پیداوار ۵۰ لاکھ ۹۴ ہزار بیل رہی۔

جہاں تک خام کپاس کا تعلق ہے برطانوی صوبہ جات اور ریاستوں میں مملکت حیدرآباد کا چوتھا درجہ ہے اور ہندوستان کی کل پیداوار کا دس فیصدی یہاں سے حاصل ہوتا ہے۔ کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے مملکت کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ لیکن یہ کپاس اعلیٰ درجہ کی نہیں ہوتی اس لئے ۱۹۲۶ء سے گاورانی کپاس پر تجربے کئے جارہے ہیں۔

۱۹۲۸ء میں کپاس کی کاشت اور اس کے حمل ونقل پر چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ مرہٹواڑہ میں فی ایکڑ کپاس کی پیداوار کا اوسط ۲۸۰ پونڈ اور تلنگانہ و کرناٹک میں ۲۴۰ پونڈ ہے۔ مملکت آصفیہ میں گاورانی کپاس کی اب زیادہ کاشت کی جارہی ہے۔ جو معمولی کپاس کے تخم سے بلحاظ خوبی تار اور مجموعی مقدار کپاس کے بڑھیا مانی جاتی ہے ۱۹۴۳-۴۴ء میں ۱۴ لاکھ ۵ ہزار ایکڑ رقبہ پر اس کی کاشت کی گئی۔ اس کی پیداوار ۱۹۴۳-۴۴ء میں پانچ لاکھ ۶۵ ہزار بیل ہوئی۔

(ب) جوٹ۔ کی پیداوار کے لئے ہندوستان دنیا کا واحد مالک ہے۔ اس کی کاشت بنگال میں گنگا اور برہمپتر کے ڈیلٹا، آسام، بہار، اڑیسہ تک محدود ہے۔ گاد کی وجہ سے یہاں کی زمین زرخیز ہے اور کھاد پر کچھ خرچ کئے بغیر اس کی وسیع فصل تیار ہوتی ہے۔ خارجی تجارت میں کپاس کے ساتھ خام جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کا بھی درجہ ہے۔

۱۹۴۰ء میں جوٹ کا زیر کاشت رقبہ ۴۳ لاکھ ۴۴ ہزار ایکڑ تھا ۱۹۴۱ء میں جنگ کی وجہ سے جوٹ کے رقبہ کاشت میں حکومت بنگال کی جانب سے جبری طور پر کمی کی گئی۔ انڈین سنٹرل جوٹ کمیٹی جو ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی اپنا تجربہ خانہ قائم کرکے جوٹ اور جوٹ کی پیداوار کی تحقیقات میں مصروف ہے مملکت آصفیہ میں سن کی کاشت کی جاتی ہے جبکہ زیر کاشت رقبہ ۱۹۴۴-۴۵ء میں پچاس ہزار ایکڑ تھا۔

(۳) نیل۔ نیل کی سرگذشت بہت ہی تغیر پذیر رہی ہے۔ ارزاں مصنوعی جرمنی رنگ کی مسابقت

سے پہلے ہندوستانی نیل کی صنعت کو فروغ حاصل تھا۔ ۱۹۰۸ء تک نصف سے زائد قیمت کا رنگ اور دباغتی اشیاء برآمد کی جاتی تھیں۔ اس کے بعد برآمد اور خود زیر کاشت رقبہ بہت کم ہوگیا۔ اس صنعت کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ ارزاں کاشت اور ارزاں صنعت پر اس کی کامیابی کا انحصار ہے۔ نیل کی کاشت مدراس، صوبہ متحدہ، بہار، اوڑیسہ اور بنگال میں ہوتی ہے۔ نیل کی خارجی تجارت کے لحاظ سے صوبہ بہار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

(۴) **افیون**۔ حکومت ہند کی پالیسی کی وجہ سے افیون کا زیر کاشت رقبہ تدریجاً گھٹایا جارہا ہے۔ بین الاقوامی معاہدات کی رو سے طبی اغراض کے علاوہ دوسرے مقاصد کے تحت افیون کی برآمد بند ہوچکی ہے۔ ملک میں بھی اس کے استعمال پر سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ صوبۂ متحدہ میں حکومت سے خاص اجازت لے کر اس کے پودے کی کاشت کی جاسکتی ہے۔

(۵) **کافی**۔ کافی ہندوستان میں ایک غیر ملکی پودا ہے۔ ریاست میسور، مدراس، کورگ، کوچین اور ٹراونکور میں اس کی کاشت ہوتی ہے۔ یورپی بازاروں میں برازیل کی ارزاں کافی کے مقابلہ کی وجہ سے ہندوستان میں اس کی کاشت بہت متاثر ہوئی۔

(۶) **چائے**۔ چین کے سوا دنیا میں سب سے زیادہ چائے ہندوستان میں ہوتی ہے۔ چائے ملک کی سب سے بڑی نخل بندی کی صنعت ہے۔ ملک میں چائے نوشی کا رواج بڑھنے اور ممالک غیر میں برآمد کی وجہ سے اس کی کاشت عرصہ تک ترقی پذیر رہی چائے کی پیداوار کے خاص مقامات آسام، بنگال، مدراس، پنجاب (کانگڑا) صوبۂ متحدہ اور ٹراونکور ہیں۔ برطانیہ ہندوستانی چائے کا سب سے بڑا بازار ہے۔ اور وہاں کی درآمد میں ۹۰ فیصدی حصہ ہندوستانی چائے کا ہوتا ہے۔ دنیا کی معاشی کساد بازاری، ضرورت سے زائد پیداوار، جاوا اور سماترا کی مسابقت کی وجہ سے چائے کی کاشت بہت متاثر ہوئی۔ حالیہ جنگ کی وجہ سے اس نخل بندی صنعت کو زیادہ فائدہ ہوا۔

(۷) **تمباکو**۔ تمباکو کے دو خاص مرکز مشرقی و شمالی بنگال اور جنوبی ہندوستان ہیں تمباکو کی پیداوار کے خاص صوبے مدراس، بنگال، بہار، اڑیسہ، بمبئی، صوبہ متحدہ اور پنجاب ہیں پیداوار

کی کثیر مقدار تو یہیں خرچ میں آجاتی ہے۔ البتہ مدراس سے قابل لحاظ مقدار میں برآمد ہوتی ہے۔
سگریٹ کے زیادہ استعمال کی وجہ سے ہندوستان میں صنعت سگریٹ سازی کے زیادہ کارخانے
قائم ہوگئے ہیں۔ دہلی اگریکلچرل ریسرچ انسٹیٹیوٹ تمباکو کے بہتر بنانے کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے۔
بیرونی تمباکو اور سگریٹ کثیر مقدار میں ابھی تک درآمد ہوتے ہیں۔ ان پر بھاری درآمدی محصول
عاید کرنے سے ملک میں اس کی کاشت اور ملکی تمباکو کے استعمال میں اضافہ ہو رہا ہے۔

۴۴-۱۹۴۳ء میں مملکت آصفیہ میں تمباکو کا زیر کاشت رقبہ ۶۵ ہزار ایکڑ اور اس کی پیداوار
۱۴ ہزار ٹن ہوئی۔ تمباکو کی پیداوار کے لحاظ سے حیدر آباد کا ہندوستان میں آٹھواں نمبر ہے۔ تمباکو
کی پیداوار کے خاص اضلاع نلگنڈہ اور بیدر ہیں۔

(۸) چارے کی فصلیں۔ ہندوستان میں مویشیوں کی بڑی تعداد کے مقابلہ میں چارے
کی فصلوں کا زیر کاشت رقبہ بہت کم ہے۔ اس کی کاشت کے خاص رقبے پنجاب، بمبئی اور صوبہ متحدہ
ہیں۔ سررشتہ زراعت اس کی کاشت اور چارہ کے محفوظ کرنے کی جانب زیادہ توجہ کر رہا ہے۔

(۹) ربر۔ موجودہ صنعت میں ربر ایک اہم خام پیداوار ہے۔ زیادہ تر جنوبی ہندوستان میں
پیدا ہوتا ہے۔ ربر کی زیادہ مقدار برآمد کر دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں دنیا کی مجموعی پیداوار کا
صرف تین فیصد پیدا ہوتا ہے۔

قلت پیداوار اور اس کے اسباب۔ ہندوستان میں ان ممالک کے مقابل جہاں
زراعت بہتر تنظیمی حالت میں ہے۔ تقریباً تمام فصلوں میں فی ایکڑ بہت قلیل پیداوار حاصل ہوتی ہے
مثال کے طور پر ہندوستان میں کپاس فی ایکڑ ۷۵ پونڈ سے ۱۰۰ پونڈ تک حاصل ہوتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں
ممالک متحدہ امریکہ میں ۱۸۰ پونڈ اور مصر میں ۳۰۰ سے زائد ۴۰۰ پونڈ تک ہوتی ہے۔ ہندوستان میں شکر
کی مقدار کیوبا کی شکر سے ⅓ جاوا سے ¼ اور ہوائی سے ⅙ کم ہوتی ہے۔ قلت پیداوار کے اسباب
یہ ہیں۔ غیر یقینی بارش، سیلاب، ژالہ باری، کہر اور دوسرے موسمی اثرات، جنگلی جانوروں اور چوہوں
ٹڈوں اور دوسرے امراض سے نقصانات، کاشت کے ناقص طریقے، چھوٹے اور منتشر قطعات اراضی

اور کاشتکاروں کی بے سروسامانی۔ آبپاشی میں اضافہ اور سررشتہ زراعت کی جانب سے انسداد امراض اور طریقہ کاشت کی اصلاح کی کوششوں سے امید ہے کہ پیداوار کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔

زمین اور اس کے مسائل

تقسیم و انتشار اراضی۔ اب زمین کے دو خاص مسائل یعنے تقسیم و انتشار اراضی اور آبپاشی سے بحث کیجائیگی۔

ہندوستان کی زراعت کا سب سے بڑا نقص تقسیم و انتشار اراضی ہے۔ زمین کا رقبہ نہ صرف وسعت میں بہت چھوٹا ہوتا ہے بلکہ مختلف مقامات پر منتشر بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر رام لال بھالے نے پیرام پور (پنجاب) میں تحقیق کی ہے کہ وہاں ۵ء۴۳ فیصدی ایسے کاشتکار ہیں جن کی زمینات ۲۵ مختلف مقامات میں ہیں۔ پنجاب کے ۲۳۹۷ مواضعات میں خاص تحقیقات کی گئی تھی معلوم ہوا کہ ۷ء۱۷ فیصدی کاشتکاروں کی زمین ایک ایکڑ سے کم تھی۔ ۵ء۲۵ فی صدی کاشتکاروں کی ایک ایکڑ سے تین ایکڑ تک ۹ء۱۴ فیصدی کاشتکاروں کی چار سے پانچ ایکڑ اور ۸ء۱ فیصدی کی ۱۵ ایکڑ سے ۱۰ ایکڑ تھی۔ موضع پمپلا سوداگر (ضلع پونا) میں ڈاکٹر مان کی تحقیق کے بموجب ۸۱ فی صدی کاشتکاروں کے کھیت دس ایکڑ سے کم اور ۶۰ فیصدی کاشتکاروں کے پانچ ایکڑ سے بھی کم تھے۔

تقسیم و انتشار اراضی کے اسباب۔ آبادی میں اضافہ صنعتوں کی مناسب ترویج کا فقدان بلکہ زوال مشترکہ خاندانی زندگی کے زوال کی وجہ سے انفرادیت کا رجحان ہندؤں اور مسلمانوں کے قوانین وراثت اور رسوم و رواج تقسیم اور انتشار اراضی کے خاص اسباب ہیں۔ خاندانی جائداد ورثاء میں بٹ جاتی ہے۔ انتشار اراضی کے ساتھ تقسیم در تقسیم بھی عموماً ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ ہر حصہ دار خاندانی زمین سے ایک ایک ٹکڑا چاہتا ہے۔ خواہ ایک سے زیادہ جگہ واقع کیوں نہ ہو۔ بجائے اس کے کہ ایک غیر منقسمہ حصہ اراضی حاصل کیجائے۔ اس طریق کار کا مقصد یہ ہے کہ حصول میں مکمل مساوات حاصل ہو۔

اسلامی وراثت کے قوانین کے ساتھ تقسیم جائداد کے جو قواعد اسلامی فقہا نے قرار دیئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بہت ممکن ہے کہ حالیہ زمانہ میں پیدا شدہ مشکلات پر قابو حاصل کرلیا جائے۔ اصلی قوانین سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا شدہ مشکلات ناقابل حل معلوم ہوتے ہیں۔

تقسیم و انتشار اراضی کے نقصانات۔ تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کے نقصانات بہت اہم ہیں۔ چھوٹے قطعات اراضی پر کاشت کرنے میں مختلف طرح سے نقصان واقع ہوتا ہے۔ دو بیل اور ایک ہل جیسے معمولی ساز و سامان سے بھی غریب کاشتکار ہمیشہ اپنے مفید مطلب استفادہ نہیں کرسکتا۔ اور اس طرح مصارف کاشت لامحالہ بڑھ جاتے ہیں۔ بعض وقت زمین کے قطعات اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان میں اچھی طرح ہل نہیں چلایا جاسکتا۔ اور کاشت بھی نہیں کی جاسکتی۔ باڑہ لگانا کنوؤں کی کھدوائی اور دوسرے کارآمد امور بکفایت عمل میں نہیں لائے جاسکتے۔ احاطہ بندی اور مینڈ بنانے میں کثیر رقبہ بیکار جاتا ہے۔ کم محنت میں زیادہ افادہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ انتشار اراضی کی صورت میں ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں جانا۔ محنت اور وقت کے رائگاں جانے کا باعث ہوتا ہے۔ اسی انتشار کی وجہ سے سرحدی نزاعات بھی ہوا کرتے ہیں۔ تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کیوجہ سے مسابقت کا میدان گویا باقی ہی نہیں رہتا۔ اور کاشت عمیق نہیں کی جاسکتی۔ ایسے خطہ ہائے اراضی کی کاشت نہ تو زراعت کی ترقی میں ممد ہوتی ہے اور نہ ان سے پیداوار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ غرض ہندوستان میں غیر معاشی کھیتوں کی بڑی تعداد ہے۔ جن میں کاشتکاری نفع بخش نہیں ہے۔

اصلاحی تدابیر۔ حال ہی میں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اختیاری اور قانون کے ذریعہ جبری کوششیں کی جارہی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کسانوں کو ایک ایسا معاشی رقبہ حاصل ہو جو بقول کیٹنگ "کوئی شخص اپنی یا اپنے خاندان کے ضروری اخراجات کی تکمیل کے بعد آرام سے زندگی بسر کرسکے"۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ زمین، محنت اور اصل کے مابین ایک ایسا رشتہ قائم کیا جائے کہ جس سے آجر کو ممکنہ نفع حاصل ہو۔ اور مقصد یہ ہو کہ افراد کو مناسب رقبہ

حاصل ہو کہ ان کو اپنی معاشی حالت کی اصلاح کا موقع ملے ۔

منتشر اراضی کو یکجا کرنے کی مفید تدابیر انجمن ہائے امداد باہمی کی جانب سے اختیار کی گئی ہیں چنانچہ پنجاب میں ۲۱-۱۹۲۰ء سے سررشتہ امداد باہمی کے تحت اس کام کا آغاز ہوا ہے ۔ اس تجربہ سے مفید نتائج حاصل ہوتے اس سے زمین زیادہ پیداآور اور قیمتی ہوگئی ۔ مقدمہ بازی اور لڑائی جھگڑے کم ہوچکے ہیں ۔ اصلاح و ترقی کی خواہش قوی اور نمایاں ہوگئی ۔ اتصال اراضی کے قانون بابتہ ۱۹۲۶ء کی وجہ سے اراضی کے مختصر اور منتشر قطعات کو یکجا کر کے وسیع کیا جارہا ہے ۔ لیکن اس تحریک کی رفتار بہت سست ہے ۔

صوبہ متوسط میں اتصال اراضی کے قانون بابتہ ۱۹۲۸ء سے اچھے نتائج برآمد ہورہے ہیں ۔ جس کی چھتیس گڈھ ڈیویژن سے ابتدا کی گئی ہے ۔ صوبہ مدراس اور صوبہ متحدہ میں بھی اس کام کا آغاز ہوچکا ہے ۔

۱۹۲۷ء میں صوبہ بمبئی میں ایک ناکام کوشش کی گئی ۔ سرچنی لال مہتا نے مجلس وضع قوانین میں اتصال اراضی کے بارے میں مسودہ قانون پیش کیا تھا ۔ سخت لیکن غیر مبصرانہ مخالفت کی وجہ سے مسودہ واپس لے لینا پڑا ۔ اس سلسلہ میں زرعی کمیشن کے ایک انتباہ کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کے مسئلہ پر زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیئے ۔ اور جو گروہ اس سے متاثر ہو اس کی رائے اور عصبیت پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے ۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس میں جبر و تشدد کا عنصر لازمی ہوگا لیکن اس کا نفاذ آخری منزل پر ہونا چاہیئے ۔ تاکہ خدمی پٹہ دار اور آسامیوں کی پیدا کردہ مشکلات پر غلبہ حاصل ہوسکے ۔

مملکت آصفیہ میں تقسیم و انتشار اراضی ۔ مملکت آصفیہ میں ابھی تقسیم و انتشار اراضی کے مسئلہ کے حل کرنے کی جانب کوئی توجہ نہیں ہوئی ہے ۔ البتہ ہرسہ پائیگاہ کے اراضیات کے اتصال پر غور کرنے محکمہ مالگذاری کے تحت ایک اسپیشل آفیسر کا تقرر حال ہی میں عمل میں آیا تھا ۔ لیکن اس کی رپورٹ ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے ۔

محمد ناصر علی صاحب نے موضع دوپلی (ضلع نظام آباد) کی معاشی تحقیق ۱۹۳۹ء میں کی ہے۔ صاحب موصوف کی تحقیق کے بموجب موضع دوپلی میں اوسط رقبہ فی پٹہ دار ۴ر۵ ایکڑ سے زاید نہیں اور اراضیات کی وسعت میں تدریج تخفیف ہوتی چلی آرہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۴-۵ء میں اوسط رقبہ فی پٹہ دار ۲ر۸ ایکڑ تھا تو ۱۹۳۷-۳۸ء میں اوسط رقبہ گھٹ کر ۴ر۵ ایکڑ ہوگیا۔ موضع زیر بحث میں جملہ کاشت شدہ اراضیات کا لحاظ کرتے ہوئے ۴ر۰۷ فیصد اراضیات پانچ ایکڑ سے کم میں ۲ر۲۷ فیصد اراضیات ۲ تا ۱۰ مختلف قطعات اور ۴ر۵ فیصد اراضیات زائد از دس قطعات پر مشتمل ہیں۔ اس سے زرعی زمین، زرعی محنت اور زرعی اصل کے عام تناسب کی وجہ سے مزارعین کے مصارف کاشت بڑھ جاتے ہیں۔ آمدنیوں میں تخفیف ہوتی ہے اور تخفیف آمدنی معیار زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ اور یہی تقسیم و انتشار اراضی کے اہم نقصانات ہیں۔

راقم الحروف نے موضع پھول مری (ضلع اورنگ آباد) میں معاشی تحقیق ۱۹۳۷ء میں کی تھی۔ موضع پھول مری میں ہر کاشتکار کے رقبہ اراضی کا اندازہ اوسطاً ۱۶ ایکڑ سے زاید نہیں ہے۔ ذرائع آبپاشی کی موجودگی میں اتنی اراضی ایک کاشتکار خاندان کے لئے آسودہ حالی سے بسر کرنے کے لئے کافی تصور کی جاسکتی ہے۔ مگر بہت سے کاشتکار ایسے ہیں کہ جن کے پاس ذرائع آبپاشی موجود نہیں ہیں اور ان کو خشکی کی کاشت پر بسر اوقات کرنی پڑتی ہے۔ ایسے کاشتکاروں کے لئے یہ رقبہ کافی نہیں ہے۔ بہت سے کاشتکار ایسے بھی ہیں۔ کہ ان کے قبضہ میں جو اراضیات ہیں ان کا رقبہ اس قدر کم ہے کہ ان کو ہر وقت مصروف رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اراضیات مختلف مقامات پر منتشر ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کاشتکار کے اراضیات اکیس ۲۱ مختلف مقامات پر پھیلے ہوتے ہیں جس کا رقبہ ۲۶ر۷ ایکڑ ہے۔ اور اس کا دھارہ ۰ر۷۲ر۵ روپیہ ہے۔ اس سے نگرانی ناکافی اور ناقص ہوتی ہے۔ زمین کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں آنے جانے سے وقت بیکار صرف ہوتا ہے۔ موضع پھول مری میں خشکی کا سب سے چھوٹا نمبر جو ایک کاشتکار کے قبضہ میں ہے۔ اس کا رقبہ صرف تیس گنٹے ہے۔ دھارا ایک روپیہ ہے۔ باغات کا سب سے چھوٹا نمبر کا رقبہ ایک ایکڑ ۴ گنٹہ ہے جس کا دھارہ چھ ۶ روپیئے ہے۔

یہ تو دیوانی علاقوں کی تفصیل بیان کی گئی ۔ بڑی جاگیروں پائیگاہوں اور صرفخاص مبارک کے اضلاع صدہا مواضعات میں منتشر طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ حکومت کی تھوڑی سی کوششوں سے ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

آبپاشی کی اہمیت اور فوائد ۔ ہندوستان میں جب تک زراعت کا انحصار غیر یقینی بارش پر ہے۔ اس پیشہ کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا ۔ اس لئے ضروری ہے کہ جہاں جہاں ممکن ہو آبپاشی کا انتظام کیا جائے۔ ہندوستان کے چند علاقوں مثلاً سندھ، راجپوتانہ اور جنوب مغربی پنجاب میں بارش مفقود ہے۔ اور مصنوعی طریقہ پر آبپاشی کے بغیر کاشت نہیں ہو سکتی بعض علاقوں مثلاً سطح مرتفع دکن میں جہاں بارش غیر یقینی اور غیر مساوی مقدار میں برستی ہے وہاں قلت آب کو دور کرنے کے لئے آبپاشی ضروری ہے چاول اور نیشکر کے لئے بہت زیادہ اور مسلسل پانی کی ضرورت ہے۔ سرمائی فصلوں کے لئے بھی مصنوعی آبپاشی کی ضرورت ہے ۔ پانی کے مہیا کرنے پر ہی زراعت پیشہ لوگوں کی خوشحالی کا انحصار ہے ۔ اسی وجہ سے قدیم زمانہ سے ہندوستان میں کنوؤں اور تالابوں کا رواج تھا۔ چنانچہ تالاب پاکھال اور دولت آباد کا درہ آبشار آج بھی اس زمانہ کی آبپاشی کو یاد دلاتے ہیں۔

آبپاشی کے فوائد بے شمار ہیں۔ پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے خشک قطعات اراضی میں مستقل زراعت قائم ہو سکتی ہے۔ قحط اور خشک سالی میں ان ذرائع سے مصیبتوں میں کمی ہو جاتی ہے۔ زرعی صوبوں مثلاً پنجاب میں ریلوے کو بہت منافع ملتا ہے ۔ اور حکومت کو بھی براہ راست مالی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ آبپاشی سے اچھی زراعت ہو تو برآمدی تجارت (مثلاً گیہوں اور کپاس) کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نہروں سے آبپاشی میں زائد پانی اور نمکین مادے بہت مضرت رساں ہیں۔ قدیم زمانہ میں اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تھی ۔ بعض وقت کھاد آبپاشی کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ نہروں کے علاقوں میں ڈرینج کا انتظام کیا جائے اور پانی کے استعمال میں احتیاط برتی جائے۔

کارہائے آبپاشی کی قسمیں ۔ ہندوستان میں کارہائے آبپاشی کی تین اہم ذرائع حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کنوئیں (۲) تالاب (۳) نہریں۔

نہریں بھی تین قسم کی ہیں : (۱) سیلابی نہریں، (۲) دامی نہریں، (۳) کاریائے ذخیرۂ آب۔

(۱) کنوئیں۔ ہندوستان میں کنوئیں آبپاشی کا بڑا جزو ہیں۔ ملک میں پچیس لاکھ کنوئیں ہیں جن سے تقریباً ۲۵ فیصدی رقبہ سیراب ہوتا ہے۔ کنوؤں کی ملکیت خانگی ہوتی ہے۔ حکومت ان کی کھدوائی میں مدد کرتی ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے تقاوی قرضے دئیے جاتے ہیں۔ کنوؤں پر پاور پمپ اور نل کنواں تعمیر کرنے میں بھی امداد کی جاتی ہے۔

(۲) تالاب۔ تالاب ہندوستانی زراعت کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ مدراس میں تالاب سب سے زیادہ ترقی یافتہ حالت میں موجود ہیں، جہاں ۳۵ ہزار سے زائد تالاب ہیں۔ کل ہندوستان میں تالابوں کے ذریعہ ۸۰ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس پنجاب اور سندھ میں تالاب نہیں ہیں۔

(۳) نہریں۔ اب ہندوستان میں آبپاشی کی سب سے اہم شکل نہروں سے قرار پائی ہے حکومت خاص طور پر ان کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں مقامی حالات کے تحت جدا جدا قسم کی نہریں بنائی گئی ہیں۔ ذیل میں ان کی صراحت کی جاتی ہے۔

(الف) سیلابی نہریں ۔ براہ راست دریا سے پانی لیا جاتا ہے۔ یہ موسمی نہریں ہیں اور ان میں اسی وقت پانی آتا ہے۔ جبکہ دریا بھرپور رہتے ہیں۔ اور پانی ایک خاص سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ سندھ اور پنجاب کی زمینات میں اسی قسم کی نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے اور اب بھی کسی قدر رواج ہے۔

(ب) دامی نہریں ۔ دریا کے اطراف بند بنا کر تعمیر کی جاتی ہیں جو سال بھر بہتی ہیں اور زمینات کی آبپاشی ہوتی ہے۔ صوبۂ متحدہ، پنجاب اور مدراس میں اس قسم کی نہریں پائی جاتی ہیں۔ دریائے سندھ پر جو بند تعمیر کیا گیا اس کا نام سکھر بیراج ہے اس سے سیلابی نہریں دامی نہروں میں تبدیل ہوگئیں ہیں اور سال بھر بہتی رہتی ہیں۔

(ج) **ذخیرۂ آب کی نہریں**۔ بارش کے پانی کو جمع کرنے کے لئے کسی وادی پر بند تعمیر کیا جاتا ہے۔ وہاں جو پانی جمع ہوتا ہے وہ نہروں کے ذریعہ تقسیم ہوتا ہے۔ اس قسم کی نہریں دکن صوبہ متوسط اور بندھیل کھنڈ میں تعمیر کی گئی ہیں۔ کیونکہ یہاں کے دریا صرف بارش میں بہتے ہیں۔ اس لئے مصنوعی ذخیرۂ آب بنانا پڑتا ہے۔

سرکاری کارہائے آبپاشی کی تقسیم ۱۹۲۱ء تک سرکاری کارہائے آبپاشی کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

(۱) کارہائے پیدا آور (۲) کارہائے حفاظتی (۳) کارہائے خورد

(۱) **کارہائے پیدا آور**۔ ان کی تعمیر کے دس سال بعد اصلی سرمایہ پر اس قدر خالص مالگذاری وصول ہونے کی توقع ہوسکتی تھی کہ سالانہ مصارف سود کی تکمیل ہوجائے اس قسم کے کار آبپاشی زیادہ تر شمالی ہند اور مدراس میں ہیں ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۲۴ کروڑ ۷۱ لاکھ ایکڑ رقبہ اس قسم کے کارہائے آبپاشی سے سیراب ہوا۔ اس وقت تک اس پر ۱۱۴ کروڑ لگایا گیا۔ کارہائے آبپاشی کی یہ واحد نوعیت ہے جس کی تعمیر کے لئے حکومت نے قرضہ حاصل کیا تھا۔

(۲) **کارہائے حفاظتی** سے براہ راست آمدنی کی توقع قائم نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ دکن جیسے غیر یقینی بارش کے قطعات میں قحط کا انسداد مقصود تھا۔ اس کے اخراجات قحط و بیمہ کے مدات سے ادا کیئے جاتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد اس قسم کے کام بالواسطہ پیدا آور ہوجاتے ہیں ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۲۸ لاکھ ۸۴ ہزار ایکڑ رقبہ اس سے سیراب ہوا ان کاموں پر ۳۹ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگایا گیا تھا۔

(۳) **کارہائے خورد**۔ ان کا شمار متفرق کاموں کی قسم میں ہوا کرتا تھا۔ خاص کر چھوٹے تالاب جن کو برطانوی حکومت نے اپنے دور میں درست کیا یا تعمیر کیا۔ مالگذاری کے مد سے ان پر رقم خرچ کی گئی۔

۱۹۲۱ء کے بعد سے یہ قدیم تقسیم بدل گئی ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو کہ کس مد سے رقم حاصل کی گئی۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ مفاد عامہ کے کسی کام کو قرضہ لے کر چلایا جائے۔ حفاظتی

اور کارہائے خرد کی تقسیم حذف کر دی گئی ہے۔ اب کارہائے آبپاشی کی خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے حسب ذیل تقسیم عمل میں آئی ہے۔

(۱) پیداآور (۲) غیر پیداآور (۳) وہ رقبہ جات جو بغیر سرمایہ لگائے سیراب ہوتے ہیں۔

کارہائے آبپاشی میں ترقی۔ سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کے اختتام پر آبپاشی اور دریائی جہازرانی پر صرف شدہ جملہ سرمایہ کی مقدار ۱۵۲ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تھی۔ اس کے مقابل سنہ ۱۹۰۱-۲ء میں ۴۲ کروڑ ۴ لاکھ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کی سالانہ آمدنی ۱۳ کروڑ ۶ لاکھ روپے تھی اور اخراجات چار کروڑ ۶ لاکھ روپے ہوئے اس لئے صرف شدہ اصل پر ۵ ر ۸۹ فیصدی خالص آمدنی وصول ہوئی۔ سنہ ۱۸۷۸-۷۹ء میں رقبہ آبپاشی ایک کروڑ ایکڑ تھا۔ اور سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ تک بڑھ گیا۔ اور پیداوار کی قیمت میں ۰۹ ۱ کروڑ روپے تک اضافہ عمل میں آیا۔ (بہ استثنائے کارہائے بغیر سرمایہ) آبپاشی کی شرح معاوضہ ہر صوبہ میں فصل اور نہروں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ پنجاب میں شرح معاوضہ نیشکر کی اراضی کے لئے سات روپیہ آٹھ آنہ سے بارہ روپیہ فی ایکڑ اور گیہوں کیلئے تین روپیہ چار آنہ سے پانچ روپیہ چار آنہ فی ایکڑ ہے۔ پنجاب میں رقبہ آبپاشی سب سے زیادہ ہے۔ جہاں کل رقبہ زیر کاشت کا تقریباً ۱۳ فیصد حکومت کے کارہائے آبپاشی سے سیراب ہوتا ہے صوبہ جات مدراس، متحدہ، سندھ کو بھی آبپاشی کی سہولتیں میسر ہیں۔ جنوبی بمبئی اور صوبہ متوسط (بہ استثنائے برار) میں آبپاشی کے لحاظ سے بہت کم ترقی ہوئی ہے۔ بنگال اور آسام نے بھی آبپاشی کے لحاظ سے بہت کم ترقی کی ہے۔ لیکن وہاں موافق بارش کی وجہ سے اس کی احتیاج بھی زیادہ نہیں ہے۔ برطانوی ہند میں تمام ذرائع آبپاشی سے سیراب شدہ رقبہ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ تھا۔ جس میں سے ۳ کروڑ ۹ لاکھ ایکڑ نہروں سے، ۶۰ لاکھ ایکڑ تالابوں سے ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ایکڑ کنوؤں سے اور دیگر ذرائع سے ۷۰ لاکھ ایکڑ سیراب ہوا۔

آبپاشی سے متعلق حکومت کی پالیسی۔ مغلیہ دور میں آبپاشی کے جو ذرائع مہیا کئے گئے تھے وہ آخری دور کی ابتری میں برباد ہو گئے۔ برطانوی حکومت کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو شمالی

ہند کی چند موجودہ سیلابی نہریں (گنگا اور جمنا کی نہریں) اور مدراس کے ذخائرِ آب اور تالاب بہتر حالت میں تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ان امور پر کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی۔ لیکن انیسویں صدی کے وسط سے حکومت قدیم کارہائے آبپاشی کی ترمیم اور تجدید کرنے لگی۔ اس کے بعد حکومت نے تجربہ حاصل کرکے پیداوار کارہائے آبپاشی کے استحکام و تعمیر کی جدید پالیسی اختیار کی۔ انسداد قحط کی خاطر، قحط کمیشن بابتہ ۱۸۸۰ء نے دکن میں پیداآور کارہائے آبپاشی کی تعمیر کی سفارش کی۔ لیکن کثیر مصارف کی وجہ سے رفتار ترقی بہت سست رہی ۱۹۰۱ء میں حکومت کی آبپاشی کی پالیسی میں ایک جدید باب کا آغاز ہوا۔ اس سال آبپاشی کے کمیشن نے بہت سی سفارشیں کیں۔ کہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ خصوصاً دکن میں حفاظتی اور پیداآور کارہائے آبپاشی کی توسیع کی جائے کمیشن نے کرشنا اور تنگبھدرا پراجکٹ کی بھی سفارش کی کمیشن کی بعض سفارشوں پر عمل ہوا اور اب حکومت نے ریلوں کی تعمیر کی جو پالیسی تھی اس کے بجائے آبپاشی کی طرف توجہ مبذول کی بہت سے نئے کام آغاز کیئے گئے اور مصارف سرمایہ دوگنے سے بھی زیادہ ہوگئے ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بموجب آبپاشی کا کام صوبہ جات کے تفویض ہوا۔ ۱۹۲۳ء کے بعد سے مختلف صوبوں کی حکومتیں کارہائے آبپاشی میں سرگرمی دکھارہی ہیں۔ انیس ۱۹ بڑے اور اہم کام یا تو مکمل ہوچکے ہیں۔ یا زیر تعمیر ہیں۔ نئے اہم کارہائے آبپاشی حسب ذیل ہیں۔

(۱) وادیٔ ستلج پراجکٹ واقع پنجاب ۱۹۳۳ء میں یہ کام مکمل ہوا جس پر ۲۳ کروڑ ۱۲ لاکھ روپیے لاگت آئی۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ پچاس لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔

(۲) سکھر بیرج واقع سندھ ۱۹۳۲ء میں مکمل ہوا۔ تقریباً ۲۸ کروڑ روپیے کی لاگت آئی۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ ۲۵ لاکھ ایکڑ رقبہ سے زائد سیراب ہوگا۔

(۳) کاویری ذخیرۂ آب اور میٹور پراجکٹ واقع مدراس ۱۹۳۴ء میں مکمل ہوا تقریباً ۷ کروڑ ۳۷ لاکھ روپئے صرف ہوئے۔ تیس لاکھ ایکڑ رقبہ کی سیرابی کا اندازہ کیا گیا ہے۔

(۴) بمبئی میں لائیڈ ڈام ۱۹۲۶ء میں تکمیل کو پہنچا۔

(۵) صوبۂ متحدہ میں سارد ا اور دو نہروں کے ذریعہ قابل لحاظ ترقی کی گئی ہے۔

(۶) بنگال میں ڈاموڈا نہر بہت اہم ہے۔

مملکت آصفیہ میں آبپاشی۔ سررشتۂ تعمیرات کا قیام ۱۸۶۸ء میں عمل میں آیا ۱۸۹۶ء میں یہ خیال ہوا کہ بڑے بڑے تالابوں کی نہ صرف وسیع طور پر ترمیم کرنے کی بلکہ ان کو اصلی حالت پر لانے کی ضرورت ہے۔

مملکت آصفیہ کے لئے مثل دیگر زراعتی ممالک کے اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ علاوہ آسمانی بارش کے مصنوعی ذرائع آبپاشی بھی موجود رہیں۔ بہت سے اجناس ایسے ہیں جن کے لئے بارش کے علاوہ مزید پانی لازمی ہے۔ موسم سرما کے فصول کے لئے بارش کا پانی ناکافی ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے۔ کہ جو پانی موسم بارش میں زائد از ضرورت ہو وہ تالابوں کنوٹوں اور باولیوں میں روک لیا جائے۔ دکن میں قدیم زمانہ سے ذرائع آبپاشی بکثرت موجود تھے۔ تلنگانہ میں بہت کم گاؤں ایسے ہیں جہاں تالاب نہ ہو اور جہاں نہیں ہیں اُس کے قرب وجوار میں ایسا بڑا تالاب موجود ہے۔ جس سے متعدد گاؤں سیراب ہوتے ہیں۔ اور بعض ندیوں سے انی کٹ بھی نکالے گئے ہیں مگر اٹھارویں صدی کی عام بدامنی اور شورش کیوجہ سے ان کے شکست وریخت کی مرمت نہ ہوسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی منتشر ہوگئی۔ زراعت کے عوض گھنے جنگل پیدا ہوگئے۔ سر سالار جنگ کے زمانہ سے پھر کوشش ہورہی ہے۔ کہ ان کی مرمت ہو۔ جنگل صاف کئے جائیں۔ نئی نہریں نکالی جائیں۔ ابتداء میں کام آہستگی سے ہوا۔ سر آسمانجاہ کے دور وزارت سے کثیر رقم صرف ہونے لگی

سررشتۂ تعمیرات عامہ کے تحت کارہائے آبپاشی کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) معمولی ذرائع آبپاشی۔ جیسے تالاب انی کٹ اور نہریں جن کے سرمایہ اور محاصل کا حساب نہیں رکھا جاتا۔

(۲) دریاؤں کی وادیوں پر بڑے بڑے ذخائر آب جیسے کہ دیرا، پالیرا، اور نظام ساگر

وغیرہ جن کے سرمایہ اور محاصل کے حسابات رکھے جاتے ہیں۔

سررشتۂ تعمیرات کے بڑے بڑے اور مخصوص کارہائے آبپاشی کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) نظام ساگر، مملکت میں یہ سب سے بڑی آبپاشی کی اسکیم ہے جو سنہ ۱۹۲۳ء میں آغاز کی گئی اور سنہ ۱۹۳۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس ذخیرۂ آب کی تعمیر انجیر ندی پر کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نظام آباد میں ۲ لاکھ ۷۵ ہزار ایکڑ رقبہ کی آبپاشی کی جائے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں اس پروجکٹ کے تحت نو ہزار ایکڑ کا رقبہ سیراب ہوا تو سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں ایک لاکھ ۷ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوا۔ اس پراجکٹ پر ۴ کروڑ ۲۴ لاکھ روپے صرف ہوئے، اندازہ کیا گیا ہے کہ صرف شدہ سرمایہ پر دس فیصدی منافع حاصل ہوگا۔

(۲) ویرا پراجکٹ، یہ ذخیرۂ آب تعلقہ کھمم ضلع ورنگل میں تعمیر کیا گیا ہے، سنہ ۱۹۳۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ اس پر ۳۴ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اس پراجکٹ سے ۱۳ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہورہا ہے۔

(۳) پالیر پراجکٹ۔ یہ ذخیرۂ آب بھی کھمم ضلع ورنگل میں واقع ہے۔ یہ پراجکٹ سنہ ۱۹۲۹ء میں ۲۴ لاکھ روپیہ کے صرفہ سے تعمیر ہوا، سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء میں سات ہزار ایکڑ رقبہ پر کاشت ہوئی۔

(۴) رڈی پراجکٹ انسداد قحط کی غرض سے سنہ ۱۹۳۶ء میں اس پراجکٹ کا کام ضلع بیڑ میں آغاز کیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اس کا کام تکمیل کو پہونچا ۴ لاکھ پچاس ہزار روپیہ کا صرفہ عائد ہوا۔ اس پراجکٹ کے تحت ایک ہزار ایکڑ خریف تین ہزار چھ سو ایکڑ ربیع کی آبپاشی مقصود ہے۔

(۵) ڈونڈی پراجکٹ۔ اضلاع محبوب نگر و نلگنڈہ کو قحط کی بار بار کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے اس پراجکٹ کا کام سنہ ۱۹۳۹ء میں شروع کیا گیا۔ اس کا زیر آب مجموعی رقبہ ۴۵ ہزار ایکڑ ہے۔ اس پر چار لاکھ روپے سے زائد رقم صرف ہوئی ہے۔

مملکت آصفیہ کا رقبہ آبپاشی ۱۳ لاکھ ۱۰ ہزار ایکڑ ہے، جس میں نہروں سے ایک لاکھ

۴۴ ہزار ایکڑ تالابوں سے ۶ لاکھ ۱۷ ہزار ایکڑ کنوؤں سے ۴ لاکھ ۳۶ ہزار ایکڑ اور دیگر ذرائع سے ۵۱ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوتا ہے۔

تنگبھدرا پراجکٹ کے متعلق ہمسایہ حکومتوں سے گفت وشنید ہوکر معاہدات کی تکمیل میں ایک عرصہ لگا۔ اس پراجکٹ کا ابتدائی کام بھی آغاز کر دیا گیا ہے۔ رائچور جیسا قحط زدہ خطہ اس سے سیراب ہوگا۔ ارزاں قیمت پر برقابی قوت بھی میسر آسکے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پراجکٹ کی تعمیر پر بیس کروڑ روپیہ عائد ہونگے، اور پانچ لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔ لیکن جہاں اس قدر اعلیٰ پیمانہ پر آبپاشی کا انتظام کیا جا رہا ہے، وہاں ہمیں ان علاقوں کو بھی بھول نہ جانا چاہیئے جو پانی کے ان خزانوں سے اس قدر فاصلہ پر واقع ہیں کہ جہاں پانی کی فراہمی نہیں ہوسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کی جانب سے اکثر علاقوں میں کنڈیدگی باؤلیات کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن اس کام کی نوعیت آب رسانی کی حد تک محدود ہے۔ آبپاشی کے اغراض کے لئے وسیع پیمانوں پر زیرزمین پانی سے کام لینے کی ضرورت شدید طور سے پائی جاتی ہے۔

پنجاب کی نہری نوآبادیاں ۔ پنجاب کی آبپاشی کی تاریخ میں نہری نوآبادیوں کا بہت اہم حصہ ہے۔ ۱۸۸۰ء سے قبل ملک کا یہ وسیع خطہ غیر یقینی بارش کی وجہ سے ریگستان تھا، جو اب جنوبی چناب جہلم اور باری دوآبہ کی نہروں سے سیراب ہوتا ہے۔ ان نئی نہروں سے سیراب متعدد رقبوں میں لوگوں کو بسانا پڑا۔ ان نوآبادیوں کے باقاعدہ نقشے مرتب کئے گئے۔ زمین کے قطعات کو بڑے اور چھوٹے مربع اور مستطیل رقبوں میں تقسیم کیا گیا، سڑکیں تعمیر ہوئیں، گاؤں کی سرحدیں مقرر کی گئیں، عہدہ داران مال گنجان اضلاع سے موروثی زمینداروں یا پٹہ داروں میں سے آبادکاروں کو منتخب کرتے تھے اور ان کو نوآبادیوں میں بسایا جاتا تھا۔ مختلف نوآبادیوں میں زمینات کے عطا کرنے کے لئے جداجدا قواعد قرار دیئے گئے، ہر شخص کو اوسطاً چالیس سے پچاس ایکڑ رقبہ اراضی دیا جاتا ہے۔ ذی مرتبت موروثی زمینداروں اور اولوالعزم اشخاص کو زیادہ رقبہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے خاص فوجی اور ملکی خدمات کے صلہ میں زمین بھی عطا کی جاتی ہے۔ یہ نوآبادیاں

جو کہ کبھی غیر مزروعہ اور ویران تھیں اب زرخیز نہری نوآبادیات میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ لائل پور شاہ پور، منٹگمری تین خاص نوآبادیاں ہیں۔ دوسری نوآبادیاں سدہانی، سوا ج، پرا جنگ، چونیاں شمالی چناب اور شمالی جہلم میں ہیں۔ ان نوآبادیوں کا مجموعی رقبہ پچاس لاکھ ایکڑ ہے۔ حکومت پنجاب کو ان نوآبادیوں سے خالص منافع مالگذاری وصول ہو رہی ہے۔ مسٹر یم۔ یل۔ ڈارلنگ کے الفاظ میں " یہ نوآبادیاں پنجاب میں خوشحالی کا باعث ہوئیں جو پہلے کبھی خواب و خیال بھی نہ تھا۔

مملکت آصفیہ میں سر علی امام نے جب وہ صدر اعظم تھے، ایک سررشتہ ترقیات عامہ قائم کیا تھا تاکہ ملک کے غیر آباد حصہ کو آباد کیا جائے۔ لیکن بعد میں کام جاری رکھا نہیں گیا۔ ترقیات عامہ کی اسکیم کے حسب ذیل مقاصد تھے۔

(۱) چالیس لاکھ ایکڑ رقبہ غیر مزروعہ و صحرائی کو مزروعہ اور آب پاشی کے قابل بنایا جائے۔

(۲) برطانوی ہند کے متمول مسلمانوں کو ترغیب دلائی جائے کہ اس رقبہ کے معتد بہ حصہ کو بطور زمینداری حاصل کریں۔ تاکہ مسلمانوں کی اقلیت تعداد کی دشواریاں اور پیچیدگیاں رفع ہو جا سکیں۔

(۳) ضلع عادل آباد کو ترقی دی جائے، سڑکیں وغیرہ بعجلت ممکنہ تعمیر کرائی جائیں اور اس کے لئے نصف حق شاہی کام میں لائی جائے۔

(۴) عادل آباد کے معدنوں سے استفادہ کیا جائے۔

(۵) اس کام کی تکمیل کے لئے سررشتۂ مال کا ایک اعلیٰ افسر بطور معتمد ترقیات عامہ مامور ہو اور ایک ماہر حیثیت انجنیر کو مقرر کیا جائے۔

(۶) عادل آباد کا انتظام متعلق مال جنگلات ولوکل فنڈ کا تعلق صیغۂ ترقیات عامہ سے ہو۔

اب تنظیم مابعد جنگ کے تحت گوداوری وادی اسکیم حکومت سرکار عالی کے پیش نظر ہے۔

محنت ساز و سامان اور تنظیم

ہندوستانی کاشتکار۔ زمین کے مسئلہ پر غور کرنے کے بعد اب ہم ہندوستانی زراعت یا دیہی معاشیات کے مسائل یعنی محنت یا خود کاشتکار، اس کے ساز و سامان اور اس کے تنظیمی

کاروبار کا مطالعہ کریں گے

یہ ظاہر ہے کہ کامیاب زراعت کا انحصار کاشتکار کے اوصاف پر ہے موجودہ زمانہ میں ہندوستانی کاشتکار یوروپی یا امریکی کاشتکاروں کی بہ نسبت ذہانت، اولوالعزمی اور کارکردگی میں پیچھے ہیں، دیرپا خشک سالی زمین پر کاشت کا بار، دیہی رقبوں میں تعلیم اور حفظان صحت کی سہولتوں کا فقدان قرضوں کا بار اور ذات پات کے رواج کی وجہ سے اس کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے - ڈاکٹر واکر جیسے بیرونی اہل نظر نے ہندوستانی کاشتکاروں کی محتاط کاشتکاری سخت محنت اور ان کے استقلال کی بہت کچھ تعریف کی ہے. لیکن اس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ اسمیں اپج کم ہوتی ہے، اور روایاتی طریقوں پر ضرورت سے زیادہ کاربند رہتا ہے، اس کی قدامت پرستی اصلاح اور ترقی میں اکثر مانع آتی ہے، کاشتکار اور اس کا ماحول اصلاح طلب ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہوں. گاؤں کے ماحول اور احتیاجات کے لحاظ سے سب سے پہلے ایک وسیع دیہی تعلیمی اسکیم کی ضرورت ہے۔ دیہی تعلیم میں لاسلکی سینما، مناظری قندیل، نمائش اور مظاہروں سے کام لینا چاہیئے. دوسرے یہ کہ پینے کے پاک و صاف پانی طبی امداد اور بہتر مکانات کی فراہمی ضروری ہے تاکہ اہل دیہات کی صحت مندی ترقی کر سکے. کاشتکار کی قدامت پرستی پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے راستوں، حمل و نقل اور ڈاک کے بہتر انتظام کے ذریعہ سے دیہات اور شہر کے مابین زیادہ تعلق قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ غائب زمینداری کا نظام دور کیا جائے اور زمیندار کو دیہات کی زرعی ترقی میں بذات خود دلچسپی اور انہماک سے حصہ لینے پر مائل کیا جائے اس طرح اگر ہماری مملکت کے جاگیرداران اپنے اپنے علاقوں میں مستقل بود و باش اختیار کر لیں تو توقع ہے کہ دیہات کی اصلاح میں بہت کچھ ترقی ہوگی. جاگیردار کے قیام کی وجہ سے مدرسہ خود بخود قائم ہو جائے گا، تاکہ خود اُن کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست ہو سکے. ڈاک خانہ بھی اسی طرح قائم ہو جائے گا. نیز لامحالہ سڑکوں کی حالت درست ہو جائے گی اور طبی امداد کا بھی انتظام ہو جائیگا

کاشت کا طریق. ہندوستانی کاشتکار بڑی حد تک کاشت وسیع کے طریقہ پر عمل کرتا ہے

جو اس کی مقبوضہ اراضی کے مختصر رقبہ کے مدنظر غیر موزوں ہے۔ اس کے برخلاف چین وجاپان میں کیا
کاشت بہت ہی عمیق اور زمین کی انتہائی قوت تک کی جاتی ہے۔ ہندوستانی کاشتکار کی مشکلات کا
حل بھی کاشت عمیق کا طریقہ اختیار کرنے پر منحصر ہے، جس میں مستقل اصلاح اور آبپاشی پر زیادہ رقم خرچ
کرنی پڑیگی۔ بہتر کاشت اور تخم کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ دوہری فصلوں کا بہتر نظام مرتب کیا
جائے۔ خالص اور اچھے قسم کے تخم کو زراعت میں بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ فراہمی تخم کی چند انجمنیں اور
مزرعے قائم ہیں۔ ملک کے تمام حصوں میں بہ تعداد کثیر ان کے قیام کی ضرورت ہے

اضافۂ پیداوار کے لئے بہتر کھاد کا استعمال لازمی ہے۔ ہندوستان میں زمین کے لئے مناسب
کھاد اور اس کی حفاظت کا مسئلہ نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ گوبر بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے حالانکہ اس
کو زیادہ تر کھاد کے کام میں آنا چاہئیے۔ اور ایندھن جنگلات سے مہیا ہونا چاہئیے۔ دیہات میں
کھاد کے محفوظ کرنے کے لئے گڑھے مفید ثابت ہوں گے، سررشتۂ زراعت کے پرچار سے نہروں اور
دوسرے آبپاشی کے رقبوں میں کھاد جیسے امونیم سلفیٹ، ہڈی کا چورہ۔ مچھلیوں کی کھاد اور کھلی
بتدریج کثیر مقدار میں استعمال ہورہی ہے۔

سازوسامان

(۱) آلات و اوزار۔ ہندوستانی کاشتکار اب بھی بڑی حد تک اپنے قدیم اور سادہ
آلات و اوزار استعمال کرتا ہے جو ارزاں اور ہلکے ہوتے ہیں۔ ان کا بنانا اور درست کرنا آسان
ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ آلات بہرحال پیداآوری میں اضافہ کے لئے ضروری ہیں۔ آہنی ناگر، سراون
بیلچے چارہ کاٹنے کی مشین، نیشکر کچلنے والے آلات اور پانی کھینچنے کی چھوٹی مشینوں کا اب کسی حد
تک رواج ہوچکا ہے، لیکن اسمیں مزید ترقی کی گنجائش ہے۔ امریکی طریقہ جس میں وسیع زرعی مشنری
کا استعمال ہوتا ہے ہمارے ملک کیلئے بیکار ہے، کیونکہ یہاں کے کسان غریب ہیں، البتہ امداد باہمی کے
اصول پر مشترکہ کاشتکاری میں اس قسم کے محدود مشنری کا استعمال ممکن ہوگا۔ سررشتۂ زراعت شعبہ
انجینرنگ کے ذریعہ ترقی یافتہ آلات و اوزار کے استعمال کو مقبول بنانے کی کوشش کررہا ہے۔

ممالک آصفیہ میں سمت مرہٹواڑی اور کرناٹک میں ترقی یافتہ لوہے کے ہل مقبول ہیں۔ زرعی آلات میں چرخی بھوسہ نکالنے اور شکر کھلنے کی مشین کا رواج بڑھ رہا ہے۔ باغات کے مالک باغبانی کے آلات اب بڑھی ہوئی تعداد میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ بعض کارخانوں نے آلات و اوزار تیار کرنا شروع کر دیا ہے، اس طرح ممالک میں ایک جدید صنعت ترقی پا رہی ہے۔

(۲) **مویشی**۔ ہندوستانی کاشتکاروں کے پاس مویشی کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی عملاً قوت محرکہ کا ذریعہ بھی ہیں۔ ہل چلاتے اور پانی کھینچتے ہیں، کھاد کا بڑا ذریعہ ہیں، نقل و حمل کے کام آتے ہیں اس لحاظ سے ہندوستان کے مویشیوں کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں مویشی بہت زیادہ تعداد میں ہیں لیکن عام طور پر وہ کمزور ہوتے ہیں اور بہتر پرورش نہ ہونے سے ان کی کارکردگی میں انحطاط پیدا ہو رہا ہے۔ ناکارہ مویشیوں کی ایک کثیر تعداد مذہبی اعتقادات کی وجہ سے گھٹائی نہیں جاتی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے بڑے حصوں میں دسمبر سے جولائی تک چارہ کی کمی رہتی ہے۔ چارہ کے فصل کے اضافہ، ان کے ذخیرہ کرنے اور چارہ کو کفایت سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ نسل کشی کی جانب بھی توجہ نہیں ہے۔ اس کی جانب احتیاط اور وسعت کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو اس طرف پیش قدمی کرنی چاہئیے۔ سابق وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے اس جانب خاص توجہ مبذول کی تھی۔ سررشتۂ علاج حیوانات نسل کشی اور رنڈر لیسٹ جیسے امراض کے علاج اور روک تھام کی مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ رنڈر لیسٹ کی وجہ سے کاشتکار کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ہندوستان میں علاج حیوانات پر توجہ ناکافی ہے، اور اس میں توسیع کی ضرورت ہے مویشی کا بیمہ بھی مفید ثابت ہوگا۔

سررشتۂ علاج حیوانات سرکار عالی۔ سرسالار جنگ اول نے سب سے پہلے دکن کے گھوڑوں اور بیلوں کی پرانی نسل کو ترقی دینے اور ان کی پرداخت کی اہمیت کو محسوس کیا چنانچہ انھوں نے ایک آسٹریلین کو ایک بڑی رقم اس غرض سے دی کہ وہ ایک اسٹڈ فارم قائم کرے،

اس غرض کے لئے ننگم پلی کا انتخاب کرکے وہاں گھوڑوں کے لئے احاطے بنائے گئے، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد علی بن عبداللہ مہتمم افزائش نسل جو پایہ مقرر ہوئے، انھوں نے گھوڑوں کی نسل بڑھانے کی جانب خاص توجہ کی۔

۱۹۰۷ء تک حیوانات کا علاج کرنے اور اُن کے متعدی امراض کا انسداد جدید اصول پر کرنے کیلئے کوئی سرکاری سررشتہ قائم نہ تھا۔ ۱۹۰۹ء میں ہنگولی میں ایک اسٹڈ فارم چھوٹے پیمانہ پر بطور آزمائش قائم ہوا۔ یہ اسٹڈ فارم اب جدید ترین طریقہ کے مطابق چلایا جارہا ہے۔

۱۹۲۰ء میں تمام مملکت میں بہائم شماری کا کام آغاز کیا گیا۔ رنڈرپسٹ جیسے امراض کے علاج اور اس کی روک تھام کے لئے ۱۹۲۴ء میں پچاس ہزار روپیے کی رقم منظور کی گئی۔ اس سال اضلاع میں ایک خاص رجسٹر مرتب کیا گیا۔ تاکہ اسمیں مویشیوں کی ہلاکت کا اندراج ہوا کرے۔ سررشتہ عہدہ داران دیہی کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ کس بیماری سے کتنے مویشی ہلاک ہوگئے۔ اضلاع میں نمائش کا انعقاد عمل میں آنے لگا اور انعامات دیئے جاتے ہیں تاکہ اچھی نسل کے مویشیوں کی پرورش کی ترغیب ہو

۱۹۲۰ء کی بہائم شماری کے مطابق مملکت آصفیہ میں مویشیوں کی تعداد ایک کروڑ ۲۵ لاکھ تھی۔ فی مربع میل ان کی تعداد (۱۵۱) ہے اور ایک سو ایکڑ کے زرعی رقبہ میں ان کی تعداد (۲۳) ہے

۱۹۴۰ء میں حکومت نے مملکت حیدرآباد میں مرغیوں کی بیماریوں کی تحقیق کے لئے ایک اسکیم منظور کی۔ اس کے نصف اخراجات امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کے ذمہ ہونگے اور بقیہ نصف اخراجات سررشتہ علاج حیوانات اور سررشتہ زراعت علی السویہ طور پر برداشت کریں گے۔

دیہی صنعتیں۔ دوسرے کاروبار کی طرح زراعت میں تنظیم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ حالت موجودہ ہندوستان میں داخلی تنظیم (مثلاً معاشی نقطۂ نظر سے محدود قطعات اراضی مستقل اصلاح و ترقی اور ذیلی صنعتیں) اور خارجی تنظیم (مثلاً مارکٹنگ) بہت خراب حالت میں ہے ہندوستان میں ذیلی صنعتوں کے نقدان نے چھوٹے کاشتکاروں کی معاشی حالت کو

بہت پست کر دیا ہے۔ ان کی موجودگی میں کاشتکار اپنی محنت کو پورے سال پر مساوی طریقہ پر پھیلائے رکھنے اور اپنی معاشی حیثیت و حالت درست رکھنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ زرعی پیشہ کی موسمی خصوصیات کی وجہ سے موجودہ زمانہ میں دیہی محنت ضائع ہوتی ہے۔ سرد بازاری کے موسم میں کاشتکار عملاً بیکار رہتا ہے۔ جیسا کہ مسٹر ڈارلنگ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ "ایک چھوٹے کاشتکار کے قرضدار نہ ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ کفایت شعاری اور تندہی کے ساتھ زندگی بسر کرے اور اپنی فرصت کے اوقات میں کوئی دوسرا کام دھندا کرتا رہے۔ جیسے کہ جاپان، فرانس، جرمنی اور اٹلی میں ہوتا ہے۔ شیر خانہ، افزائش مویشی خاص ذیلی پیشے ہیں۔ حسب ذیل دیہی صنعتیں ایسی ہیں کہ جن کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مرغبانی، میووں کی کاشت، تجارتی باغبانی، گڑ سازی۔ ہاتھ سے اناج چھوڑنا، ریشم کے کیڑوں کی پرورش، مگس پروری، دباغت، اوپلہ سازی، کھلونا سازی، بانس کی صنعت اور بید بافی، رسی سازی، دستی کاغذ سازی، بیڑی سازی، کمہار کا کام، چوڑی سازی وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام صنعتیں ہندوستان کے ہر مقام کیلئے مفید نہیں ہو سکتیں ذیلی صنعت کے مناسب انتخاب کے لئے جغرافیائی تحقیق کی ضرورت ہے۔

دستی کتائی کی دیہی صنعت پر ان دنوں بہت توجہ کی جا رہی ہے کیونکہ گاندھی جی کی وجہ سے چرخہ مرکز توجہ بنا ہوا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ دستی کتائی بہت سادہ اور آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے اس پر جب چاہے کام کیا جا سکتا ہے۔ جب چاہیں چھوڑ سکتے ہیں تاکہ زراعت میں اس سے کچھ ہرج نہ ہو۔ چرخہ کے خلاف میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ کھدر کارخانہ کے بنے ہوئے ملائم اور جاذب نظر ارزاں کپڑے کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بہر حال جب تک کاشتکار کو دوسرے منفعت بخش ذیلی صنعت کا بدل نہ ہو۔ دستی کتائی ہی اس کے موازنہ کو سالانہ متوازن کرتی رہے گی لیکن مشین کا مقابلہ چرخہ کب تک کر سکیگا۔ یا مقابلہ کر بھی سکتا ہے یا نہیں۔ بہت غور طلب مسئلہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال کہ اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں مقامی ضروریات اور برآمد کے لئے زندگی پیداوار کی تیاری لینے۔ روئی اوٹنے، ناریل چھیلنے، بھوسہ نکالنے

روغن برآری اور چاول کے کارخانے قائم کئے جائیں لیکن اس کے باوجود مشین کا مقابلہ بہرحالت میں پیش آئیگا اور قیمتوں میں جو تفاوت رہے گا۔ اس کا حل دریافت طلب ہے۔

زرعی پیداوار کی فروخت۔ زراعتی خارجی تنظیم کا بڑا مسئلہ زرعی پیداوار کی فروخت کا ہے تاکہ کاشتکار کو زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ فروخت پیداوار کے موجودہ طریقے میں بہت سے نقائص پائے جاتے ہیں۔ ہندوستانی کاشتکار کا انحصار عموماً ساہوکار پر ہوتا ہے اور کاشتکار کی فصل اکثر پیشگی رہن ہو جاتی ہے۔ اس کے سوا صدہا منظم پیشہ ور تاجر اور درمیانی اشخاص کاشتکار کی محنت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خواندگی کا ادنیٰ معیار باضابطہ منڈیوں اور کاشتکاروں میں اتحاد عمل کی کمی اوزان اور پیمانوں کی بے قاعدگی پیداوار کو ذخیرہ کرنے کی ناکافی سہولتیں اور دیہات میں ذرائع آمدورفت کے ناکافی انتظام یہ سب کاشتکاروں کی دوسری رکاوٹیں ہیں۔ سرمایہ کی کمی اور سرکاری زرلگان کی نقد ادائیگی کیوجہ سے کاشتکار کو اپنی پیداوار کم قیمت سے فروخت کر دینی پڑتی ہے۔ اور اس طرح اس کو واجبی قیمت نہیں ملتی۔ منڈیوں میں دلالوں کے ذریعہ فروخت پیداوار کا طریقہ بھی نقصان رساں ہے۔ بڑھیا کمیشن کے علاوہ دیگر غیر قانونی مصارف بھی ہیں۔ جوایک مزور تمن فروشندے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

غرض یہ ظاہر ہے کہ دیہی خوشحالی اور اصلاح کے لئے ایک منظم فروخت پیداوار کے نظام کی ضرورت ہے۔ اصلاح کی حسب ذیل دو صورتیں مناسب ہونگی۔

(۱) امداد باہمی کے ذریعہ فروخت کا انتظام (۲) باضابطہ منڈیوں کا قیام۔

(۱) انجمن ہائے امداد باہمی۔ پیداوار فروخت کرنے کی انجمنیں خاص کر گجرات اور کرناٹک میں کپاس کی فروخت کے لئے کسی قدر ترقی یافتہ حالت میں ہیں۔ پنجاب میں اور صوبہ متحدہ میں گیہوں کی فروخت کے لئے امداد باہمی کی دکانیں قائم ہیں۔ بنگال میں جوٹ کی فروخت کے لئے انجمن قائم ہے۔ فروخت پیداوار کے لئے انجمن ہائے امداد باہمی کے قیام سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض درمیانی اشخاص اور ان کے بڑھیا کمیشن کے

اخراجات عائد نہیں ہوتے ۔ صحیح اوزان اور پیمانے کا استعمال ہوتا ہے ۔ پیداوار کی ٹھیک درجہ بندی ہوتی ہے اور اچھی قیمت وصول ہوتی ہے ۔ پیداوار پر پیشگی رقوم بھی ملتی ہیں۔ تحریک فروخت پیداوار کی ترقی بہت محدود رہی ہے ۔ جس کے اصلی وجوہ انتظامی قابلیت کی کمی اراکین پر انجمن کا عدم اقتدار اور رقمی گنجائش کی کمی ہے ۔

باضابطہ منڈیاں ۔ صوبہ بمبئی کے چند اضلاع میں بمبئی کاٹن مارکٹ ایکٹ بابتہ ۱۹۲۷ء کے تحت باضابطہ منڈیاں قائم ہوئیں یہ منڈیاں مدراس میں ۱۹۳۳ء میں صوبہ متوسط میں ۱۹۳۵ء میں صوبۂ سرحدی اور پنجاب میں ۱۹۳۹ء میں قائم ہوئیں ۔ ان سے فروخت پیداوار کی تنظیم کی جاتی ہے یہاں خرید و فروخت باضابطہ قواعد کے تحت ہوتی ہے ۔ ایک مارکٹ کمیٹی قائم کی جاتی ہے جسمیں پیداکنندگان اور تاجروں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں ۔ اوزان اور پیمانے کے معین کرنے کیطرف بھی زیادہ توجہ کی جارہی ہے ۔ رسوم و رواج اور قدامت پرستی کی وجہ سے اس میں اصلاح بہت تدریجی طور سے ہو رہی ہے ۔

حکومت ہند نے زرعی پیداوار کی فروخت کی جانب بہت توجہ کی ہے ۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں مسٹر اے ، ایم لیونگ اسٹون کا تقرر مارکٹنگ کے ماہر کی حیثیت میں امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسیرچ کے اسٹاف کے ساتھ کیا گیا ۔ زرعی کمیشن (۱۹۲۸ء) کی سفارش کی بموجب مارکٹنگ کے ایک مرکزی دفتر کا عملہ اور صوبہ داری مارکٹنگ آفیسر بھی مقرر کئے گئے ہیں ۔ یہ جدید تنظیم مختلف صوبوں میں خاص فصول سے متعلق مارکٹنگ کی تحقیقات میں مصروف ہے ۔ تاکہ آئندہ کے لئے ترقی کی ایک عام بنیاد دریافت کی جائے ، گیہوں ، السی ، تنباکو ، انڈوں ، کافی ، آلو ، انگور ، دودھ ، مونگ پھلی کی مارکٹنگ سے متعلق جامع رپورٹیں شایع ہوچکی ہیں ۔ زرعی پیداوار سے متعلق گریڈنگ اور مارکٹنگ ایکٹ بابتہ ۱۹۳۷ء منظور ہوچکا ہے ۔ جس سے کاشتکاروں کو بیش بہا فوائد حاصل ہونگے اور اپنی پیداوار کی اچھی قیمت ملے گی ۱۹۴۲ء کے ختم پر ۲۳۶ مرکزوں میں مقررہ زرعی پیداوار کی درجہ بندی کا کام کیا گیا ۔ آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ مارکٹ کی خبریں سنانے کا بھی انتظام ہوچکا ہے ۔

مملکت آصفیہ میں زرعی پیداوار کی فروخت - زرعی مارکٹوں کا قانون نشان (۲) بابتہ سنہ ۱۳۳۹ف کے بموجب سنہ ۱۹۳۱ء میں پانچ باضابطہ منڈیوں کا قیام، نانڈیڑ، سیلو، جالنہ عمری اور لاتور میں عمل میں آیا۔ برطانوی ہند کے مماثل قوانین کے مقابلہ میں قانون زراعتی مارکٹ حیدرآباد کا اطلاق روئی کے علاوہ دیگر زرعی پیداوار پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے اس خصوص میں سرکار عالی نے آگے قدم بڑھایا۔ قانون مذکور کا زرعی پیداوار پر اطلاق ہونے کی وجہ سے مارکٹوں میں مختلف دشواریاں پیش آتی ہیں مگر ان دشواریوں کا زیادہ تر دفعیہ ہوتا رہا۔ بائع و مشتری و نیز عام رعایا کو قانون مذکور کے مفید نتائج کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس قانون کا نفاذ سنہ ۱۹۳۷ء میں مزید بارہ مقامات پر عمل میں لایا گیا۔ سنہ ۱۹۴۱،۴۲ء میں ان کی تعداد ۲۲ تھی اس قانون کے لحاظ سے کمیشن (آڑت) کی انتہائی مقدار، ناپ اور دوسرے اخراجات کا تعین کر دیا گیا ہے۔ زرعی پیداوار میں چالیس اقسام کے اشیا و شامل ہیں اور ان کی فروخت باضابطہ منڈیوں کی نگرانی میں کی جاتی ہے۔ باضابطہ منڈیوں میں کام کرنے والے مثلاً، خریدار، اڑتیا، دلال، ناپنے اور تولنے والے تمام لائسنس یافتہ ہوتے ہیں اور ان کے جھگڑے ثالثی کے ذریعہ طے پاتے ہیں۔

باضابطہ منڈیوں کے قیام سے بہت سے فوائد حاصل ہو رہے ہیں بازار کے صحیح حالات بروقت معلوم ہو رہے ہیں۔ اوزان اور پیمانے معین ہو گئے ہیں۔ عثمانیہ سکہ کا رواج بڑھ رہا ہے۔ کاشتکاروں سے مذہبی یا خیراتی نام سے کوئی حصہ پیداوار یا قیمت وصول کرنا موقوف ہو چکا ہے۔

مملکت حیدرآباد امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کے ساتھ زرعی پیداواروں کی فروخت کے سروے کے متعلق باہمی تعاون کر رہی ہے۔ اہم فصول مثلاً، چاول، گیہوں، مونگ پھلی، میووں کے علاوہ، دودھ، گھی، چمڑے اور کھالوں کے سروے کی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں چنے، مکائی، کاجو اور لاک کی مارکٹنگ سروے کا کام جاری رہا۔ انڈوں اور چاول کی درجہ بندی کا کام آغاز کیا گیا۔

دیہی قرضداری

دیہی قرضداری کا تخمینہ۔ ہندوستان میں دیہی معیشت کا ایک اہم مسئلہ دیہی قرضداری کا بار ہے۔ سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اس کمیٹی نے برطانوی ہند کے صوبہ جات میں جملہ زرعی قرضداری کا اندازہ تقریباً "نو سو" (۹۰۰) کروڑ روپے کیا تھا صوبہ جات کے اعداد حسب ذیل ہیں۔

بمبئی (بشمول سندھ) ۸۱ کروڑ روپے مدراس ۱۵۰ کروڑ روپے، بنگال ۱۰۰ کروڑ روپے صوبہ متحدہ ۱۲۴ کروڑ روپے، پنجاب ۱۳۵ کروڑ روپے صوبہ متوسط و برار ۳۶½ کروڑ روپے بہار و اڑیسہ ۱۵۵ کروڑ روپے آسام ۲۲ کروڑ روپے مرکزی حکومت کے زیر اقتدار رقبے ۱۸ کروڑ روپے۔ کورگ ۵۵ لاکھ روپے۔

ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی چھوٹے کاشتکاروں کو قرضہ لینا پڑتا ہے ہندوستانی کاشتکار برطانوی حکومت سے قبل بھی قرضدار تھا۔ لیکن خاصکر حالیہ دور میں دیہی قرضہ میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ قرضہ کی مقدار موجودہ زمانہ میں ۱۲۰۰ کروڑ ہے قرضہ کی کثیر مقدار سے کوئی اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن چونکہ یہ قرضے زیادہ تر غیر پیدا آور اغراض کے لئے اور بہت بڑھیا شرح سود سے لئے گئے ہیں اس لئے قرضہ کی کثیر مقدار اندیشناک خیال کیجاتی ہے

قرضداری کے اسباب۔ لوگوں کے انتہائی افلاس کے قطع نظر دیہی قرضداری کے حسب ذیل اصلی وجوہ ہیں۔

(۱) زمین پر آبادی کا انتہائی بار اور تقسیم و انتشار اراضی آبادی کا اضافہ اور دیہات میں خاص کر آبادی زیادہ تر زرعی پیشہ اختیار کرلینے کی وجہ سے زمین پر بہت بار عائد ہو چکا ہے۔ مکمل اور مفید کاشتکاری کیلئے درحقیقت جس قدر زراعت پیشہ افراد کی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگوں کی زندگی کا انحصار زراعت پر ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ اراضی کا کثیر حصہ

تقسیم در تقسیم اور انتشار اراضی کی وجہ غیر معاشی ہے ۔ اور بہترین موسمی حالات میں بھی بہت کم آمدنی ہوتی ہے ۔ گھریلو صنعتوں کے زوال اور دوسرے ذیلی پیشوں کے فقدان کی وجہ سے بھی کاشتکار کی معاشی حالت ابتر ہوگئی ہے ۔

(۲) فصل کی غیر یقینی حالت بمبئی، دکن جیسے بارش کے غیر یقینی خطوں میں برشکالی زمانہ میں زراعت کرنا گویا ایک جوا ہے ۔ عام طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پانچ سال کے زراعتی دور میں ایک سال اچھا، ایک سال خراب اور تین سال متوسط ہوتے ہیں ۔ صرف اچھے سالوں میں کسان قرضدار نہیں ہوتا ۔

(۳) قحط اور رنڈرپیسٹ جیسے امراض سے مویشی ہلاک ہوجاتے ہیں ۔ اس کی وجہ سے بھی کاشتکار کی معاشی تکالیف میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ اور مویشی کی خریدی کے لئے اکثر قرض لینا پڑتا ہے ۔

(۴) مقدمہ بازی سے رغبت اور فضول خرچی اور اسراف قرضداری کے اسباب بیان کئے جاتے ہیں ۔ ہندوستانی کسان عام طور پر کفایت شعار ہوتا ہے مگر بعض موقعوں مثلاً موت اور شادی کے رسومات پر اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہے ۔ اس کی بڑی وجہ رسم ورواج اور تعلیم سے غفلت ہے یہ صاف ظاہر ہے کہ پہلے دوسرے اور تیسرے سبب کی وجہ سے کاشتکار زیادہ قرضدار ہوتا ہے ۔

(۵) موروثی قرضے جو باپ سے بیٹے پر منتقل ہوتے ہیں موجودہ قرضداری کا ایک اہم سبب خیال کئے جاتے ہیں ۔ "صدہا لوگ قرضداری کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں ۔ قرضدار رہتے ہیں ۔ اور اپنے ورثا پر قرضہ کا بار چھوڑ کر مرجاتے ہیں"۔

(۶) عصری ترقیات ۔ مسٹر دارلنگ کہتے ہیں کہ "خوشحالی بھی قرضہ کا ایسا ہی سبب ہے ۔ جیسا کہ فصل کی غیر یقینی حالت"۔ ہندوستان میں امن وامان کا قیام شہروں میں اضافے اور ہندوستانی پیداوار کے لئے دنیا کے بازار کھل جانے کی وجہ ساہوکار سے قرضہ حاصل کرنے میں زمین قابل ضمانت ہوگئی ہے ۔ جس کی وجہ غیر تعلیم یافتہ کسان کو قرضہ حاصل کرنے کی خواہ مخواہ ترغیب ہوتی ہے ۔

(۷) ساہوکارانہ دست درازی ۔ برطانوی عدالتوں کے قائم ہونے اور ان کے ضوابط نے ساہوکار کا

کو بہت سہولتیں بہم پہونچائیں اور دیہات کے باشندوں کی اجتماعی قوت اثر میں انحطاط پیدا ہوجانے کی وجہ سے ساہوکاروں پر دیہاتی معاشرہ کا اخلاقی دباؤ کم ہوگیا۔ لامحالہ ساہوکاروں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ کاشتکاروں کی حالت کمزور ہوگئی۔ بڑھیا شرح سود اور رباخواری کی وجہ سے رعیت کو لوٹنے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اور ان کے قبضہ سے بہت سی زمینات نکل گئیں۔ ساہوکار بڑھیا شرح سود جو قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اکثر اپنی رقم کے ضائع ہوجانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

(۸) مالگذاری کی پالیسی۔ بقول۔ آر۔ سی۔ دت اضافۂ مالگذاری اور اس کی وصولی میں تشدد کی وجہ سے بھی قرضداری میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اصول مالگذاری کو زیادہ لچکدار بنانے کی ضرورت ہے تاکہ مصیبت کے وقت خواہ وہ قلت بارش کا سبب ہو یا قیمتوں میں تخفیف کا فوری التوار یا معافی منظور کی جاسکے۔

مملکت آصفیہ میں دیہی قرضداری کا تخمینہ اور تدابیر

کاشتکاروں کی مالی حالت کی اصلاح کی طرف حکومت آصفیہ بھی متوجہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کاشتکاروں کی مالی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے چند خاص اضلاع میں جو تحقیقات کرائی گئی ہیں ان کا حال مسٹر اینگار کی چار ضخیم جلدوں سے واضح ہوسکتا ہے۔ ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کس حد تک پھیلی ہوئی ہے اس کی تحقیق مسٹر بھروچہ نے بھی کی۔ مملکت کے (۱۰۴) دیوانی دیہات میں تحقیقات عمل میں لائی گئی ہر تعلقہ کے دیہات کو مالگذاری کی اہمیت اور آبادی کے لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کرکے ہر تعلقہ سے تین نمونوں کے دیہات کا انتخاب کیا گیا جو نتائج اس تحقیقات سے برآمد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ ممالک محروسہ کی کل زرعی آبادی کی زرعی قرضداری کی مجموعی مقدار تقریباً ۶۴ ½ کروڑ روپے ہے۔ اور یہ کہ اوسط شرح سود اٹھارہ فیصد ہے اور اراضی تیز رفتاری سے کاشتکاروں کے ہاتھ سے نکل کر ساہوکاروں کے ہاتھوں میں چلی جارہی ہے۔ تحقیقات کی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگرچہ زرعی قرضے کی مقدار

زیادہ ہے لیکن کاشتکار دیوالیہ نہیں ہے اور اپنی اراضی کی زاید پیداوار سے ادائی کرسکتا ہے بشرطیکہ مناسب امدادی تدابیر اختیار کی جائیں کیونکہ زرعی زمینات کی مالیت موجودہ تشخیص مالگذاری سے ۲۶ گنا زیادہ بتائی جاتی ہے۔ کاشتکاروں کی امداد کے لئے جو تدابیر پیش کی گئیں وہ یہ ہیں۔ انتقال اراضی کی روک تھام، سمجھوتے سے قرضوں کا تصفیہ، قرضوں کی ادائی کے لئے زمین گروی بنکوں کا قیام، امداد باہمی کے اصول پر فروخت پیداوار کا بندوبست، قانون کے ذریعہ ساہوکاری کی نگرانی سارے ممالک محروسہ میں معیاری اوزان و پیمانوں کا رواج، دیہی پنچایتوں کا قیام اور زرعی مقبوضات کا استحکام و حفاظت۔ ان سفارشوں پر جو عمل کیا گیا اس کو آگے چلکر بیان کیا جائیگا۔

قرضداری کے متعلق حکومت ہند کی پالیسی۔ دکن کے بلووں کی کمیشن بابتہ ۱۸۷۵ء کے بعد دیہی قرضداری کے مسئلہ کی نزاکت نے عوام کی توجہ کو منعطف کیا۔ حکومت نے بھی اس مسئلہ کے حل کرنے میں وقت ضرورت مختلف تدابیر اختیار کیں۔ سب سے پہلے ضابطۂ دیوانی میں بعض تبدیلیاں کی گئیں۔ آلات و اوزار اور مویشی ضبطی سے مستثنیٰ کرائے گئے۔ قانون امداد کاشتکاران دکن بابتہ ۱۸۷۹ء کے تحت عدالتوں کو قرضدار کاشتکار اور قرضخواہ کے مابین معاہدہ اور اس کے پس منظر کی تحقیقات، کاشتکار کے ساتھ رعایت کے پیش نظر شرح سود میں کمی کے ذریعہ دستاویز معاہدہ کی تبدیلی اور اگر ضرورت ہو تو اراضی کے تحفظ کا اختیار حاصل ہوا یہ قانون غیر موثر ثابت ہوا اور کسی حد تک ان سہولتوں سے ناجائز فائدہ حاصل کیا جانے لگا۔ قانون ربا ۱۹۱۸ء میں ترمیم کے بعد از سر نو مرتب و منظور ہوا، جس کے ذریعہ قابل وصول سود کی انتہائی مقدار معین کی گئی۔ زرعی کمیشن نے قرضوں کے قواعد اور بعض صوبہ واری تحقیقاتی مجالس نے ساہوکاروں کو اجازت نامہ جاری کرنے کی سفارش کی ہے۔ پنجاب ریگولیشن آف اکونٹس ایکٹ بابتہ سنہ ۱۹۳۰ء کے ذریعہ ساہوکاروں کے لئے لازمی قرار دیا گیا کہ باقاعدہ حساب کتاب رکھیں اور ہر ایک قرضدار کو اس کے حساب کی ایک فرد دی جائے۔ اکثر صوبوں میں کانگریس کی وزارتوں نے قرضہ کے کاروبار کے لئے قوانین نافذ کئے اور بعض صوبوں میں ساہوکاروں کے لئے

اجازت نامہ کا حصول اور ان کی رجسٹری لازمی قرار دی گئی۔ دیہاتی قرضہ کا زیادہ امید افزا حل رضاکارانہ اساس پر قرضوں کا باہمی سمجھوتہ ہے جس کو بنک کاری کی مرکزی تحقیقاتی مجلس نے تجویز کیا۔ اس طریقہ کو اختیار کرنا اس وجہ سے بہت ضروری ہے کہ پچھلے قرضوں کا بار بہت بڑھ گیا ہے۔ ساہوکار بھی ثالثی کے ذریعہ قرضوں کا سمجھوتہ کر لینے پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔ صوبہ متوسط پنجاب، بنگال، مدراس، صوبہ متحدہ اور بعض ہندوستانی ریاستوں مثلاً بھاؤنگر میں اس قسم کی کوششیں جاری ہیں۔ شرح قرضہ کا جبری تعین بعض صوبوں میں ضروری خیال کیا گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں مدراس میں یہ طریقہ بذریعہ قانون نافذ کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں بمبئی میں بھی یہ قانون نافذ کیا گیا۔ جس کے ذریعہ ادائی قرضہ کی مجالس قائم کرنا پیش نظر ہے تاکہ قرضوں کا باہمی تصفیہ ہو سکے۔ مدعا یہ ہے کہ جبری طور سے لین دار کی حیثیت کے لحاظ سے قرضہ مقرر کیا جائے۔

بعض صوبوں مثلاً پنجاب میں قانون انتقال اراضی کا خیال بھی پیدا ہوا تاکہ انتقال اراضی پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ بہرحال اس قانون سے دیہی ساکھ پر بالعموم مخالف اثر مترتب ہوا ہے۔ اور ایسے ساہوکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جو کاشتکاروں سے ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔

قانون قرضہ برائے اصلاح اراضی ۱۸۸۳ء اور قانون قرضہ کاشتکاران ۱۸۸۴ء کے ذریعہ حکومت کاشتکاروں کو تقاوی قرضے عطا کرتی ہے۔ لیکن حکومتی قرضوں کا یہ طریقہ دفتر کی چکر اور قرضوں کی بازیافت میں سختی برتنے کے طریقے کے باعث مقبول نہیں ہوا۔ انجمن ہائے امداد باہمی اور زمین گردی بنکوں کے ذریعہ امداد باہمی کے اصول پر قرضوں کی فراہمی ان تمام طریقوں کے منجملہ جو حکومت نے دیہی قرضداری کے ارتفاع میں اختیار کئے ہیں۔ بہت امید افزا ثابت ہو رہے ہیں۔

مملکت آصفیہ میں زرعی قرضداری کے ارتفاع کی تدابیر

زرعی قرضہ کو قابو میں رکھنے کے لئے قانون انتقال اراضی، قانون مصالحت قرضہ اور

قانون ساہوکارہ کاشت ۱۹۳۷ء میں نفاذ عمل میں آیا۔ ساہوکاروں نے جو ان تدابیر کے متعلق شروع ہی سے معاندانہ روش رکھتے ہیں بڑی حد تک قرضہ دینا موقوف کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکاروں کو نئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اوران مشکلات کا ازالہ ایک حد تک حکومت کے خصوصی قرضوں سے ہوا اور یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ قرضوں میں کچھ نہ کچھ کمی ہوگئی ہے۔ جو ممکن ہے آگے چل کر کاشتکاروں کے حق میں مفید ثابت ہو، اس سے کاشتکاروں میں کفایت شعاری، خود اعتمادی اور آزادی کی اُمنگ پیدا ہوجائے گی۔ ایک بات جو نظر انداز نہیں کی جاسکتی یہ ہے کہ قرضہ نہ ملنے کی وجہ سے گو مشکلات ضرور پیش آئیں لیکن کوئی اراضی بغیر کاشت کے نہیں چھوڑی گئی' اور ثابت ہوگیا کہ کاشتکار اپنے انتظامات بغیر ساہوکاروں کی مدد کے عمل میں لاسکتا ہے۔

۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران میں ۲۶ مجالس مصالحت قرضہ قائم کی گئی تھیں۔ لیکن ۱۹۴۱-۴۲ء میں مختلف تعلقوں میں مصالحتی مجالس قرضہ کی تعداد ۱۶ تھی۔

۱۹۴۱-۴۲ء میں جملہ ۱۰۶۶ مقدمات جو ۱۰ لاکھ ۳۹ ہزار روپے کی مالیت کے تھے بہ غرض تصفیہ مجالس میں پیش ہوئے اور مجموعی طور پر ۴۰۸ مقدمات کا تصفیہ کیا گیا۔ جو تین لاکھ ۸۱ ہزار روپے کے قرض سے متعلق تھے' ان کا دو لاکھ ۲۸ ہزار میں تصفیہ کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اضافہ نرخ ہائے اشیاء اور نتیجتہً زراعت پیشہ کی مالی بہتری نے بڑی حد تک مجالس کے کام کو متاثر کیا۔ تاہم مجالس کی کارکردگی کے نتائج معمولی اور مایوس کن ہیں۔ مقامی عہدہ داران مال کو چاہئیے کہ اپنے اپنے حدود اراضی میں مجالس مصالحت قرضہ کی امکانی حد تک تشہیر کرائیں۔ اور عہدہ داران عدالت کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ مقدمات کا عاجلانہ تصفیہ کریں۔ کیونکہ عاجلانہ تصفیہ ہی ان مجالس کو مقبول بنا سکتا ہے۔ فی الحال ان مجالس کے قیام کا مقصد پورا نہیں ہورہا ہے۔

قانون انتقال اراضی۔ دستور العمل انتقال اراضی کو ۱۹۳۵ء میں پہلی دفعہ اضلاع اورنگ آباد اور عثمان آباد میں تجربہ کے طور پر نافذ کیا گیا تھا لیکن ۱۹۴۲ء سے دستور العمل بنام "قانون امتناع انتقال

زرعی اراضی" نافذ کر دیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ کی غرض و غایت یہ ہے کہ بجز خاص صورتوں کے زرعی اراضیات غیر کاشتکار طبقوں کے قبضہ و تصرف میں جانے نہ پائیں اور ڈگریوں کی تعمیل میں انھیں فروخت نہ کیا جا سکے۔ نیز تحفظ کردہ طبقات کے اراکین کے درمیان قابل انتقال اراضی کی کم ترین اور زیادہ سے زیادہ مقدار کا تعین کر دیا گیا ہے، تا وقتیکہ اراضی کی منتقلی کے بعد منتقل کنندہ کے قبضہ میں ۵۰ روپے سالانہ کی آمدنی کی اراضی باقی نہ رہے اس طبقہ کے کسی منتقل کنندہ کو اس طبقہ کے کسی دوسرے رکن پر اراضی منتقل کرنے کا حق نہ ہوگا۔

قانون ساہوکاران۔ ۱۹۳۹ء میں قانون ساہوکاران منظور کیا گیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ جب تک ساہوکاری لین دین کی معقول نگرانی نہ کی جائے جو قوانین کاشتکاران کو زرعی مقروضیت سے نجات دینے کی غرض سے نافذ کئے گئے ہیں، بے نتیجہ ثابت ہونگے۔ چنانچہ قانون ساہوکاران کے اجراء کے ساتھ ساتھ ساہوکاروں کے ناموں کی رجسٹری بھی لازم قرار دی گئی اور ان پر لازم کیا گیا کہ سرکاری اجازت نامے حاصل کرنے کے علاوہ مقررہ اوقات پر حسابات کی تفصیل قرض لینے والوں کے سامنے پیش کیا کریں۔

ہندوستان میں تحریک امداد باہمی

ہندوستان میں امداد باہمی کے ذریعہ دیہی قرضداری کے ارتفاع کی تجویز سب سے پہلے فریڈرک نکلسن نے پیش کی جو مدراس کے ایک سیویلین تھے۔ انھوں نے یورپ کے زرعی اور دوسرے بنکوں کے حالات کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ موصوف نے اپنی رپورٹ ۹۷-۱۸۹۵ء میں قرضہ کے لئے جرمنی کے ریفاسین انجمنوں کے اُصول پر امداد باہمی کے ادارے قائم کرنے کی پُرزور سفارش کی۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں امپیریل لیجسلیٹیو کونسل سے قانون انجمن ہائے امداد باہمی (برائے قرضہ) منظور ہوا۔ ابتدا میں اس قانون کی رو سے صرف قرضہ کی دیہی اور شہری انجمنیں قائم کی جاسکتی تھیں، اور غیر قرضہ نوعیت کی دوسری تمام انجمنیں اس قانون کے دائرہ سے باہر تھیں۔ دس یا اس سے زیادہ اشخاص قرضہ کی انجمن قائم کرسکتے تھے، بشرطیکہ سب ارکان ایک ہی گاؤں یا ایک ہی ذات یا ایک ہی فرقہ یا ایک ہی شہر سے تعلق رکھتے ہوں، دیہی انجمنوں کی ذمہ داری غیر محدود رکھی گئی لیکن شہری انجمنوں کی صورت میں ذمہ داری انجمنوں کے اختیار پر چھوڑ دی گئی۔ دیہی انجمنوں کی صورت میں تمام منافع اور شہری انجمنوں کی صورت میں چوتھائی منافع مد محفوظ میں جمع کرنے کی شرط عائد کی گئی۔ انجمن اپنا سرمایہ اراکین کے فیس داخلہ حصص، امانتوں اور بیرونی قرضوں کے ذریعہ فراہم کرتی تھیں۔ اور حاصل شدہ سرمایہ سے صرف اراکین کو قرضہ دیا جاسکتا تھا۔ تمام صوبوں میں انجمنوں کے معائنہ اور نگرانی کی غرض سے رجسٹرار مقرر کئے گئے حکومت نے اپنے لئے حسب ذیل چند خاص اختیارات محفوظ رکھے۔

(۱) لازمی معائنہ اور تنقیح حسابات (۲) اگر ضرورت محسوس ہو تو کسی انجمن کو برخاست کر دینے کا رجسٹرار کو اختیار، جس کا مرافعہ صوبہ واری حکومت کے پاس کیا جاسکتا تھا۔ (۳) قواعد سازی کا وسیع اختیار۔ اس قانون کے تحت رجسٹر ہونے والی انجمنوں کو حکومت نے ان کی ہمت افزائی کے لئے چند مراعات عطا کئے۔

مثلاً ان کو انکم ٹیکس فیس اسٹامپ اور فیس رجسٹریشن سے مستثنیٰ کیا گیا۔ انجمن کے قرضہ کو دوسرے قرضخواہوں پر ترجیح دی گئی۔ حکومت کی جانب سے نئی انجمنوں کو پہلے تین سال تک بغیر سود کے معین مقدار میں قرضہ عطا کیا جاتا تھا۔

اس تحریک کو ہر صوبہ میں ترقی حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں نیا قانون امداد باہمی منظور ہوا۔ نئے قانون کی رو سے ہر قسم کی انجمن ہائے خرید و فروخت، پیدائش دولت، بیمہ، تعمیر امکنہ وغیرہ کی تشکیل بھی قانون کے دائرہ میں شامل ہوگئی۔ اس قانون کی رو سے حسب ذیل مرکزی انجمنیں مسلمہ قرار دی گئیں :-

(۱) اتحادی انجمنیں جو باہمی نگرانی و تنقیح کے لئے بنیادی انجمنوں پر مشتمل ہوں۔

(۲) مرکزی بنک۔ بعض وقت انجمنیں اور بعض اوقات افراد اس کے ارکان ہوتے ہیں۔ تاکہ قرضہ کی نئی انجمنوں کو فراہمی سرمایہ میں مدد دیں۔

(۳) صوبہ داری بنک، جس کے ارکان افراد ہوتے ہیں (بعد میں انجمنوں کو بھی شریک کیا گیا) تاکہ تمام صوبے میں سرمایہ کی فراہمی میں مدد دی جائے۔

یہ کام عموماً مرکزی بنک کے توسط سے انجام دیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۲ء کے قانون سے تحریک امداد باہمی کو مزید ترقی ہوئی۔ پیداوار کی فروخت، مویشیوں کے بیمے، دودھ کی فراہمی، سوت ریشم اور کھاد کی خریدی آلات و اوزار اور معمولی ضروریات زندگی کی انجمنیں قائم ہوئیں اور ترقی کرنے لگیں۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں حکومت نے میک لگن کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ اس تحریک کے مالیاتی ذرائع کا جائزہ لیا جائے۔ مختلف صوبہ جات میں امداد باہمی کی مالیاتی تنظیم کے بارے میں کمیٹی نے مفید سفارشیں کیں۔ ۱۹۱۹ء کے دستوری اصلاحات کے بعد امداد باہمی کا کام صیغۂ منتقلہ کے طور پر صوبہ داری حکومتوں کے تفویض کردیا گیا۔ بمبئی میں ۱۹۲۵ء میں ایک علیحدہ قانون انجمن ہائے امداد باہمی منظور ہوا۔ بعد میں دوسرے صوبہ جات میں بھی عمل آوری ہونے لگی۔

بہر حال امداد باہمی کے اصل اصول سے ارکین کی ناواقفیت، غیر منظم انتظام، داخلی عدم نگرانی

ادائی رقوم میں عدم پابندی اور بڑی بڑی رقوم قرضہ کا بقایا رہ جانے کے نقائص کو دور کرنے کے لئے حکومت اور خود انجمنوں کو منظم کوشش کرنی چاہیئے۔

تحریک امداد باہمی کے متعلق اعداد و شمار۔ ہندوستان میں تحریک امداد باہمی کے متعلق اعداد ۱۹۴۰-۴۱ء حسب ذیل ہیں :-

اس سال انجمن ہائے امداد باہمی کی مجموعی تعداد ۱۲۳۲۵ تھی، ان میں زرعی انجمنیں ۱۲۳۹۷۶ اور غیر زرعی انجمنیں ۱۷۴۵۹ مرکزی انجمنیں ۶۱۱ بشمول صوبہ واری اور مرکزی بنک اور بنکنگ یونین) نگرانی و ضمانت کرنے والی انجمنوں کی تعداد ۴۶۶ تھی۔

۱۹۴۰-۴۱ء میں انجمنوں کی تعداد صوبہ جات میں حسب ذیل تھی :-

مدراس ۱۴۴۰۹ - بمبئی ۵۲۹۸ - سندھ ۱۳۲۹ - بنگال ۳۸۴۰۴ - بہار ۸۲۸۷ - اڑیسہ ۲۷۱۵ - صوبۂ متحدہ ۱۶۸۵۰ - صوبہ متوسط اور برار ۴۹۳۹ - آسام ۱۵۳۵ - شمال مغربی سرحدی صوبہ ۹۴۴ - دہلی ۳۹۶ - اجمیر میواڑ ۷۵۹ - کورگ ۳۰۹ - پنجاب ۲۶۰۶۰

بعض ہندوستانی ریاستوں میں بھی اس تحریک کو بہت فروغ ہوا ہے ۱۹۴۰-۴۱ء میں بنیادی انجمنوں کے اراکین کی تعداد ۴۰ لاکھ اور سرمایہ زیر استعمال ۱۰۹ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے تھا۔ اگرچہ کہ یہ اعداد حقیقی ترقی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ملک کی آبادی اور وسیع رقبہ کے لحاظ سے ترقی کی ابھی کافی گنجائش ہے۔

زرعی قرضہ کی بنیادی انجمن کا دستور اور کام۔ کل ہندوستان میں زرعی قرضہ کی بنیادی انجمنیں جملہ انجمنوں کی تعداد کے تقریباً ۹۰ فیصدی ہیں۔ ان کی تنظیم انتظام اور کام پر اجمالی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

ایک ہی گاؤں کے دس باشندے امداد باہمی کی انجمن قائم کرسکتے ہیں۔ اراکین کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے تاکہ انجمن پر کافی نگرانی قائم رہے۔ ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے اس کی وجہ سے انجمن کی ساکھ یا اس کا اعتماد بیرونی قرضداروں کی نظر میں بڑھ جاتا ہے۔ انتظام

کی نوعیت عمومی اور اعزازی اصول پر ہوتی ہے۔ جلسۂ عام میں تمام اراکین مجلس عاملہ کے اراکین کا انتخاب کرتے ہیں اور سالانہ تخمۂ وصول باقی بھی منظور کیا جاتا ہے۔ مجلس عاملہ انجمن کے انتظامی امور کی نگرانی کرتی اور نئے اراکین کی شرکت منظور کرتی ہے۔ معتمد تنخواہ یاب ہوا کرتا ہے۔ سرمایۂ زیر استعمال دو ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے: (۱) داخلی ذرائع جس میں فیس شرکت، اراکین کی امانتیں، حصص اور مد محفوظ شامل ہے۔ (۲) خارجی ذرائع، اس میں دوسری انجمنوں، حکومت اور مرکزی مالیاتی ایجنسیوں، جیسے مرکزی اور صوبہ واری امداد باہمی کے قرضے اور امانتیں شامل ہیں۔ ریزرو بنک آف انڈیا ایکٹ بابتہ ۱۹۳۴ء کے تحت امداد باہمی کے صوبہ واری بنکوں کو ریزرو بنک سے قلیل المیعاد قرضے (جس کی مدت تین ماہ سے زائد نہ ہو) مل سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں داخلی ذرائع خصوصاً اراکین کی امانتوں میں کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ خارجی سرمایہ کے ذرائع کو امداد باہمی کی مالیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرضے عموماً پیدا آور اغراض مثلاً خریدی تخم و مویشی، کھاد اور کاشتکار کی دوسری ضروریات جیسے لگان اور ادائی مالگذاری کی غرض سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ انجمنوں سے مستقل اصلاحات اور پچھلے قرضوں کی ادائی کے لئے طویل المیعاد قرضے نہیں دیئے جاتے۔ اس مقصد کے لئے مختلف صوبوں میں زمین گروی بنک قائم کئے جا رہے ہیں۔ غیر پیدا آور اغراض جیسے ادائی رسوم وغیرہ کے لئے قرضوں کی منظوری اصولاً ممکن نہیں۔ لیکن رعایا کو ساہوکاروں کے پنجے سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ قرضوں کی ادائی کا وقت مقرر کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اراکین فصل کی کٹائی کے بعد قرضے ادا کر سکیں۔ پابندی کے ساتھ ادائی لازمی ہے۔ التوا صرف خاص حالات کے تحت منظور کیا جاتا ہے۔

امداد باہمی کی اصلی ضمانت قرض گیرندہ کی ایمانداری اور اس کے عادات و اطوار ہیں۔ اسی کے ساتھ زمینات کی شکل میں مساوی ضمانت بھی قبول کی جاتی ہے۔ قرض گیرندہ کو عموماً اراکین کی ہی ضمانت فراہم کرنی پڑتی ہے۔

تمام اخراجات کی منہائی کے بعد منافع مد محفوظ میں جمع کر دیا جاتا ہے لیکن قانون ۱۹۱۲ء

کے تحت اگر حصص ہوں تو اس پر منافع تقسیم ہوسکتا ہے۔ خیرات اور تعلیم پر بھی کچھ رقم صرف کی جاسکتی ہے۔ انجمن اور اس کے اراکین کے جھگڑے ثالثی کے ذریعے طے پاتے ہیں، کسی انجمن کا انتظام خراب ہو تو رجسٹرار تحقیقات کے بعد اس کو مسدود کرسکتا ہے۔

تحریک امداد باہمی کے فوائد۔ تحریک امداد باہمی کے باعث ملک کو مادّی فوائد حاصل ہوئے ہیں، مثلاً کاشتکاروں اور دستکاروں کو آسان شرائط سے قرضے مل رہے ہیں اور سود کی ادائی میں کفایت ہوگئی ہے۔ اکثر دیہات میں ساہوکاروں کا اجارہ ختم ہوچکا ہے۔ امداد باہمی کے بنکوں کی ترقی سے رقم پس انداز کرنے کی عادت بڑھ رہی ہے۔ مختلف طرح سے زراعت کو بھی فوائد حاصل ہورہے ہیں۔ کسان کی متعدد احتیاجات کی تکمیل سے اس تحریک نے اس ملک کی زرعی تنظیم کو بڑی ترقی عطا کی ہے۔ اس نے سررشتۂ زراعت کو بہتر تخم، مویشی اور ترقی یافتہ آلات و اوزار کو مقبول عام بنانے میں بھی مدد دی ہے۔ مختلف قسم کی انجمنیں قرضہ دینے کے علاوہ پیداوار کی فروخت زرعی اور دیگر ضروریات کی خریدی اور فراہمی میں بھی مدد دیتی ہیں۔ ان امور سے ملک کی جدید زرعی تنظیم کی سرعت کے ساتھ بہتری کی توقع ہوسکتی ہے۔ بہر طور تحریک امداد باہمی نے کاشتکار کو بہتر کاشت، بہتر کاروبار اور بہتر زندگی کے وسائل کے حصول میں بڑی مدد دی ہے۔

غیر زرعی مقاصد کے لئے بھی انجمنیں قائم ہوئیں، مثلاً شہری بنک (جن کی تنظیم جرمنی کے شلزے ڈیلش بنکوں کے اُصول پر کی گئی) پارچہ بافوں اور دستکاروں کی انجمنیں، کارخانے کے مزدوروں اور تنخواہ یاب ملازمین کی انجمنیں، تعمیر اکنہ کی انجمنیں، اور انجمن ہائے صارفین مفید کام انجام دے رہے ہیں۔ لیکن ابھی ترقی اور وسعت کی بڑی گنجائش ہے۔ امداد باہمی کی انجمنیں گھریلو صنعتوں اور دستی پارچہ بافی کے لئے بھی بہت ممد و معاون ثابت ہورہی ہیں۔

امداد باہمی سے معاشی اور مادّی فوائد کے علاوہ ذہنی اور اخلاقی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ بقول مسٹر ڈارلنگ " امداد باہمی کی ایک اچھی انجمن میں مقدمہ بازی، فضول خرچی

نشہ اور قمار بازی کے بجائے سرگرمی، خود اعتمادی، راست بازی، تعلیم، ثالثی کے ذریعہ تصفیہ، کفایت شعاری، اپنی مدد آپ کرنے اور باہمی امداد جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ انجمن امداد باہمی حکومت خود اختیاری اور شہری فرائض کی تربیت گاہ خیال کی جا سکتی ہے۔

مملکت آصفیہ اور امداد باہمی کی تحریک۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ۱۹۱۲ء میں سررشتہ امداد باہمی کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں یہ تحریک تجربہ کے طور پر شروع کی گئی تھی۔ قانون امداد باہمی نشان ۲ کا نفاذ ۲۷-مہر ۱۳۲۳ف مطابق ۱۹۱۳ء میں عمل میں آیا۔ ابتدا میں تو اس تحریک کے تحت صرف بلدۂ حیدرآباد کے نواح کے دیہات میں کسانوں کو تقاوی تقسیم ہوا کی ۱۹۱۲ء میں اس امر کی پہلی منظم کوشش کی گئی کہ رلف آئزن قسم کے قرضہ جاتی امداد باہمی کی انجمنیں بنائی جائیں۔ ۱۹۱۴ء میں بلدۂ حیدرآباد میں ایک صدر بنک قائم ہوا۔ اس سال انجمنوں کی تعداد ۲۵ اراکین کی تعداد ۷۰۶ اور سرمایہ زیر استعمال ایک لاکھ ۶۸ ہزار روپے تھا۔ ۱۹۱۵ء میں ایک کمیٹی جو مسٹر گلانسی معین المہام فینانس، نواب عماد الملک اور مسٹر کنسٹنٹا چاری مشیر قانونی پر مشتمل تھی اس غرض سے بنائی گئی کہ وہ اس تحریک کے انتظام اور اس کی رہنمائی کے اصول مرتب کرے۔

مملکتی بنک۔ اس تحریک کو قوت دینے کے لئے مملکتی بنک قائم کیا گیا تا کہ وہ ان تمام انجمنوں کے لئے سرمایہ مہیا کرے جو ممالک محروسہ میں قائم ہوں۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اضلاع میں بھی بنک قائم ہوتے گئے تو انجمنوں سے اس کا براہ راست لین دین محدود ہو گیا چنانچہ ۱۳۳۱ف میں اس کے دستور اساسی میں تبدیلی ہو گئی، اور اسے صوبہ واری و بنک قرار دیا گیا جس کا تعلق براہ راست صرف مرکزی بنکوں سے رہ گیا وہ انجمنیں جو اس وقت تک اس بنک سے ملحق تھیں اضلاع کی بنکوں سے ملحق کر دی گئیں یہی وجہ ہے کہ اس کے اراکین کی تعداد ۵۴ اور ۲۶ مرکزی بنکوں اور دو سو انجمنوں پر مشتمل ہے۔ مملکتی بنک نے سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اس کا سرمایہ منظورہ دس لاکھ روپیہ، سرمایہ جاری شدہ پانچ لاکھ ۷۵ ہزار، سرمایہ ادا شدہ پانچ لاکھ ساٹھ ہزار اور محفوظات کی رقم دس لاکھ ۴۳ ہزار روپیہ ہے۔

مرکزی بنک۔ اب ممالک محروسہ کے تقریباً ہر ضلع میں ایک مرکزی بنک قائم ہے ۱۹۲۴ء تک تو یہ اصول تھا کہ ہر ضلع میں ایک صدر بنک ہو۔ لیکن انجمنوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ اور صدر بنکوں کے کاموں میں اضافہ ہونے کے باعث یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اضلاع کے علاوہ تعلقوں میں بھی مرکزی بنک قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ ان بنکوں کو گاؤں کی انجمنوں سے قریب تر ہونے کا موقع مل جائے گا۔ ۱۹۴۱ء-۴۲ء میں مرکزی بنکوں کی تعداد ۴۴ اراکین کی تعداد ۵۲۴۸ تھی اور ۷۰ لاکھ ۵ ہزار روپے کے مشغول سرمایہ سے کام ہو رہا تھا۔ اس میں سے تقریباً ایک تہائی بنکوں کا ذاتی سرمایہ ہے جس کے منجملہ ۱۷ لاکھ روپے محفوظات ہیں، اور ۱۲ لاکھ ۴۱ ہزار روپے حصص۔ ان اعداد کی اہمیت کا اندازہ اس وقت بخوبی ہو سکتا ہے جب یہ خیال کیا جائے کہ ۱۹۲۶ء تک مرکزی بنکوں کی مجموعی محفوظ رقم صرف ایک لاکھ روپے تھی۔

زرعی انجمنیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی امداد باہمی کی تحریک اس خاص مقصد کے تحت شروع کی گئی تھی کہ زراعت پیشہ باشندوں کی امداد کی جائے جو پشت ہا پشت سے مقروض ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس تحریک کے ابتدائی زمانہ میں بقیہ ہندوستان کی طرح یہاں بھی یہی غلطی کی گئی کہ گاؤں کی قرضہ دہندہ انجمنوں سے یہ غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی کہ کسان کے سارے ساہوکاری قرضہ ادا کرائے جائیں تاکہ وہ اپنی زندگی از سر نو شروع کرے۔ انجمنیں قرضہ دینے میں بہت فیاض تھیں لیکن جس وقت معاشی حالت بدلی اور زرعی پیداوار کے نرخ میں کمی ہو جانے کے باعث زراعت پیشہ طبقہ کی قوت ادائی میں بھی کمی واقع ہوئی تو معلوم ہوا کہ قلیل مدت کے لئے حاصل کیا ہوا روپیہ طویل مدت کے لئے قرض دینا کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اب یہ رائے ہے کہ انجمن امداد باہمی کی رقموں سے صرف کسانوں کو فصلوں کے موقع پر قرض دینا چاہیئے۔ چنانچہ اب قرض دینے کے وقت کسان کی قوت ادائی پر ضرور نگاہ رکھی جاتی ہے۔

۱۹۱۳ء میں انجمن ہائے زرعی قرضہ کی تعداد ۴۲۔ اراکین کی تعداد ۵۳۱۱ سرمایہ

زیر استعمال ۳۹-۶۰ تھا۔ (۴۲-۱۹۴۱ء میں انجمنوں کی تعداد ۴۰۰۴، اراکین کی تعداد ۹۵-۲۷ سرمایہ زیر استعمال ۹۲ لاکھ ۵ ہزار روپے تھا۔ گویا ممالک محروسہ سرکار عالی کے اکیس ہزار دیہات میں سے ۳۵۹۶ دیہات میں قرضہ دینے والی انجمنیں موجود ہیں۔

مجموعی طور پر گذشتہ سالوں میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے بطور قرضہ دیا گیا، اس میں سے تقریباً ایک کروڑ روپے واپس ہو چکے ہیں۔ گذشتہ آٹھ سال کی معاشی کساد بازاری نے انجمنوں کی مالی حالت پر بہت تباہ کن اثر کیا تھا۔ اور اس کا مضر اثر انجمنوں پر بھی پڑا اور متعدد رعایتیں کرنی پڑیں

قرضہ دینے والی انجمنوں نے نہ صرف زراعت پیشہ افراد کو براہِ راست فائدہ پہنچایا بلکہ ان سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ دیہات میں شرح سود بہت گھٹ گئی ہے۔ جب ایک گاؤں میں انجمن امداد باہمی قائم کی جاتی ہے تو اس کے شرح سود کی کمی کے باعث مقامی ساہوکاروں کو مجبور ہو کر اپنی شرح سود گھٹانی پڑتی ہے۔

حکومت کو اب اس کا اعتراف ہو چلا ہے کہ دیہی قرضہ کا مسئلہ صرف قرضہ دینے والی انجمنوں کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ انجمن کاشت کے موسم میں ضروری مدد دیتی ہیں۔ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مختلف اُصول پر اب ایسے ادارے قائم کرنے چاہیئے جو زیادہ طویل مدت کے لئے قرضہ دے سکیں۔ اس مقصد کے تحت حکومت کے پیش نظر زمین گروی بنک کی اسکیم ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ اس قسم کے بنکوں کا ایک نظام جلد قائم ہو جائے گا۔

غیر زرعی انجمنیں۔ انجمن ہائے قرضہ زرعی کے علاوہ غیر زرعی انجمنیں بھی موجود ہیں۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں انجمنوں کی تعداد ۶۹۰، اراکین کی تعداد ۷۵۹۸۲، مشغول سرمایہ ۶۵ لاکھ ۴۷ ہزار روپے تھا۔ جس کے منجملہ ذاتی سرمایہ ۴۴ لاکھ ۱۴ ہزار روپے تھا۔

ان انجمنوں میں تنخواہ یاب ملازمین کی انجمنیں سب میں ممتاز ہیں۔ یہ انجمنیں سرکاری محکموں کے ملازمین کے لئے بڑی مفید ثابت ہوتی ہیں کیونکہ اس سے قبل اپنی ضروریات کے لیے انھیں مقامی

ساہوکاروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ مالی اعتبار سے امداد باہمی کی تحریک میں یہ انجمنیں سب سے
زیادہ خوشحال ہیں۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ان کی تعداد ۲۹۰، اراکین کی تعداد ۲۰ ہزار چار سو،
سرمایہ مشغولہ ۳۷ لاکھ ۲۷ ہزار روپے اور ذاتی سرمایہ ۳۰ لاکھ روپیہ تھا۔

شہری بنک۔ غیر زرعی انجمنوں کا ایک اور اُمید افزا پہلو شہری بنک ہیں۔ شہری بنک
سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں قائم کئے گئے تھے۔ اس وقت شہری بنکوں کی تعداد چار، اراکین
کی تعداد ۲۲۴ اور سرمایہ زیر استعمال ۶۳ ہزار روپے تھا۔

۴۲-۱۹۴۱ء میں ان بنکوں کی تعداد ۱۱۱، اراکین کی تعداد ۱۷ ہزار نو سو ۴۴، مشغول
سرمایہ ۱۴ لاکھ روپے اور مملوکہ سرمایہ چھ لاکھ روپے تھا۔

صناعوں کی انجمنیں۔ دستی پارچہ بافی حیدرآباد کی ایک قدیم صنعت ہے۔
پارچہ باف عموماً اتنی اجرت پاتے ہیں کہ مشکل سے اپنی زندگی گذار سکیں۔ چنانچہ پارچہ بافوں کی
امداد باہمی کی انجمنیں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں پارچہ بافوں کی انجمنوں کی تعداد
۱۷، اراکین کی تعداد ۱۹۰۰، سرمایہ مشغولہ دو لاکھ روپے اور ذاتی سرمایہ صرف ایک لاکھ روپیہ تھا

دوسرے صناع، مثلاً صنعت بیدری کے کام کرنے والوں، کاغذ بنانے والوں، پیتل کا کام
کرنے والوں وغیرہ کی انجمنوں کی تعداد ۳۳، اراکین کی تعداد ۵۰۰، سرمایہ مشغولہ ۶۵ ہزار روپے اور
ذاتی سرمایہ ۳۷ ہزار روپے تھا۔

انجمن ہائے فروخت پیداوار۔ زرعی پیداوار کی فروخت کی جانب اب خاص توجہ
کی جارہی ہے، اور اس امر کا انتظام کیا گیا ہے کہ انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ بہتر تخم، کھاد اور آلات
زراعت مہیا کئے جائیں۔ اور اہم فصول مثلاً روئی، نیشکر اور روغنی تخم امداد باہمی کے اصول پر
فروخت ہوں، خاص خاص صورتوں میں کاشتکاروں کی رقمی امداد بھی کی جائے۔

سررشتۂ زراعت کے تعاون سے کیل، جالنہ، سیلو، اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی،
رائچور اور گلبرگہ میں کپاس کی فروخت کا انتظام کیا گیا ہے۔ جو نتائج برآمد ہوئے اُن سے واضح

ہوتا ہے کہ اگر کام کرنے والے مخلص اور ایماندار ہوں تو یہ انجمنیں کاشتکاروں کے لئے عام انجمن ہائے امداد باہمی سے زیادہ مفید کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

کپاس فروخت کرنے کی انجمنوں کی تعداد ۴۰-۱۹۳۹ء میں دس، اراکین کی تعداد ۱۰۱۹، مشغول سرمایہ ۸۰ ہزار روپیے اور ذاتی سرمایہ ۳۹ ہزار روپیے تھا۔

غلے کے بنک۔ غلے کے بنک دیہات میں کافی مقبولیت حاصل کر رہے ہیں، اور یہ توقع کی جاتی ہے، جب وہ ترقی یافتہ اجناس کی تقسیم کا کام اپنے ذمہ لیں گے۔ تو دیہی معیشت میں ان کو ایک اہم جگہ حاصل ہو جائے گی۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ان بنکوں کی تعداد ۲۲۴، اراکین کی تعداد ۱۱۸۴۷ تھی، حصص کے طور پر جو غلہ جمع کیا گیا، اُس کی مجموعی مقدار ۳ لاکھ ۷۵ ہزار سیر تھی۔ اراکین کو جو قرض دیا گیا، اُس پر ۸۰ ہزار چھ سو سیر کا نفع ہوا۔

صدر جمعیت امداد باہمی۔ ابتدائی دس سال میں جب انجمنوں کی تعداد کافی ہو گئی اور جب یہ انجمن مملکت کے مختلف اضلاع میں مختلف قسم کے کاروبار انجام دینے لگیں تو اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو منظم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں صدر جمعیت امداد باہمی قائم کی گئی۔ صدر جمعیت امداد باہمی سے الحاق شدہ انجمنوں کی تعداد ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۱۷۹۳ تھی۔ اِس جمعیت کے فرائض میں تبلیغ و اشاعت، تعلیم و نگرانی شامل ہے۔ ہر سال یہ جمعیت سر رشتۂ امداد باہمی کے عہدہ داروں اور امیدواروں کی تعلیم کے لئے بلدۂ حیدرآباد اور اضلاع میں تعلیمی جماعتیں قائم کرتی ہے۔ "گاؤں سدھار" ماہوار رسالہ اس کی جانب سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے تحت ایک مرکز ترقیاتِ دیہی پٹن چرو میں قائم ہے۔

امداد باہمی انشورنس سوسائٹی۔ مملکت میں ملکی بیمہ کمپنیوں کی کمی کے مدنظر ۱۹۳۷ء میں قانون امداد باہمی کے تحت انشورنس سوسائٹی کی رجسٹری کی گئی۔ ۴۲-۱۹۴۱ء بوجہ جنگ کاروبار بیمہ کو عام طور پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انجمن نے باوجود ان غیر مساعد حالات کے جو کاروبار کیا وہ ہمت افزا ہے۔ ۴۲-۱۹۴۱ء کے ختم پر جملہ رقم حصص ۳۹۶۸۷ روپیے رہی

اقساط بیمہ کی بابتہ ۲۹۱۴۵۳ روپے آمدنی ہوئی، لائف انشورنس فنڈ کی مقدار ۵۲۲۱۱۳ رہی۔ اس سال ۵۹۰۱ روپے کا خالص منافع برآمد ہوا۔ مدِ محفوظ کی رقم ۲۶۹۷ روپے ہے۔

انجمن ہائے تعمیر امکنہ۔ امداد باہمی کے خوشگوار نتایج کی نمایاں مثال محلہ ملے پلی (بلدہ حیدرآباد) کی وہ انجمن ہے جو سکونتی مکانات کی تعمیر کے لئے ۱۹۳۹ء میں قائم ہوئی۔ سررشتۂ امداد باہمی کے متعدد کارناموں میں اس اسکیم کی کامیاب تکمیل بھی شامل ہے۔ اس اسکیم کا منشاء یہ ہے کہ بلدۂ حیدرآباد میں کم تنخواہ یاب سرکاری ملازمین کے واسطے مکانات فراہم کئے جائیں۔ یہ انجمن اپنے اراکین کے سامنے بہت آسان شرائط پیش کرتی ہے جن کے تحت وہ اپنے ذاتی مکانات تعمیر کر سکتے ہیں۔ انجمن مذکور نے مجلس آرائش بلدہ سے ایک زمین حاصل کر کے جس کا رقبہ ۱۸ ہزار مربع گز ہے ۳۱ مکانات تعمیر کرائے ہیں۔

اس تجربہ کی کامیابی کی وجہ ایک اور انجمن کی بنا ڈالی گئی جس کا بھی یہی مقصد ہے۔ اس انجمن نے بھی ملے پلی میں ۲۵ ہزار مربع گز زمین حاصل کر لی ہے جس پر بتیس ۳۲ مکانات تعمیر ہو چکے ہیں۔

انجمن ہائے قرضۂ حسنہ امداد باہمی۔ حیدرآباد نے اکثر اہم اور عہد آفریں امور میں بر طانوی ہند کی رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ امداد باہمی کی انجمنوں میں بلا سودی کاروبار کا آغاز بھی حیدرآباد میں پہلے ہوا ہے۔ چند بلا سودی انجمنیں یہاں کامیابی سے چل رہی ہیں۔ ان میں نظامت بندوبست کی انجمن نمایاں ہے، جس کے اراکین کی تعداد ۷۷ اور سرمایہ زیر استعمال ۹۷ ہزار روپے ہے۔

تحریک امداد باہمی کے بعض اصلاحی تدابیر۔ امداد باہمی سے اخلاقی، تعلیمی اور خالص معاشی فوائد صرف پیمانۂ صغیر پر حاصل کئے گئے ہیں۔ انجمن ہائے امداد باہمی کے بعض نقائص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ادائی رقوم میں عدم پابندی، غیر منظم نگرانی اور بقایا وغیرہ بہت سی حالتوں میں اصلی اتحاد کم ہوتا ہے اور اکثر ارکان انجمن سے محض مالی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں ہندوستان

میں دیہی آبادی کی جہالت اور اس کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے امداد باہمی کی کامیابی میں بڑی دشواری ہے۔

ریزرو بینک آف انڈیا نے یہ سفارش کی ہے کہ طویل و قلیل قرضے علیحدہ علیحدہ انجمنیں دیا کریں۔ امداد باہمی کی انجمنیں اپنے ذخیرۂ محفوظ کو تقویت دیں۔ غیر پیداآور اغراض کے قرضوں کی تعداد میں کمی کی جائے، مرکزی صوبہ داری بینکوں اور قرضوں کی انجمنوں کی دوبارہ تنظیم کی جائے امداد باہمی کے عملہ کو امداد باہمی دیہی معاشیات اور بنک کاری کے عملی اور نظری اصولوں سے آگاہ ہونا چاہیے۔ سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں امداد باہمی کے نقائص کو دور کرنے اور اصلاح کی خواہش پائی جاتی ہے۔ اگرچہ کہ ترقی کی رفتار سست ہے۔ زرعی کمیشن نے خوب کہا ہے کہ اگر تحریک امداد باہمی ناکام ہو جائے تو دیہی ہندوستان کی امیدیں فنا ہو جائیں گی۔

زمین گروی بنک ۱۹۰۴ء میں تحریک امداد باہمی کے آغاز سے اب تک جو تجربہ ہوا، اس سے ظاہر ہے کہ قرضہ کی انجمنیں مرکزی اور صوبہ واری بنک صرف قلیل المیعاد قرضہ مہیا کر سکتے ہیں لیکن بھاری شرح سود کے قدیم قرضوں کی ادائی اراضی کی مستقل ترقی اور عام طور پر بہتر زرعی طریقہ کو رائج کرنے کے لئے طویل المیعاد قرضوں کی ضرورت ہے۔ اب اس امر کا بخوبی احساس ہو چکا ہے کہ ان اغراض کی تکمیل کے لئے زمین گروی بنک قائم کئے جائیں اور بڑی حد تک امداد باہمی کے اصولوں پر ان کی تنظیم ہو تاکہ چھوٹے کاشتکاری کی ضروریات پوری ہوں اور حکومت بھی امداد کرے بعض صوبوں مثلاً پنجاب، بنگال، صوبہ متوسط، صوبۂ متحدہ، بمبئی اور مدراس میں اس قسم کے گروی بنک قائم ہو چکے ہیں مدراس نے اس خصوص میں کافی ترقی کی ہے چنانچہ وہاں ۴۱-۱۹۴۰ء میں زمین گروی بنکوں کی تعداد اکیسو بائیس تھی۔ زمین گروی بنک کی ارزاں شرح اور زمینات کی ضمانت پر طویل المیعاد تمسکات کی اجرائی کی وجہ سے بھی اس قسم کے بنک قائم کرنے کی ترغیب ہو رہی ہے۔

حکومت بمبئی نے اس قسم کے سترہ بنک صوبہ کے مختلف حصوں میں قائم کئے ہیں۔ صوبۂ مدراس کی طرح ایک مرکزی گروی بنک بمبئی میں قائم ہو چکا ہے۔ تاکہ مرہونہ اراضیات کے تمسکات کی اجرائی میں

سہولت ہو۔ گروی بنک تمسکات کے علاوہ حصص بھی جاری کرتے ہیں۔ اور طویل المیعاد امانتیں محفوظ رکھتے ہیں۔ اراضی کو کفالت پر قدیم قرضوں کی ادائی قیمتی زرعی آلات کی فراہمی اور اراضی کی خریدی اور ان کی اصلاح کی غرض سے طویل المیعاد قرضے دس سے تیس سال تک کی مدت کے لئے دیا کرتے ہیں۔

صوبہ واری حکومتیں مختلف طریقوں سے ان بنکوں کو مدد دیتی ہیں۔ اکثر صوبوں میں حکومت ان بنکوں کے جاری کردہ تمسکات پر ادائی سود کی ذمہ داری بھی لیتی ہے۔ تمسکات کا ایک جزء خود بھی خریدتی ہے اور مالگذاری کے عہدہ داروں کے خدمات بلا معاوضہ اراضی کی صحیح تشخیص کے لئے مستعار دیتی ہے۔ اراضی کی صحیح تشخیص گروی بنک کے ذریعہ اس کے اراکین کو قرضہ دینے سے پیشتر ضروری ہے۔ رہن اراضی کی تمسکات بہت مستند تمسکات خیال کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں ہندوستان میں زمین گروی بنکوں کی تعداد ۲۵۲ تھی

مملکت آصفیہ میں قانون گروی بنک منظور ہوچکا ہے۔ قیام بنک کے متعلق ضروری انتظامات زیر غور ہیں۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں زمین گروی بنکوں کا قیام عمل میں آ جائے گا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مزارعین کو ان کی اراضی کی کفالت پر طویل المدت قرضہ دے کر ان کی مدد کی جائے تاکہ وہ اپنی ذمگی قرضہ جات کی ادائی زراعتی کاروبار کی ترقی اور دیگر مقاصد زرعی کی تکمیل کا انتظام کرسکیں اور ان میں کفایت شعاری اور اپنی مدد آپ کرنے کا مادہ پیدا ہوسکے۔

سررشتۂ زراعت کا ارتقا۔ زرعی ترقی میں حکومت اور سررشتۂ زراعت کی کوششوں کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اب زراعت سے حکومت کے تعلق کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ کاشتکاروں کی حالت کی اصلاح اور زرعی طریقوں کی ترقی دینے کی ضرورت کو حکومت نے ایک عرصہ قبل تسلیم کرلیا ہے۔ قحط کمیشن (۱۸۸۰ئہ) کی سفارش پر ۱۸۸۲ئہ میں سررشتۂ زراعت کا قیام عمل میں آیا۔ مختلف صوبہ جات میں زراعت کے سررشتے قائم ہوئے۔ وزیر ہند نے ڈاکٹر واکر کو ۱۸۸۹ئہ میں ہندوستان روانہ کیا تاکہ جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے زراعت کی ترقی کے لئے مشورہ دیں اور رپورٹ پیش کریں۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں زرعی تعلیم اور اصلاح پر زور دیا۔ پوسا کا اگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۰۳ئہ

میں قائم ہوا۔ اس کے ساتھ اعلیٰ ٹریننگ اور خصوصی مختصر عملی تعلیم کے لئے کالج بھی قائم کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں یہ ادارہ نئی دہلی میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں سررشتۂ زراعت میں بعض جدید اصلاحات نافذ کی گئیں، اور زرعی تجربوں تحقیقات، مظاہروں اور تعلیم کے لئے رقمی گنجائشیں مہیا کی گئیں۔ ۱۹۰۷ء میں پونا میں زرعی کالج کی بنا ڈالی گئی۔ بعدازاں اسی قسم کے کالج کانپور، ناگپور، لائل پور، کوئمبتور میں قائم کئے گئے۔ بعد میں سررشتۂ زراعت کو زرعی انجنیروں کے تقرر سے اور زیادہ مستحکم کیا گیا۔ یہ انجنیر زرعی مشنری کی تنصیب اور ان کے استعمال کے متعلق کاشتکاروں کو ضروری مشورہ دیتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ایک کل ہند زرعی بورڈ قائم کیا گیا۔ تاکہ صوبہ داری زرعی دفاتر کے مابین باہمی تعلقات قائم ہو جائیں اور اپنے سالانہ جلسوں میں مشترکہ مفاد کے مسائل پر بحث کریں اور حکومت ہند کے پاس اپنی سفارشات پیش کریں۔ ۱۹۲۱ء کے بعد سے صوبہ داری حکومتوں پر حکومت ہند کی نگرانی کم ہو گئی ہے کیونکہ زراعت کا سررشتہ منتقلہ صیغہ قرار دیا گیا ہے۔ شاہی زرعی کمیشن (۱۹۲۸ء) کی سفارش پر جولائی ۱۹۲۹ء میں ترقی کا ایک اور قدم اٹھایا گیا۔ اور زرعی تحقیقات کے لئے ایک شاہی مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ساتھ حکومت ہند کے مشیر زراعت کے فرائض بھی اسی جدید مجلس کے سپرد کر دیئے گئے۔ سررشتۂ زراعت کو سررشتۂ امداد باہمی کی بھی مدد حاصل ہے۔ صوبۂ بمبئی میں بعض ادارے مثلاً ڈسٹرکٹ اگریکلچرل ایسوسی ایشن، مجالس تنظیم دیہی اور تعلقہ کے مجالس ترقیاتِ عامہ بھی سررشتۂ زراعت کا ہاتھ بٹاتے ہیں

سررشتۂ زراعت کا کام۔ صوبہ واری سررشتہ ہائے زراعت مندرجہ ذیل کام انجام دیتے ہیں :-

(۱) مزرعوں اور تجربہ خانوں میں تحقیقات اور تجربے

(۲) زرعی پرچار کے کام کی تنظیم، جدید طریقہائے زراعت اور ترقی یافتہ آلات و اوزار کا استعمال نئی قسم کی کھاد کی ترویج، خالص تخم کی تقسیم ہمہ قسم کے ترقی یافتہ اجناس (مثلاً کپاس، گیہوں، چاول نیشکر وغیرہ) کی کاشت۔

(۳) زرعی کلیات اور مدارس میں تعلیم پر نگرانی کے علاوہ پیشۂ زراعت کے بنیادی مسائل مثلاً زرعی کیمیا۔ اصلاح الاضی اور حشرات الارض کے دفعیہ پر بھی مفید کام ہو رہا ہے۔ حکومت کے مزرعوں یا کاشتکاروں کے کھیتوں پر سررشتۂ زراعت کی جانب سے مظاہرے کئے جاتے ہیں وقتاً فوقتاً زرعی اور مویشیوں کی نمائش بھی منعقد کی جاتی ہے۔ اس سے قبل سررشتۂ علاج حیوانات کے کام کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔ معقول سرمایہ کی کمی، کام کی وسعت، دفتریت کا چکر، دیہاتی عوام کی قدامت پرستی اور تعلیم کا فقدان وہ رکاوٹیں ہیں جو فوری اصلاح میں حایل ہیں۔ تاہم ان پر تدریجاً غلبہ حاصل کیا جارہا ہے۔

یہاں شاہی کونسل کے اس کام کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے جو زرعی تحقیقات کے سلسلہ میں انجام دیا جارہا ہے۔ جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمام ہندوستان کے زرعی تحقیقاتی کاموں میں ترقی، رہنمائی اور باہمی اشتراک کی راہیں پیدا کرے۔ اور اس طرح زراعت کے صوبہ واری سررشتوں کو زرعی اور علاج حیوانات کے متعلقہ امور میں مدد دے۔ اس کونسل کی تشکیل انتظامی اور مشاورتی مجالس پر مشتمل ہے۔ اپنے قیام کے ابتدائی چھ سالوں کے دوران میں اس نے زرعی تحقیقات پر ایک کروڑ سے زائد رقم صرف کی ہے۔ زرعی ترقی کے سلسلہ میں مختلف مفید تجاویز کو روبہ عمل لایا گیا جن میں سے شکر کی صنعت اور زرعی مارکٹنگ کی تنظیم و اصلاح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سررشتۂ زراعت سرکار آصفیہ ۔ اگرچہ کہ سرآسمان جاہ کی مدارالمہامی میں سررشتۂ تجارت و حرفت کے فرائض میں زراعتی نظامت کے فرائض بھی شامل تھے لیکن چند ہی دن میں یہ سررشتہ تخفیف ہوگیا، اور لبعدازاں ۱۹۱۲ء میں دوبارہ سررشتۂ زراعت قائم ہوا۔ اس سررشتہ کے قائم کرنے کی بڑی غرض یہ تھی کہ گورانی کپاس کو ترقی دی جائے۔ ۱۹۱۹ء کے بعد سررشتۂ زراعت کی توجہ صرف کپاس ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ نیشکر، تمباکو اور دیگر فصول کاشت کی تحقیقات آغاز کی گئی، اور تجرباتی مزرعے قائم کئے گئے۔

اب سررشتۂ زراعت کے کام کو اس کی نوعیت کے لحاظ سے حسب ذیل شعبوں میں تقسیم کیا

جا سکتا ہے

(۱) شعبۂ تحقیق میں وہ خالص فنی نوعیت کی تحقیقات شامل ہے جس کے ذریعہ حکمیاتی نظریوں کو زراعت کے عملی کام میں استعمال کیا جاسکے۔ اس قسم کے کام کی غرض سے سررشتہ کے تحت نباتیات کیمیا، حشرات اور مرغبانی کے شعبے قایم ہیں۔

(۲) شعبہ تجرباتی میں تحقیقات سے جو حوصلہ افزا نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ ان کو تجرباتی مزرعوں میں آزمایا جاتا ہے۔ تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ بڑے پیمانہ پر کاشتکاری میں یہ کس حد تک قابل عمل ہیں۔ اور کفایت شعاری کے نقطۂ نظر سے کام دے سکتے ہیں یا نہیں۔

(۳) مظاہرہ اور پرچار کے شعبہ میں ان نفع بخش نتائج کا مظاہرہ کرنا اور رعایا کو ان کے استعمال کی ترغیب دینا ہے جو تجربے اور تحقیق سے مفید ثابت ہو چکے ہیں۔ نیز جملہ زرعی معاملات میں انھیں مشورہ دینا اور جن اشیاء کو نفع بخش بتایا گیا ہے ان کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں مدد دینا ہے۔

مملکت کی پانچ اہم ترین فصلوں یعنے چاول، ارنڈی، گیہوں، جوار اور کپاس کے پودوں کی افزائش اور پرورش کا کام جاری ہے۔ چنانچہ مزرعہ حمایت ساگر میں چاول اور ارنڈی پر پربھنی کے مزرعہ میں گیہوں، جوار اور کپاس پر، رائچور کے مزرعہ میں کپاس پر تجرباتی کام ہو رہا ہے۔ کاشتکاروں اور باغات کے مالکوں کو کیڑوں کی ان بیماریوں کے انسداد سے متعلق جو فصلوں میں پھیل جاتی ہیں۔ حتی الامکان مشورے دیئے جاتے ہیں۔ کیمیائی شعبہ مٹی کے تحقیقاتی کام کے علاوہ کھاد اور تخم کے نمونوں کا تجربہ کرتا ہے۔

حمایت ساگر میں مرغی خانہ اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ مملکت کی آب و ہوا کے لحاظ سے بہترین قسم کی مرغیاں فراہم کی جائیں۔

سررشتہ زراعت کی جانب سے حمایت ساگر، سنگاریڈی، پربھنی، ورنگل، اورود، اورنگ آباد بیدر اور رائچور میں تجرباتی باغ قائم کئے گئے ہیں۔ ان باغات میں متعدد اقسام کی مقامی اور

غیر ملکی ترکاریاں بھی اگائی جاتی ہیں۔ تاکہ تجارتی پیمانہ پر کاشت کے لئے موزوں ترین اقسام کا انتخاب کیا جا سکے اور ان کے تخم حاصل کئے جائیں اور ان کا مظاہرہ کیا جائے۔

اس سررشتہ کی جانب سے زرعی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ممکنہ طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو طریقہ سب سے زیادہ کاشتکار پر اثر ڈالتا ہے۔ یہ ہے کہ مکمل مظاہرہ اسکی آنکھوں کے سامنے اور اس کے گاؤں کے حالات کے تحت کیا جائے۔ چنانچہ دیہات میں امدادی مزرعے اور مظاہراتی خطے قائم کئے گئے ہیں۔ امدادی مزرعے کاشتکاروں کی ملک ہوتے ہیں۔ جن کو سررشتہ اپنے کام کے لئے منتخب کرتا ہے۔ کاشتکار کو پابند کیا جاتا ہے۔ کہ اپنی زمین کا ایک حصہ مظاہراتی اور تجرباتی اغراض کے لئے سررشتہ کے حوالے کر دے۔ اور اس کو اپنے طور پر فصلوں کی وہ خاص قسمیں اگانی پڑتی ہیں۔ جن کے تخم کی سررشتہ کو دوسرے کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ تجرباتی اور مظاہراتی رقبہ کے تمام مصارف سررشتہ برداشت کرتا ہے۔ تجربہ یا مظاہرہ ختم ہونے کے بعد پیداوار زمین کے مالک کو دیدی جاتی ہے۔ کاشتکار اس امر کا پابند ہوتا ہے کہ اس کے رقبہ کی ساری پیداوار سررشتہ کے ہاتھ فروخت کر دے۔ جسمیں وہ سررشتہ کے سفارش کردہ ترقی یافتہ تخم بوتا ہے۔ فی الحال ملکت حیدرآباد میں اس قسم کے ۴۲ مزرعے موجود ہیں۔

سررشتہ زراعت کی جانب سے بعض مزرعوں پر جماعت کاشتکاری اور باغبانی کا بھی انتظام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس جماعت کا مقصد کاشتکاروں کی اولاد کو زراعت کے جدید طریقے سکھانا ہے۔ طلبہ کو کاشتکاری کے ترقی یافتہ اصولوں کے مطابق عملی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ مدت تعلیم دو سال ہے۔ حمایت ساگر، پربھنی، اور رودرور (نظام آباد) کے مزرعوں میں اس قسم کے تربیت کے انتظامات کئے گئے ہیں۔

حکومت سرکار عالی نے ایک زرعی کالج کے قیام کی غرض سے موازنہ میں پندرہ لاکھ روپے کی گنجائش فراہم کی ہے۔

مملکت میں امپیریل کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ کی حسب ذیل اسکیمیں جاری ہیں :۔
(۱) خشک کاشتکاری کی تحقیقات کی اسکیم رائچور میں (۲) ارنڈی اور چانول کی اصلاح کی اسکیم حمایت ساگر میں ۔ (۳) میووں کو ترقی دینے کی اسکیم سنگاریڈی اور اورنگ آباد میں (۴) نیشکر کی تحقیقات کی اسکیم رودرور میں ۔

مملکت حیدرآباد میں سنٹرل کاٹن کمیٹی کی حسب ذیل اسکیمیں جاری ہیں :۔
(۱) کپاس کی نباتیاتی تحقیقات کی اسکیم بمقام پربھنی ۔ (۲) کپاس کے کیڑے بولی ورم کو صاف کرنے کی اسکیم بمقام ناندیڑ ۔ (۳) کپاس کے تخم کی تقسیم بمقام رائچور ۔ (۴) کپڑا کپاس کی ترقی و اصلاح کی اسکیم بمقام رائچور ۔

سررشتۂ زراعت کی جانب سے ایک زرعی انجمن بھی قائم ہے، اور ایک سہ ماہی رسالہ "حیدرآباد فارم" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

دیہی تنظیم ۔ زرعی کمیشن نے صحیح تنقید کی ہے کہ "زراعت میں کوئی اصلی ترقی نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ خود کاشتکار معیشت، تعلیم، حفظ صحت کے ایک بہتر معیار حصول کا آرزومند نہو۔ کاشتکار کو چاہیئے کہ سائنس، دانشمندانہ قوانین اور اچھے نظم و نسق سے استفادہ کرے۔ بہتر زندگی کے مطالبہ کو صرف متحدہ کوشش کی بنا پر ہی تقویت حاصل ہوسکتی ہے اور اس سے دیہی آبادی کی عام حالت میں اصلاح ہوسکے گی۔ اس خصوص میں تقدیم کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے اور اس مقصد کے حصول میں سررشتہ ہائے مالگذاری، جنگلات، زراعت، امداد باہمی، تعلیمات، صحت عامہ، صنعت و حرفت اور تعمیرات کی تنظیم اور باقاعدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ عوام کی ہمدردی دلچسپی اور امداد بھی بہت ضروری ہے۔ صرف چند سرگرم اور بلند خیال عہدہ داروں کی انفرادی کوششوں سے کوئی مستقل نتائج حاصل نہیں ہوسکتے ۔ اس قسم کی کوششوں کی ایک مثال مسٹر ایف ۔ یل ۔ برین آئی ۔ سی ۔ یس کے ان تجربوں میں نظر آتی ہے جو وہ ضلع گرگاؤں پنجاب میں عمل میں لائے ۱۹۳۷ء کے وسط سے ہندوستان کے اکثر صوبجات میں دیہی تنظیم کا کام وسیع پیمانے پر شروع کیا گیا ہے،

سر فریڈرک سائکس گورنر بمبئی کے عہد ۱۹۳۴ء میں سرکاری عہدہ داروں اور غیر سرکاری اصحاب کے اتحاد عمل کی بنیاد پر دیہی تنظیم کی اسکیم جاری کی گئی - یہ ارکان گاؤں، تعلقہ اور ضلع کی کمیٹیوں میں کام کرتے ہیں۔

زرعی اصلاح، دیہی صنعتیں، دیہی حفظ صحت، تعلیم، تعمیر امکنہ اور دیہی سہولتوں کی فراہمی اس اسکیم کے اہم مقاصد ہیں ۱۹۳۹ء میں بمبئی میں کانگریسی وزارت نے ایک جدید سررشتہ تنظیم دیہی کے کام کیلئے قائم کیا اور اب تربیت یافتہ اشخاص کی نگرانی میں توقع کی جاتی ہے کہ ہر گاؤں میں اس کام کی خاطر خواہ ترقی ہو سکے گی۔ حکومت ہند نے بھی تحریک اصلاح دیہات میں دلچسپی لیکر صوبہ جات کو ڈھائی کروڑ روپے کی رقم ۳۶-۱۹۳۵ء کے موازنہ سے عطا کی۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ محض اس جدوجہد سے زرعی مسائل حل نہیں ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ صنعتی اور عام معاشی ترقی بھی ضروری ہے۔

تنظیم دیہی مملکت آصفیہ میں - اصلاح دیہات کا کام برطانوی ہند کے بعض اضلاع میں عہدہ داران ضلع کی انفرادی کوشش سے عمل میں آنے لگا یا وائی۔ یم۔ سی۔ اے جیسی غیر سرکاری انجمنوں نے اس کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرکے سرکاری طور پر اس کا آغاز بہت بعد میں کیا گیا۔ لیکن ممالک محروسہ سرکار عالی کو سرکاری طور پر اس کام کے آغاز کی اولیت حاصل ہے چنانچہ ۱۹۳۱ء میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی امداد سے سب سے پہلے ٹنیچروین تنظیم دیہی کے ایک مرکز کا افتتاح عمل میں آیا۔

تنظیم دیہی کے کام کی کامیابی کے لئے بطور بنیادی اصول یہ امر طے کیا گیا ہے کہ مفاد عامہ کے سررشتہ جات کے باہمی تعاون و اتحاد عمل کے ساتھ اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ خود دیہی آبادی میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ وہ خود اپنی منفردہ اور اجتماعی ترقی کی تدابیر اختیار کرے اور ان ذرائع سے استفادہ کرے جو آئے دن ملک کی ترقی کے لئے منجانب سرکار مہیا کئے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی کڑی صدر مجلس تنظیم دیہی ہے جس کا صدر مقام بلدۂ حیدرآباد ہے اور جس کے اراکین مفاد عامہ کے سررشتوں کے ذمہ دار اعلیٰ عہدہ داران ہیں۔ کام میں سہولت اور خوش

اصلاح پیدا کرنے ایک علیحدہ معتمدی تنظیم دیہی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ صدر مجلس کے تحت ہر ضلع کے مستقر پر مجلس ضلع ہوتی ہے۔ اور مجلس ضلع کے زیر نگرانی مجلس تحصیل ہوتی ہے۔ ان مجالس میں سرکار عالی عہدہ داران کیساتھ مساوی تعداد میں غیر سرکاری نمایندے بھی شریک ہوتے ہیں۔

ہر مجلس تحصیل کی رہبری میں دیہی تنظیم کا کام ایک ایسے موضع میں شروع کیا جاتا ہے۔ جس کی آبادی متوسط درجہ کی ہو، اور مستقر تحصیل سے پانچ سے بارہ میل کے فاصلہ پر سڑک سے قریب واقع ہو۔ ایسے منتخب موضع میں تنظیم دیہی کی انجمن قائم کی جاتی ہے

۱۹۴۱-۴۲ء میں دیہی تنظیم کے کام کے لئے منتخب کردہ دیہات کی تعداد ۱۲۴ تھی۔ وسیع پیمانہ پر تحریک کی ترویج کو روکا گیا۔ حکومت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مفاد عامہ کے سررشتوں کو چاہیئے کہ ابتداء میں ہر تعلقہ میں صرف ایک یا بخاص حالات میں دو منتخب مواضعات میں اس کام کو پوری قوت کے ساتھ جاری کریں۔ اور زیادہ تر زور اس پر دیا گیا کہ خود دیہاتی آبادی اس تحریک میں دلچسپی لے اور انھیں موجودہ انجمنوں کے رکن بننے کی ترغیب دی جائے۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ اب ارکین کی تعداد (۱۶۹۰۰) ہوگئی ہے۔

۱۹۴۱-۴۲ء میں چند منتخب مواضعات میں ۱۱۳ غلے کے بنک تھے۔ جن کے اراکین کی تعداد ۶۲۵۵ تھی۔ مختلف مرکزی مقامات پر چھ دیہی بنک کھولے گئے۔ دیہی تنظیم کے مواضعات میں بہتر تخم کی تقسیم عمل میں آئی۔ کھاد کے گڑھے کھدوائے گئے۔ ذیلی زرعی صنعتیں جاری کی گئیں میوہ دار کے درخت نصب کئے گئے۔ باؤلیاں کھدوائی گئیں۔ سڑکوں کی تعمیر کی گئی۔ جاذب غلاظت گڑھے کھدوائے گئے۔ لڑکیوں اور بالغوں کی تعلیم ترقی پذیر رہی۔ دیہات میں ادویات کی مفت تقسیم کا کام ہر دلعزیز ہوتا جارہا ہے۔ نمائش ہائے اطفال منعقد کی گئیں۔ تمام تر توجہ اس امر پر رہی کہ دیہی قرض، دیہی صنعتوں، مویشیوں کی پرورش و نگہداشت اور کاشت کے بہتر طریقوں کو عام کرکے پیداوار کو ترقی دیجائے۔ اضلاع کے منتخب مواضعات میں ایک دوسرے سے مسابقت کرنے کا ایک اچھا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ دو سو روپے سے لیکر تین سو روپے تک اس موضع کو

دیئے جاتے ہیں۔ جو تنظیم دیہی کے مواضعات میں بہتر ثابت ہوتا ہے۔ مجلس ضلع کے اراکین امداد باہمی
کے سال کے ختم پر تقسیم انعامات کے لئے ان تمام مواضعات کا دورہ کرتے ہیں، جہاں تنظیم دیہی کا کام
ہو رہا ہے۔ یہ مواضع اپنی عملی ترقیوں کو دیگر مواضعات کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے امید افزا
نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔

جنگ کے زمانہ میں زرعی پالیسی ۱۹۳۹ء کے اختتام پر جنگ کے آغاز کی وجہ سے دیہی
معیشت اور ملک کی زراعت کی آئندہ ترقی کے مسائل بہت ہی اہم اور پیچیدہ ہوگئے۔ اس جنگ کی وجہ
سے جو حالات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس کی اصلاح کے لئے ایک کافی مدت درکار ہوگی۔ اور نیز مابعد جنگ کی
معاشیات کی تنظیم پر غور و فکر ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ پیدائش دولت اور تقسیم دولت میں
باہمی ربط اور توازن قائم رکھا جائے۔ ملک کی ساری آبادی کو معیشت و معاش کے بالکل نئے مسئلوں
سے دوچار ہونا پڑا۔ دوران جنگ میں ملک کی غذائی صورت حال اطمینان بخش نہیں رہی۔ بنگال کے
قحط نے حکومت اور عوام دونوں کو اس صورت حال کی طرف متوجہ کر دیا۔ حکومت ہند نے اس مسئلہ
کو حل کرنے کے لئے ڈاکٹر گریگری معاشی مشیر حکومت ہند کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ غذائی
صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے گریگری کمیٹی نے جو سفارشات پیش کی تھیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) زیادہ غلہ اگاؤ کی مہم کو کامیاب بنایا جائے۔ اس کے لئے کاشت عمیق اور کاشت وسیع
کے طریقے اختیار کئے جائیں۔ تجارتی فصلوں کو گھٹا کر ان کے بجائے غذائی فصلیں اگائی جائیں
بیکار رقبوں کو زیر کاشت لایا جائے۔ کاشت عمیق کے لئے عمدہ تخم اور اچھی کھاد مہیا کی جائے
کھاد کے ساتھ آبپاشی کی ضرورت ہے۔ مویشی کثرت سے ذبح کئے جا رہے ہیں۔ ان پر پابندی
عائد کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت مزارعین کو آلات زراعت بھی فراہم کرے۔

(۲) رسد بندی کے لئے ایک مرکزی ذخیرہ قائم کیا جائے۔ [illegible] رسد
بندی کے لئے سرکاری عہدہ داروں یا قابل اعتماد کمپنیوں سے بحیثیت نمائندہ کام لیا جائے اور
کسانوں سے بالراست پیداوار خریدی جائے۔ کسانوں سے جبراً غلہ حاصل نہ کیا جائے بلکہ ترغیب

وتحریص سے کام لیا جائے اور انھیں ان کی ضروریات مثلاً پارچہ اور ادویات وغیرہ فراہم کی جائیں۔

(۳) ذرائع حمل ونقل میں سہولتیں مہیا کی جائیں اور قلت پیداوار والے صوبوں کو غلہ کی فراہمی کی جائے۔

(۴) شہروں میں اغذیہ کی راشن بندی کی جائے۔

(۵) قیمتوں کی نگرانی کی جائے، اور ذخیرہ بندی کے خلاف مؤثر انسدادی تدابیر اختیار کی جائیں۔

(۶) محکمۂ اغذیہ کے فرائض میں رسد بندی، راشن بندی، حکم نگرانی اجناس، اعداد وشمار کی فراہمی وترتیب، غلہ کی نقل وحمل، نشرواشاعت اور عام غذائی پالیسی کو روبہ عمل لانا شامل ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے تمام اعلیٰ عہدہ داروں میں باہمی تعاون ہونا چاہیئے۔ محکمۂ اغذیہ میں موزوں، قابل، تربیت یافتہ، با اخلاق اور دیانت دار عہدہ داروں کا تقرر ہونا چاہیئے جو عوام کا تعاون عمل حاصل کر سکیں۔

(۷) مرکزی حکومت اور صوبہ جات کے فرائض اور اختیارات کا تعین ہونا چاہیئے۔ ان کے اختلافات کا تصفیہ ماہرین کی کمیٹی کو کرنا چاہیئے، صوبہ جات کو چاہیئے کہ مرکزی حکومت جو حصہ رسدی مقرر کرے اس کو قبول کرلیں۔ مرکز کو بھی حصہ رسدی مقرر کرتے وقت قلت والے علاقوں کی تمام ضروریات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ مرکزی ذخیرہ کا انتظام بالکلیہ مرکزی حکومت کے اختیار میں رہے۔

(۸) غلہ کی برآمد کو موقوف کیا جائے، اور اجناس خوردنی درآمد کی جائیں۔ بیرونی افواج کے قیام کی وجہ سے ملک کے غذائی وسائل پر کافی بار پڑ رہا ہے۔

(۹) افراط زر کا انسداد ہونا چاہیئے۔ حکومت ہند نے برطانیہ عظمیٰ کی خریداریوں کے لئے نوٹ چھاپ کر روپیہ فراہم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کو ترک کر دینا چاہیئے تاکہ اس کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ نہ ہونے پائے۔

بہ دوران جنگ حکومت ہند نے گریگری کمیٹی کے اکثر سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی طرف توجہ مبذول کی

حکومت حیدرآباد کو بھی زمانۂ جنگ کے معاشی مسائل مثلاً فراہمی اور تقسیم اجناس خوردنی کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ حکومت سرکار عالی نے نگرانی نرخ اشیاء کا ایک سررشتہ قائم کیا، مملکت آصفیہ میں زیادہ غلّہ اُگانے کی مہم سنہ ۱۹۴۲ء میں شروع کی گئی، سنہ ۱۹۴۳ء میں اس مہم میں زیادہ سرگرمی پیدا کرنے کی غرض سے حکومت سرکار عالی نے کاشتکاروں کو ۳۴ لاکھ روپے سے زیادہ کی مدد کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ محض نفع آور پیداوار کی بجائے غلّہ کی پیداوار زیادہ سے زیادہ مقدار میں اگائی جاسکے، افتادہ اراضیات بھی قلیل مدت کے لئے برائے نام لگان پر اٹھا دی گئیں، اور یہ شرط عائد کی گئی کہ اس اراضی پر غلّہ کی کاشت کی جائے۔ ایک خصوصی دستور العمل نافذ کیا گیا جس کی رو سے کاشتکاروں کے لئے کم از کم دو تہائی اراضی پر اجناس خوردنی کی کاشت کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ حیدرآباد، سکندرآباد ورنگل، نارائن پیٹ، محبوب نگر، یادگیر، گلبرگہ، شاہ آباد اور شولاپور میں راشن بندی نافذ کی گئی۔ بڑے مقاموں میں راشن بندی کرنے کے لئے ضروری ذخیروں کا حصول، غلہ کی قلت والے اضلاع اور اہم سروسوں اور صنعتوں کے لئے مناسب انتظام اس طرح ممکن ہوسکا کہ ہر کاشتکار سے کاشت کئے جانے والے ہر ایکڑ پر غلّہ کی مقررہ مقدار لازمی طور پر وصول کی گئی اور اس حصہ کو وصول جمع، منتقل اور تقسیم کرنے، اور جن علاقوں میں پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے وہاں غلہ کی مزید خریداری کرنے کے لئے حیدرآباد کمرشیل کارپوریشن کے نام سے ایک وسیع نظام قائم کیا گیا ہے۔

حیدرآباد کمرشیل کارپوریشن کی جانب سے غلّہ حاصل کرنے کے لئے ممالک محروسہ کی انجمن ہائے امداد باہمی سے روز بروز زیادہ کام لیا جارہا ہے۔ جنگ اور قیمتوں پر نگرانی کی مختلف تدابیر کی وجہ سے امداد باہمی کی تحریک کو ایک اچھا موقع مل گیا ہے۔ اس تحریک کے ذریعہ اس بات کی ہر ممکنہ کوشش کی جانی چاہیئے کہ کاشتکار اپنے آپ کو منظم کریں۔ پیداوار کو جمع کرنے کا کام سنبھالیں، اس کے ذخیرہ کرنے کا مالی بار برداشت کریں۔ پیداوار کی درجہ بندی کریں اور اسے راست صارفین تک پہنچادیں۔

تنظیم مابعد جنگ میں تعمیر جدید اور ترقی کے مسائل حکومت سرکار عالی کی توجہ کا مرکز بنتے جارہے ہیں۔ جنگ کے بعد کی ترقی اور تعمیر جدید کے خاکوں کے لئے ایک مجلس کا قیام عمل میں آیا ہے۔ زرعی پیداوار

کی نوعیت اور مقدار میں ترقی اور کاشتکار طبقہ کی فلاح کے سلسلے میں جو کام کیا جائے گا اسے مندرجہ ذیل عنوان کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) آبپاشی کی ترقی اور پانی سے برقی قوت کے حصول میں اضافہ۔

(۲) زراعت پر سائنٹفک تحقیقات

(۳) تجرباتی مزرعوں میں ترقی۔

(۴) زرعی مدرسوں اور کالجوں کا قیام

(۵) مختلف علاقوں کے خام مال کی بنیاد پر دیہی صنعتوں کی ترقی۔

(۶) جنگلات سے متعلق نئی پالیسی کا قیام، جنگلات کی پیداوار اور وسائل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ۔

(۷) مویشیوں کی اصلاح اور طبی علاج کی آسانیاں۔

(۸) نو آبادیوں کا قیام

(۹) ملک کے قدیم باشندوں اور پست طبقوں کی بہتری کی تدابیر۔

(۱۰) رسل و رسائل میں ترقی۔

مالگذاری

ہندوستان کی مالگذاری پر تاریخی نظر۔ (۱) عہد ہنود :۔ قدیم زمانہ سے ہندوستان کی حکومت کاشتکاروں سے پیداوار کا ایک حصہ حاصل کرتی رہی ہے۔ منو کے قوانین کے بموجب بادشاہ کو اختیار تھا کہ کل پیداوار کا ۱/۶ حصہ وصول کرے۔ مگر جنگ اور نازک اوقات میں ایک چوتھائی حصہ حاصل کر سکتا تھا۔ مالگذاری جنس کی صورت میں ادا کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ خصوصاً مسلمانوں کی سلطنت قائم ہونے کے بعد بشکل زر ادائی کا طریقہ رائج ہوا۔

(۲) عہد مغلیہ :۔ مغلوں نے ہندوں کے قدیم طریقۂ مالگذاری میں کوئی بنیادی تغیرات نہیں کئے۔ بلکہ صرف ان کے طریقے کو قاعدہ کے تحت کر دیا۔ اور مال گذاری کا باقاعدہ حساب و کتاب

جاری کیا۔ اس سلسلہ میں شہنشاہ اکبر اور اس کے قابل وزیر مالیات مظفر خاں اور راجہ ٹوڈرمل کا مشہور بندوبست اراضی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے شیر شاہ سوری کے اصلاحات مالگذاری سے استفادہ کیا۔ اراضی کی پیائش کے بعد چار درجوں میں اس کو منقسم کیا گیا تھا۔ اور مجموعی پیداوار کا ایک تہائی حصہ حکومت کا حصہ قرار دیا گیا۔ بندوبست کی میعاد نو سالہ تھی۔ دکن میں ملک عنبر احمد نگری اور مرشد قلیخاں نے اس قسم کے اصلاحات کئے۔ مرہٹوں کا نظام مالگذاری بھی اسی نوعیت کے بندوبست پر مبنی تھا۔

شاہان مغلیہ کے تنزل کے زمانہ میں مالگذاری کے طریقہ اور مدت کاشت میں ایک اہم لیکن ناخوشگوار تبدیلی ہوئی اس طریقے کے تحت مالگذاری وصول کرنے کا اختیار بعض ٹھیکہ داروں کو دیا جاتا تھا۔ جو حکومت کو مجموعی آمدنی کا ۹/۱۰ حصہ ادا کرتے اور بقیہ رقم بطور معاوضہ خود رکھ لیا کرتے تھے رفتہ رفتہ ان ٹھیکہ داروں نے اپنی حالت مستحکم کر کے زمین کے موروثی حقوق حاصل کر لئے۔ اس عمل درآمد کے تحت ٹھیکہ دار اصلی کاشتکار پر بڑا ظلم ڈھاتے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی مدت کاشت اور حقوق میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ اور ابتدائی طریقہ مالگذاری باقی نہ رہا خاص کر بنگال میں ٹھیکہ داروں نے زمینداری حیثیت حاصل کر لی۔

(۳) برطانوی عہد :- ان حالات کے تحت برطانوی ماہرین نظم و نسق کے لئے کام بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ان سے ابتدا میں بہت سی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ مختلف صوبہ جات کے لئے ایک موزوں طریق کار کو روبہ عمل لانے میں ایک کافی مدت گزر گئی۔ ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی عطا ہونے کے بعد کلائیو کی دوعملی نظام والے حکومت کی وجہ سے ابتدائی بدنظمی میں اور ابتری پیدا ہو گئی ۱۷۷۲ء میں اس کا انسداد ہوا۔ اور متعدد تجربوں کے بعد ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے بنگال میں دوامی بندوبست جاری کیا جسکی رو سے اراضی پر زمینداروں کے مالکانہ حقوق تسلیم کر لئے گئے اور مالگذاری کی مقدار بھی ہمیشہ کے واسطے متعین ہو گئی۔ جدید بندوبست کے نتائج کچھ زیادہ خوش آیند نہ تھے۔ ابتدا میں زمیندار مالگذاری کے بارگراں کو ادا کرنے سے قاصر تھے۔

اور کاشتکاروں پر سختی کیا کرتے تھے۔ کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ اور زمینداروں کے مظالم سے ان کو محفوظ رکھنے کیلئے ۱۸۵۹ء اور ۱۸۸۵ء میں ضروری قوانین کا نفاذ ناگزیر ہوگیا۔ اضافۂ لگان اور بے دخلی کے قواعد مقرر کئے گئے۔ دوامی بندوبست کی ابتدائی پالیسی جو ۱۷۹۵ء میں بنارس اور شمالی مدراس کے بعض حصوں میں رائج ہوچکی تھی ۱۸۶۲ء میں ترک کردی گئی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں میعادی بندوبست کا طریقہ بیس۲۰ سے تیس۳۰ سال تک مقرر کیا گیا اور اسی طرح اودھ کے تعلقدار صوبہ متوسط کے مالگذار پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے محال، مدراس بمبئی اور برار کی رعیت عارضی طور پر میعادی بندوبست سے دوچار ہوئی۔

بندوبست سے کیا مراد ہے۔ بندوبست کی اصطلاح امور ذیل کے تعین پر مشتمل ہے

(۱) پیداوار یا لگان کا وہ حصہ جس کی حکومت مستحق ہے۔

(۲) شخص یا اشخاص جو اس کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں

(۳) اراضی پر خانگی حقوق اور مفادات کے باضابطہ تحریری دستاویزوں کا تحفظ۔

تعین مالگذاری کے لئے زمین کی تشخیص کی جاتی ہے۔ مالگذاری کی شرح زمین کے مختلف مدارج کے مطابق مقرر ہوتی ہے۔ اور گاؤں کے مختلف حلقوں اور حصوں میں زمین کو منقسم کیا جاتا ہے۔ اس طرح مقبوضہ اراضی پر محصول کی مقدار معین ہوتی ہے۔ مالگذاری اقساط سے وصول کیجاتی ہے عام طور پر زرعی تباہی اور فصول کی جزوی یا کلّی خرابی کی صورت میں بھی معافی یا التوا منظور کیا جاتا ہے

مختلف صوبہ جات میں مالگذاری کی تشخیص کے جو مختلف اصول اختیار کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

دوامی بندوبست بمقابلۂ عارضی بندوبست۔ بندوبست مالگذاری اپنی مدت کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے

(۱) دوامی بندوبست جس میں مالگذاری ہمیشہ کے واسطے معین کردی جاتی ہے۔ جیسا کہ بنگال شمالی مدراس اور بنارس میں رائج ہے۔

(۲) عارضی بندوبست جس میں ایک مدت معین کے لئے مالگذاری مقرر کی جاتی ہے۔ اس کی مدت صوبہ متوسط میں بیس سال بمبئی مدراس اور صوبہ متحدہ میں تیس سال اور پنجاب میں چالیس سال مقرر ہے۔

کسی زمانہ میں دوامی اور عارضی بندوبست کے مسائل ہندوستان میں مابہ البحث رہ چکے ہیں۔ آر، سی، دت، آنجہانی نے دوامی بندوبست کو تمام ہندوستان میں جاری کر دینے کی حمایت کی اور لارڈ کرزن نے حکومت ہند کی جانب سے اسکی مخالفت کی۔ دوامی بندوبست کی حمایت میں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اس سے حکومت کو مستقل مالگذاری وصول ہوتی ہے۔ اور اس کے وصولی میں اخراجات بھی نسبتاً کم عائد ہوتے ہیں دوامی بندوبست سے زرعی ترقی اور خوشحالی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ دوامی بندوبست کے مقابل عارضی بندوبست کے نقائص یہ ہو سکتے ہیں مثلاً مالگذاری کی نظر ثانی کے وقت کاشتکاروں کی پریشانی، نئے بندوبست کے لئے قیمتی آلات کی فراہمی، صنعت و حرفت اور دیگر اصلاحی امور کی راہ میں موانعات اور عہدہ داران مالگذاری کے ہاتھوں میں اقتدار کا ارتکاز۔

اس کے برعکس دوامی بندوبست سے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ حکومت کو مالگذاری کے امید افزا اضافہ سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ اسکے علاوہ دوامی بندوبست سے غائب زمینداری طریقہ کے نقصانات رونما ہوتے ہیں۔ اور پٹہ داروں کی محافظت کیلئے حکومت کو خاص قوانین بنانے پڑتے ہیں۔ اسکی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اب عارضی بندوبست کے نظام میں بہت کچھ اصلاح ہو چکی ہے۔ جنمیں اراضی کی درجہ بندی اور اسی نوعیت کے دیگر امور کو مستقل حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ نیز خاص طور سے زمین میں جو اصلاحات عمل میں لائے جائیں ان کی وجہ سے نا مناسب اضافہ عمل میں نہیں لایا جاتا اور ضرورت کے وقت التوا اور نظر ثانی بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ عارضی بندوبست کے موجودہ طریقوں کے ذریعہ حکومت کے مطالبات اور کاشتکاروں کے حقوق کے مابین ایک خوشگوار تصفیہ کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ آجکل رائے عامہ عارضی بندوبست سے گویا راضی ہو چکی ہے۔ اور زیادہ مدت کے بندوبست کے ذریعہ مناسب شرح مالگذاری اور انتظام مالگذاری پر قانونی نگرانی قایم کر کے مزید اصلاح کی متلاشی ہے۔ بنگال میں حکومت نے

دوامی بندوبست کے سلسلہ میں غور کرنے کے لئے ایک کمیشن سر فرانسیس فاؤلر کی صدارت میں قائم کیا۔ اس رپورٹ کی بنا پر مارچ ۱۹۴۳ء میں حکومت کی جانب سے لیجسلیٹو اسمبلی میں اعلان ہوا کہ حکومت دوامی بندوبست کو برخاست کر دینا چاہتی ہے۔ تعلقداروں اور زمینداروں کو لگان وصول کرنیکے لئے جو حقوق حاصل ہیں۔ ان کا معاوضہ ادا کر دیا جائیگا۔ اور تعلق راست قائم ہو جائیگا۔ اولاً ایک یا دو اضلاع میں بطور تجربہ اس کا نفاذ عمل میں آئیگا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ معاوضہ کی ادائی میں ۷۳ ا کروڑ روپے کے مصارف عائد ہونگے۔

بندوبست کی تین بڑی قسمیں ۔ بندوبست کی تقسیم میعادی لحاظ سے بھی کیجا سکتی ہے۔ یعنے وہ طریقہ جس کے تحت اراضی پر قبضہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اسکی تین بڑی قسمیں ہیں۔

(۱) زمینداری اس میں ایک شخص یا چند مشترکہ قابضین وسیع اراضی حاصل کرتے ہیں۔ اور یکمشت زر مالگذاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس قسم کا طریقہ بنگال میں رائج ہے۔

(۲) محال داری نظام۔ گاؤں کی اراضی مشترکہ جماعتوں کی ملکیت ہوتی ہے۔ جس کے ارکان بالاشتراک یا انفرادی طور سے مالگذاری ادا کرتے ہیں۔ آگرہ اور پنجاب کے بعض حصوں میں یہ طریقہ رائج ہے۔

(۳) رعیت داری طریقہ میں زمین کے ہر قطعہ کا مالک علحدہ شخص ہوتا ہے۔ پٹہ دار انفرادی حیثیت میں مالگذاری کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بمبئی، مدراس اور برار میں یہ طریقہ رائج ہے۔

میعاد کی ان تین بڑی قسموں کے علاوہ بیڈن پاول نے بندوبست کی تین اور بڑی قسمیں بیان کی ہیں (۱) زمینداری بندوبست۔ ایک علحدہ قطعۂ اراضی کسی ایک زمیندار کے تحت ہوتا ہے۔ اس میں یا تو دوامی بندوبست کی اساس پر جیسے بنگال، شمالی مدراس اور بنارس میں ہے۔ یا عارضی بندوبست کی بنیاد پر جیسے اودھ کے تعلقدار ہیں (بنگال میں بھی اس قسم کے چند زمیندار ہیں) پٹہ دار زمین کی کاشت کرتے ہیں اور زمیندار کو لگان ادا کرتے ہیں۔

(۲) محال داری بندوبست۔ قطعہ زمین اشخاص کے تحت ہوتا ہے۔ جیسا کہ صوبہ متحدہ اور پنجاب میں ہے۔ صوبہ متوسط کے مالگذاروں کو اسی طریقہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ پنجاب میں پٹہ دار کو

کی کوئی قابل لحاظ جماعت نہیں ہے اور تقریباً نصف زمینات (بشمول جدید نہری نوآبادیات) پر مالکان اراضی قابض ہیں۔ اور یہ خود ہی کاشت کرتے ہیں۔ اگرچہ کہ نظری حیثیت سے یہاں مالگذاری ہر ایک کاشتکار سے منفرداً وصول نہیں کی جاتی بلکہ گاؤں کے مشترکہ پٹہ داروں سے جو مشترکہ اور منفردہ طور پر اس کی ادائی کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن عملاً مالگذاری فرداً فرداً وصول کیجا سکتی ہے۔ پنجاب کے کسانوں کی عموماً وہی حالت ہے جو بمبئی اور مدراس کے کسانوں کی ہے۔

(۳) رعیت داری بند و بست۔ ہر شخص منفرداً زمین کا مالک ہوتا ہے۔ جیسا کہ مدراس، بمبئی اور برار میں ہے۔ آسام اور کورگ میں بھی رعیت واری بند و بست ہی ہے۔ لیکن سرکاری طور پر اس کو رعیت داری بند و بست نہیں کہا جاتا۔

تشخیص مالگذاری کا اصول۔ محال داری طریقہ میں (بشمول پنجاب) مالگذاری فنی حیثیت سے جائداد کی خالص آمدنی کا ایک جزو سمجھی جاتی ہے۔ یہ آمدنی جائداد کی حقیقی آمدنی اور بعض متفرق منافعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو بنجر زمینات، میوے اور جنگلی پیداوار سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس آمدنی میں حکومت کے حصہ کی مقدار وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے۔ ابتدا میں اس کی شرح بہت زیادہ تھی ۱۸۳۳ء میں ۶۶ فیصدی گھٹادی گئی ۱۸۵۵ء میں سہارنپوری قاعدہ کے تحت اس میں مزید ۵۰ فیصدی کمی کردی گئی۔ سرکاری بیانات کے مطابق اس آمدنی میں جو حصہ حکومت کو حاصل ہوتا ہے وہ اکثر صورتوں میں ۵۰ فیصدی سے کم ہے۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب میں حکومت کے حصہ کو خالص پیداوار کے ۲۵ فیصدی تک کم کر دیا گیا۔ مدراس میں نظری حیثیت سے تشخیص مالگذاری کا اصول خالص پیداوار کی قیمت پر مبنی ہے۔ (یعنے اصلی پیداوار میں سے اخراجات کاشت منہا کرنے کے بعد) اس کا تقریباً نصف حصہ مالگذاری کی زیادہ سے زیادہ شرح ہے۔ بمبئی اور برار میں تشخیص مالگذاری کا کوئی مقررہ اصول نہیں ہے۔ یہاں کا مروجہ طریق تجربہ اور بعض عام معاشی حالات پر منحصر ہے۔ موجودہ زمانہ میں بیع اور اجارہ داری کے قدیم دستاویزات پر زرلگان کے تعین کا اصول قرار دیا گیا ہے۔ سندھ میں مالگذاری کی شرح بارش پر نہیں بلکہ

ذرائع آبپاشی پر منحصر ہے۔ کیونکہ بارش یہاں بہت ہی قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ صوبہ بمبئی کے مقابلہ میں بندوبست کی میعاد بھی یہاں مختصر ہے۔

اراضی اور حکومت کی ملکیت۔ ہندوستان میں مالگذاری کے تعلق سے حسب ذیل دو اہم مسائل مابہ النزاع ہیں۔

اول یہ کہ اراضی آیا حکومت کی ملکیت ہے یا انفرادی ملکیت۔ دوسرے مالگذاری محصول ہے یا لگان۔ حکومت کی ملکیت کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ برطانوی اقتدار سے قبل حکومت وقت کبھی تنہا ملکیت اراضی کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس لئے برطانوی حکومت سابقہ حکومتوں کی جانشین ہونے کی بنا پر اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کرسکتی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دور حکومت میں قطعی طور پر خانگی ملکیت تسلیم کیگئی تھی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب مغلیہ سلطنت کو زوال آیا تو مختلف غاصب حکومتوں نے زمین کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ برطانوی حکومت ہند نے ہر جگہ زمین کی خانگی ملکیت کا حق تسلیم کیا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے رقبوں (مثلاً بنگال اودھ اور تمام شمالی ہند) میں زمینداروں کی ملکیت کے حقوق تسلیم کرلئے گئے ہیں۔ رعیت داری طریق کے صوبوں مثلاً بمبئی میں بھی رعیت یا قابض کی حالت زمیندار سے مختلف نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ مالگذاری ادا کرتا رہتا ہے زمین کی ملکیت کے تمام حقوق اسکو حاصل رہتے ہیں

بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں زمین کی ملکیت کے متعلق جو نظریہ ہے وہ دراصل انگلستان کے اصول اور دوسرے ممالک کے اصولوں کی گویا ایک درمیانی صورت ہے۔

مالگذاری محصول ہے یا لگان۔ اگر زمین کی ملکیت خانگی تسلیم کرلی جائے تو اس سے بظاہر یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ مالگذاری محصول ہے لگان نہیں ہوسکتا۔ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس کا کوئی قطعی حل پیش نہیں کیا جاسکتا۔ بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اراضی پر حکومت کی ملکیت تسلیم کرلی جائے تو اس حق کو بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ حکومت کو کامل معاشی لگان کی وصولی کا بھی اختیار حاصل ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جس سے ہم کلیتہً

نیچے نہیں سکتے۔ اس لئے کہ یہ الیات کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ محصول ادا کرنے والے کی معاشی حیثیت کو متاثر کئے بغیر عملاً ہر قسم کا کامل معاشی لگان محصول میں شامل ہو جا سکتا ہے بشرطیکہ معاشی لگان کو اجرت، منافع اور سود سے ممیز کیا جا سکے۔ اسی طرح حکومت کے عدیم ملکیت کے تصور کے اساس پر غیر معاشی کھیت کو بھی مالگذاری سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

نظریہ رکاڈو اور ہندوستان میں مسئلہ مالگذاری - جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے تشخیص مالگذاری کے اصول عام حالات کے تحت ہر صوبہ میں مختلف ہیں۔ اور حکومت کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ تمام برطانوی ہند میں مالگذاری کو معاشی لگان کے ایک مناسب اساس پر مقرر کیا گیا ہے لیکن اگر ہندوستان کے بہت سے غیر معاشی کھیتوں کی نسبت تحقیق کی جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ صورت حال وہ نہیں ہے جس کا دعویٰ حکومت نے کیا ہے حقیقت میں یہاں زمین کا اس قدر محصول حاصل کر لیا جاتا ہے۔ کہ کسان کے پاس زندگی گزارنے کے اقل ترین ذرائع باقی رہ جائیں کسی اور مقام پر خالص لگان کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا زمین پر غیر معمولی بار مسابقت اور پیشیوں کی کمی کے باعث لگان کی شرح اراضی کے حقیقی محصول سے بلند تر ہونا ممکن ہے۔ زرعی اغراض کے لئے روپیہ لگانے کا ردایاتی نقطۂ نظر معاشی ضرورت کی مزید تقویت کا باعث ہے۔ رکاڈو کے نظریہ کے لحاظ سے تشخیص مالگذاری کو معاشی لگان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اگرچہ کہ کسی حالت میں بھی مالگذاری کو اکتسابی آمدنی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اصلاح کی ضرورت - ہندوستانی محصول اندازی کی تحقیقاتی کمیٹی بابتہ ۲۵-۱۹۲۴ء کی تجویز کے مطابق معیاری شرح مالگذاری میں زمین کی سالانہ قیمت کے لحاظ سے ۲۵ فیصدی تک کمی کرنے کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے۔ زمین کی سالانہ قیمت سے مراد مجموعی پیداوار میں سے کاشتکار کے اخراجات اور اس کے خاندان کے مصارف اور اس کے معاوضہ محنت کا منہا کر دینا ہے یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تشخیص مالگذاری پر نظرثانی

کرنے کا طریقہ صوبہ پنجاب کے منظور شدہ قانون بابتہ ۲۹-۱۹۲۸ء کے مطابق دستور ساز جماعت کے ذمہ کیا جائے تشخیص مالگذاری کی میعاد چالیس سال اور حکومت کا حصہ خالص پیداوار کا پچیس فیصدی مقرر کر دیا جائے۔

اسی اصول کے تحت صوبہ متحدہ اور صوبہ متوسط میں قوانین منظور ہو چکے ہیں ۱۹۳۹ء میں بمبئی کی مجلس قانون ساز میں بھی ایک مسودہ قانون، قوانین مالگذاری کی ترمیم کی نسبت پیش کیا گیا تھا اور ۱۹۴۱ء میں اس کا نفاذ چند منتخبہ رقبہ جات میں عمل میں آیا ہے۔

حیدرآباد کا نظام مالگذاری - جب نواب سرسالار جنگ اوّل (۱۸۵۵ء) میں مدارالمہام ہوئے تو مملکت کا نظم و نسق صرف دو دفاتر واقع بلدہ میں انجام پاتا تھا۔ یہ دو دفاتر یعنے دفتر مال و دفتر دیوانی دفترداروں کی نگرانی میں تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ مملکت کے حسابات اور عطائے جاگیرات کا رجسٹر مرتب رکھیں۔ اس وقت تک حکومت کا صرف یہ کام تھا کہ مال گزاری وصول کرے۔ وصول مالگذاری کا طریقہ یہ تھا کہ ملک یا تو ٹھیکداروں کو دیا جاتا تھا یا زمینداروں ہی کو بغرض انتظام تفویض کیا جاتا تھا۔ یہ زمیندار اراضیات کو مزروعہ کرانے اور آبادی اور توفیر محاصل میں کوشش کرتے اور کاشتکاروں سے من مانے محاصل وصول کرتے تھے۔ نقدی محصول کا رواج نہ تھا بلکہ بٹائی یعنی پیداوار کا ایک مناسب حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ یہ اس زمانہ کا ایک بدترین نظام تھا۔ جس میں درمیانی اشخاص رعایا کو لوٹتے اور دولت فراہم کرتے تھے۔ اور حکومت کے خزانہ میں ایک مختصر رقم پیش کر دیا کرتے تھے اور حکومت کو ہمیشہ قرض لیکر کام چلانا پڑتا تھا۔

سرسالار جنگ نے اپنے اصلاحات کی ابتدار بتدریج اس طرح کی کہ وصول مالگذاری کے اس طریقہ کو برخاست کر کے ایسے عہدہ دار مقرر کئے جن کی تنخواہ خزانۂ شاہی سے ادا کیجاتی تھی۔ یہ عہدہ دار تعلقدار کہلاتے تھے۔ تعلقدار جو اس طرح پر مدارالمہام کے تحت ہوتے تھے ہمیشہ سرکار سے طالب ہدایت ہوتے تھے۔ لہذا ایک جدید دفتر جس کا نام منشی خانہ تھا۔ قائم کرنا پڑا۔ جس کا کام یہ تھا کہ مدارالمہام اور تعلقداروں کے مابین مراسلت کا ذریعہ بنا رہے۔

۱۸۶۵ء میں منشی خانہ برخاست کرکے اس کی جگہ مجلس مالگذاری کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ کل علاقہ دیوانی کی مالگذاری کی نگرانی اور انتظام کرے۔ اس وقت ممالک محروسہ کی تقسیم اس طرح تھی کہ ملک ضلعوں میں منقسم تھا۔ ہر ضلع میں کئی تعلقے اور ہر تعلقہ میں کئی گاؤں ہوتے تھے۔ ہر تعلقہ میں ایک تحصیلدار مقرر تھا۔ جس کا بڑا کام وصول مالگذاری اور دیوانی و فوجداری مقدمات کا تصفیہ تھا۔ ہر تعلقہ اور ضلع میں سرکاری خزانے قائم کئے گئے اور متعلقہ تحصیلدار اور تعلقدار کے ماتحت رکھے گئے۔

۱۸۶۷ء میں جدید قائم شدہ اضلاع کے پانچ صوبہ جات بنائے گئے۔ جن میں سے ہر ایک پر ایک صدر تعلقدار مقرر ہوا۔ اس کے بعد مالگذاری کا ایک صدر المہام بھی مقرر ہوا۔

۱۸۶۹ء تک پٹیل اور پٹواریوں کو ان کے خدمات کا صلہ یا انعام بشکل اراضی دیا جاتا تھا۔ اس سال سے ان کے انعامات ضبط کرلئے گئے اور ان کو مالگذاری وصول شدہ پر ایک مقررہ اسکیل کے تحت فیصدی رقم دی جانے لگی اور جو اراضی انعام ان کے قبضہ میں تھی اسکی جمع مشخص کرنیکے بعد اس شرط سے ان کے قبضہ میں رہنے دیگئی کہ وہ محصول سرکار ادا کیا کریں۔

مجلس مالگذاری ۱۹۰۱ء تک قائم رہی اس کے بعد اس کو برخاست کرکے معتمدی مال قائم کیگئی۔ ۱۹۱۰ء میں ڈائرکٹر جنرل و معتمد کا عہدہ قائم ہوا۔

انتظام مالگذاری۔ مملکت کی اراضی باعتبار نوعیت قبضہ دو عام قسموں میں منقسم ہوسکتی ہے۔

(۱) وہ اراضی جو راست سرکاری انتظام کے تحت ہے اور جس کی آمدنی خزانۂ شاہی میں داخل ہوتی ہے۔ یہ اراضی دیوانی یا خالصہ کہلاتی ہے۔

(۲) وہ اراضی جس کی آمدنی کلی یا جزئی طور پر کسی خاص غرض کے لئے دیدی گئی ہے۔

دوسری قسم کی اراضی ذیل کی دو قسموں پر مشتمل ہے۔

(الف) وہ اراضی جو صرف خاص سے موسوم ہے یہ اراضی اعلیٰ حضرت کی ملک ہے اور

اس کی آمدنی مصارف خاص اعلیٰ حضرت میں صرف ہوتی ہے ۔

(ب) یہ اراضی شاہی عطیہ ہے اور اس کی آمدنی کلی یا جزئی طور پر کسی شخص یا اشخاص کو بطور جاگیر یا انعام دی گئی ہے ۔ اراضی دیوانی پر رعایا کا قبضہ رعیت داری طریقہ پر مشتمل ہے جو دو کروڑ ایکڑ یا مملکت کی پچاس فیصدی سے زیادہ زمین ، زمینداروں کے قبضہ میں اسی طریقہ پر ہے ۔ یہ زمیندار وہ ہیں جن کو کوئی خاص عطیہ یا خاص استحقاق زمین کے متعلق نہیں ہے ۔ یہ طریقہ بالکل علاقہ بمبئی کے طریقے کی نقل ہے ۔

طریق متذکرہ صدر کے مطابق ہر ایک کھیت ایک زمین مقبوضہ سمجھی جاتی ہے ۔ جو اصطلاحاً سروے نمبر کے نام سے مشہور ہے جو رعیت کو راست سرکار کی جانب سے دیا گیا ہے جو زمیندار کہ ایک کھیت پر قابض ہے خواہ وہ ایک شخص ہو خواہ چند حصہ دار ہوں وہ درج رجسٹر شدہ قابض یا پٹہ دار کھاتہ دار کہلاتا ہے ۔ حق قبضہ اس بات پر منحصر ہے کہ پٹہ دار برابر سرکاری لگان ادا کرتا رہے ۔ اگر وہ سرکاری مطالبہ ادا نہ کرے تو اسکا حق ساقط ہو جاتا ہے اور زمین بحق سرکار ضبط ہو جاتی ہے ۔

ہر ایک کھیت یا سروے نمبر پر لگان علحدہ مشخص ہو کر ۳۰ سال تک وہی لگان مقرر رکھا جاتا ہے ۔ جن زمینوں میں ذرائع آبپاشی نہیں ہیں ۔ یا جن کی آبپاشی باولیوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے ۔ لگان ایک مقررہ سالانہ رقم ہوتی ہے ۔ اور فصل خراب ہونے یا زمین بلا کاشت پڑے رہنے کیوجہ سے کوئی معافی نہیں دی جاتی ۔ لیکن جن زمینوں کی آبپاشی تالابوں یا ندیوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے ۔ اگر ان میں پانی نہ ہو تو سالانہ معافی دیجاتی ہے ۔ جدید بندوبست کے وقت معاشی حالات کے لحاظ سے شرح لگان پر نظر ثانی کی جاتی ہے ۔ لیکن اگر پٹہ دار نے اپنے صرفہ سے زمین کو ترقی دی ہو تو لگان کی شرح میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاتا ہے ۔

باقاعدہ مدت قبضہ ایکساں ہوتی ہے ۔ لیکن اگر پٹہ دار سرکاری لگان اور مطالبات برابر ادا کرتا رہے ۔ تو وہ زمین پر غیر معین مدت تک قبضہ رکھ سکتا ہے ۔ پٹہ دار کو یہ حق ہے

کہ وہ اپنے کھیت کے متعلق مکانات بنانے باولیوں کی تعمیر اور مرمت کرے یا اور طرح پر زراعت کو ترقی دے۔ لیکن زراعتی زمین اغراض زراعت کے سوا دوسرے کاموں میں بلا سرکاری منظوری کے نہیں لائی جاسکتی۔

صرف خاص مبارک۔ یہ اراضی شاہی ملک ہے اور اس کی آمدنی فرماں روا کے ذاتی مصارف میں صرف ہوتی ہے۔ مملکت ہذا میں اعلیٰ حضرت کے ذاتی مصارف کے لئے خزانۂ دیوانی سے نقد رقم دی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ اس ادائی میں بہت بے قاعدگی ہونے لگی اس لئے ناصر الدولہ کے زمانۂ حکومت میں دیوانی سے بعض اراضی الگ کرکے ذاتی انتظام میں لے لی گئی۔ اراضی صرف خاص کا انتظام ایک علحدہ سررشتہ سے متعلق ہے جو ایک صدر المہام کے تحت ہے۔ جو راست اعلیٰ حضرت کے تحت کام کرتے ہیں۔

علاقہ صرف خاص مبارک کا کل رقبہ ۱۲۳۱۷ مربع میل ہے جو ۱۸۹۴ دیہات پر مشتمل ہے۔ صرف خاص مبارک کی مالگذاری ایک کروڑ روپے وصول ہوتی ہے۔ اراضی صرف خاص بہ اغراض انتظامی دو قسموں میں منقسم ہے۔

(۱) مفوضہ علاقے۔ جو بغرض انتظام دیوانی کے تفویض کئے گئے ہیں اور جن کا انتظام منجانب سررشتۂ صرف خاص عہدہ داران دیوانی کرتے ہیں۔ مصارف انتظام وضع کرنے کے بعد ان تعلقات کی خالص آمدنی صرف خاص میں جمع کی جاتی ہے۔

(۲) زیر نگرانی۔ ان تعلقات میں ضروری عملہ کا تقرر اور اس کی تنخواہ کی ادائی علاقہ صرف خاص سے ہوتی ہے۔ اور عہدہ داران دیوانی کی صرف عام نگرانی ہے۔

پائیگاہ۔ نواب نظام علی خاں نے ابوالخیر خاں کو فوج رکھنے کے لئے جاگیر دی تھی۔ یہ فوج حضور کی فوج کہلاتی تھی۔ اور اس وجہ سے اس کا نام جاگیر پائیگاہ ہوا۔ پائیگاہ کا رقبہ ۳۵۰۱ مربع میل ہے۔ جو ۱۰۴۲ دیہات پر مشتمل ہے۔ اور سالانہ ۵۷ لاکھ روپے مالگذاری وصول ہوتی ہے۔

جاگیر - جاگیر ایک یا چند مواضع کی عطا ہوتی ہے۔ جو کسی نمایاں خدمت کے صلہ میں یا صرف معطی لہٗ کی شان وشوکت قائم رکھنے کے لئے دی جاتی تھی۔ اس کی حسب ذیل قسمیں ہیں۔

(الف) التمغا جاگیر - التمغا سے وہ جاگیر مراد ہے۔ جو معافی مالگذاری شاہی مہر سے دی جاتی تھی۔ یہ ایک مستقل دوامی اور موروثی جاگیر ہے۔ اور اس کے حقوق بذریعہ بیع عطا یا ہبہ منتقل نہیں ہوسکتے ہیں۔ بصورت عدم موجودگی ورثا یہ جاگیر داخل سرکار ہوجاتی ہے۔

(ب) ذات جاگیر - بڑے بڑے رقبہ جات زمین کی یہ عطا محض بغرض پرورش معطی لہٗ ہوتی تھی۔ اور اس میں خدمت کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔

(ج) تنخواہ جاگیر - جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ عطا معطی لہٗ کے خدمات کی تنخواہ کے طور پر دی جاتی تھی۔ اس قسم کے جاگیروں کی بڑی تعداد سرکار میں لے لی گئی ہے

(د) مشروطی جاگیر - کسی خاص مذہبی، دیوانی یا فوجی خدمت کی ادائی کے لئے یہ عطا قائم کیگئی۔ اور اس وقت تک باقی رہتی ہے کہ شرط عطا پوری ہو۔

(ھ) مدد معاش جاگیر - یا تو معطی لہٗ کی پرورشی کے لئے دی جاتی ہے۔ جن کے نام دیگر مشروطی عطا ہو یا ان کے دیگر ذرائع معاش کے علاوہ ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں جاگیرات کی تعداد تقریباً ۵۱۶۴ ہے۔ اس کے رقبہ کا اندازہ نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ دو تہائی جاگیرات کی ابھی پیمائش و بندوبست ہونا باقی ہے۔

سمستان - مسلمان فاتحین کا یہ قاعدہ تھا کہ جن رؤسا وغیرہ پر وہ فتح حاصل کرتے تھے ان سے سالانہ ایک مقررہ رقم بطور خراج لیتے تھے۔ اور ان کو اپنے ملک کا انتظام بلا مداخلت کرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ جب تک کہ وہ خراج برابر ادا کرتے رہیں اس خراج کا نام پیش کش تھا۔ اور جس راجہ یا رئیس پر یہ لگایا جاتا تھا اُس کو پیش گذار کہتے تھے۔ اس وقت ممالک محروسہ میں حسب ذیل پیش کش گذار ہیں:-

(۱) گدوال۔ (۲) ونپرتی (۳) جٹپول۔ (۴) امر چنتہ۔ (۵)۔ گوپال پیٹ۔ (۶) پاپنا پیٹ۔ (۷) دوم کنڈہ (۸) پالونچہ (۹) گرگنٹہ۔

سمستانوں کے مواضعات کی تعداد (۶۶۰) ہے جس سے تقریباً ۲۵ لاکھ سالانہ مالگذاری وصول ہوتی ہے۔

تشخیص مالگذاری: تلنگانہ میں اراضی خشکی کی مالگذاری ۱۵ر۶ر۸ فی ایکڑ ہے، اور زیر نہر دو فصل تری کے لئے ۱۲ر۵ فی ایکڑ ہے۔ باغات کے لئے ۶ر۸ فی ایکڑ مقرر ہے۔ اضلاع مرہٹواڑی میں خشکی کے لئے ۱۱ر۲ر۸ اور تری زمینات کے لئے (۲ر۸ر۹) ہے۔ سمت کرناٹک میں ۹ر۶ اراضی خشکی کے لئے، تری زمینات کے لئے ۵ر۱۰ر۸ اور اراضی باغات کے لئے ۳ر۷ر۸ ہے۔

واضح رہے کہ برطانوی ہند کے ہمسایہ اضلاع سے یہ شرح کم ہے۔ گذشتہ تیس سال سے مملکت کے مالگذاری کی یہ پالیسی رہی ہے کہ اگر کسی سال فصل تلف ہوجائے یا بارش کم ہو یا قحط سالی ہوجائے تو معافیات دی جاتی ہیں۔ اُصول یہ رکھا گیا ہے کہ مصارف کاشت وضع کرنے کے بعد منافع کا نصف حصہ سرکاری حق کے طور پر وصول کیا جاتا ہے۔

مسئلہ قولداری۔ حکومت نے تحفظ حقوق قولداران کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ جس نے اِس امر کی سفارش کی کہ قانون تحفظ قولداران کا فوری نفاذ عمل میں لایا جائے۔ مجلس مقننہ نے مسودہ مذکور کو ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ جب یہ مسودہ قانون کی حیثیت حاصل کرلے گا تو قولداران کے حقوق کا بڑی حد تک تحفظ ہوسکے گا۔ اور اُن کی حالت بہتر ہوجائے گی۔

تری کے لگان کی کمیٹی۔ اِن شکایات کے پیش نظر کہ مملکت آصفیہ میں تری کے لئے لگان زائد ہے۔ حکومت نے صدر المہام بہادر مال کی صدارت

میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ تاکہ وہ اس مسئلہ کے ہر پہلو کی چھان بین کر کے رپورٹ پیش کرے۔ کمیٹی نے ایک سوال بند کے ذریعہ تمام مفادات کے نمایندوں کی تحریری و زبانی شہادت حاصل کی ہے۔ اور اس کی رپورٹ زیر ترتیب ہے۔
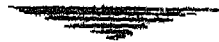
چوتھا باب

صنعتی ترقی

صنعتی ترقی کے فوائد | اس زمانہ میں سب کا یہی مقصود ہے کہ ہندوستان ایک اہم صنعتی ملک بن جائے۔ اس قسم کی ترقی سے ملک کو بہت سے فوائد کی توقع ہے۔

(۱) موزوں صنعتی ترقی سے آبادی مختلف پیشوں میں مناسب طور پر تقسیم ہوجائیگی اور معاشی نظام مستحکم بنیادوں پر قائم ہوجائیگا۔ مثال کے طور پر قلت بارش کی وجہ سے ہندوستان میں جو قحط پڑا کرتا ہے اس سے صنعتی آبادی براہ راست متاثر نہیں ہوگی آبادی کا صرف وہی حصہ متاثر ہوگا جو زراعت میں مشغول ہے۔ اور زرعی آبادی صنعتی ترقی کی وجہ سے بڑی حد تک گھٹ جائیگی

(۲) صنعت کی تدریج قوم کی دولت مندی میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔

(۳) عوام میں ادائی محصول کی بڑھتی ہوئی صلاحیت سے حکومت افادہ حاصل کرسکیگی۔

(۴) صنعت و حرفت عوام میں مختلف النوع صلاحیتوں کے حصول کا موقع بہم پہونچاتی ہے اور ان میں جدت مستعدی اور ترقی کی امنگ پیدا کرتی ہے۔ ایک خالص زرعی ملک میں قدامت پرستی اور دماغی انحطاط پیدا ہوجاتا ہے۔

(۵) صنعت کی تدریج سے معیشت کے کئی جدید ذرائع مہیا ہوجاتے ہیں اور اس سے متوسط طبقہ کے مسئلہ بے روزگاری کو بڑی حد تک حل کیا جاسکتا ہے۔

(۶) اس سے لوگوں میں دولت جمع کر رکھنے کی بجائے پیداوار اغراض میں سرمایہ لگانے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

(۷) اب تو یہ امر عام طور پر مسلم ہو چکا ہے کہ کسی ملک کی حربی کارکردگی میں صنعت کی ترویج کو بڑا دخل ہے۔

ہندوستان کی حالیہ صنعتی تاریخ کی چند عہد آفریں خصوصیتیں | انیسویں صدی کی ابتداء تک ہندوستان زرعی اور صنعتی ملک بھی تھا۔ صنعتی انقلاب سے قبل یورپ کی جو حالت تھی وہی حالت ہندوستان کی بھی تھی جدید طرز بہ پیمانہ کبیر کی کوئی صنعت نہ تھی جو صنعتیں موجود تھیں ان کی نوعیت زیادہ تر گھریلو صنعتوں کی تھی۔ تاہم آبادی کا ایک بڑا حصہ صنعتی کاروبار میں مشغول تھا۔ اور صنعتی ترقی او ہنرمندی میں ہندوستان مغربی ممالک سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ فی الحقیقت ہندوستان کو صنعت و حرفت کے میدان میں بہت سے یورپی ممالک پر بجا طور سے فوقیت حاصل تھی۔ اس سے پہلے ان امور پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ کس طرح ہندوستان اپنے بلند صنعتی معیار سے نیچے اتر کر محض ایک زرعی ملک بن کر رہ گیا۔ یہ صورت حال مختلف نقاط نظر سے افسوسناک تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۸۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء کے قحط کمیشنوں نے ہندوستان میں ترویج صنعت کے مسئلہ پر زور دیا تاکہ ملک میں آئے دن جو قحط واقع ہوتے ہیں ان کا سدباب ہو سکے۔ سودیشی تحریک سے جس کا ۱۹۰۵ء میں آغاز ہوا یہ سبق حاصل ہوا کہ جدید صنعت کے لئے عارضی سیاسی جوش کے بجائے زیادہ مستحکم بنیادوں کی ضرورت ہے۔ اور ایسی بنیاد مہیا کرنے کے لئے حکومت کی مستقل اور موزوں امداد لازمی ہے۔

حکومت کی صنعتی پالیسی | انیسویں صدی کے اختتام تک حکومت کی پالیسی ملک کی صنعت کے لئے معین و مددگار نہیں تھی بلکہ ملک کی صنعتی ترقی سے حکومت بے تعلق سی تھی۔ اس پالیسی میں تبدیلی اس وقت ہوئی کہ جبکہ لارڈ کرزن کے ایما سے ۱۹۰۵ء میں سررشتۂ تجارت و حرفت کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس خوش آیند صورت حال میں بہت جلد ایک بے عملی سی پیدا ہو گئی جبکہ سنہ ۱۹۱۰ء میں لارڈ مارلے وزیر ہند نے اپنے مشہور مراسلہ کے ذریعہ ملک کی صنعتی ترقی کے سلسلہ میں حکومت کی براہ راست کوشش کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

ہندوستانی ارباب اقتدار نے لارڈ مارلے کے حکم کی گویا لفظاً تعمیل کی اور صنعت و حرفت کے احیاء کے لئے سودیشی تحریک کی بناء پر جو جوش عمل پیدا ہوا تھا۔ اس کو کسی عملی صورت میں بدلنے سے قاصر رہے۔

جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے تجربوں نے حکومت کو نہ صرف معاشی بلکہ حربی اعتبار سے بھی ترویج صنعت کی اہمیت کا اندازہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ مانٹگو چیمس فورڈ رپورٹ میں درج ہے کہ "صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک کی پیداوار کو موجودہ زمانہ میں گو بلحاظ مقدار نہیں لیکن بہ لحاظ نوعیت سامان حرب کے ساتھ زیادہ قریبی مناسبت ہے۔ کہ ہندوستان کے قدرتی ذرائع کی ترقی تقریباً فوجی ضرورت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔" صنعتی کمیشن نے جو ۱۹۱۶ء میں مقرر ہوا تھا ملک کی صنعتی ترقی میں حکومت کی جانب سے نمایاں امداد اور ملک کو اس خصوص میں خود مکتفی بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔

۱۹۱۷ء میں ہندوستانی مجلس اسلحہ قائم کی گئی۔ جنگ کے کامیاب اختتام کی خاطر ہندوستانی معاشی ذرائع کی نگرانی اور ان کو ترقی دینا اس مجلس کا اصلی کام تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی کارخانوں میں سامان حرب کی فراہمیات اور اپنے ماہرانہ مشوروں سے ان کو معلومات فراہم کر کے یہ مجلس ہندوستانی صنعت کے ارتقاء کی موجب بنی۔

تامین اور حکومت کی امداد کی دوسری صورتیں

تامین ہندوستانی صنعتوں کو جنگ (۱۹۱۴-۱۸ء) کے زمانہ میں جو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا اس کی نوعیت یقیناً عارضی تھی۔ جنگ کے بعد بیرونی مسابقت کا دوبارہ آغاز ہوا اور تامین کے مسئلہ کو بہت بڑی عملی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ۱۹۲۱ء میں فسکل کمیشن قائم ہوا اس کمیشن نے امتیازی تامین کی پالیسی اختیار کرنے کی سفارش کی جس کے تعین کا اختیار ایک موزوں ٹیرف بورڈ کو حاصل ہو۔ یہ سفارشات منظور کر لی گئیں اور ۱۹۲۳ء میں ایک مستقل ٹیرف بورڈ قائم ہوا۔ حکومت کی ہدایت کے تحت اس بورڈ نے بہت سی ایسی

صنعتوں کی جانچ پڑتال کی جو تامین کی مستحق ہیں۔ اس طرح لوہے، فولاد، کپاس، کاغذ، شکر، نمک، دیاسلائی اور دوسری صنعتوں کو تامین عطا کی گئی۔

امتیازی تامین کی اصطلاح اس امر کی جانب رہبری کرتی ہے کہ صنعتوں کے مابین اس نقطۂ نظر سے فرق کیا جائے کہ کونسی صنعت کس ضروری امداد کے بغیر خود بخود ترقی کر سکتی ہے اور کونسی صنعت ضروری امداد مہیا ہونے پر ترقی کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ اصول معاشیات سے تعلق رکھتا ہے۔ کہ کسی قوم کے مفاد کے پیش نظر کن حالات اور کس قسم کے تحفظات کی خاطر تامینی پالیسی اختیار کی جانی چاہیئے۔ ہندوستان میں امتیازی تامین کا نفاذ ملکی حالات کے لحاظ سے ان ہی اصول کا ایک عملی انطباق ہے۔

دیگر لوازمات ترقی پذیر اور مفید صنعتوں کو وجود میں لانے کے لئے محض تامین کافی نہیں ہے اس کے لئے جدید معاشی نظام زندگی کے بعض ناگزیر لوازمات کی نشو ونما بھی ضروری ہے۔ مثلاً بنک کاری کی مستحکم تنظیم، ترقی یافتہ نظام حمل ونقل، ریلوے اور جہازرانی کا ہمدردانہ طریق عمل، مارکٹنگ کی موثر تنظیم، تجارتی اور صنعتی خبر رسانی کا موزوں نظام وغیرہ۔ صنعتی ترقی کے لئے دیگر امور کے علاوہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ لوگ اس کی جانب حقیقی طور پر راغب ہوں اور اس مقصد کے حصول میں ناگزیر تکالیف برداشت کر کے اپنے خلوص کا اظہار کریں۔ اس جانب بے حسی بہت کم، خود اعتمادی اور اولوالعزمی بہت زیادہ ہونی چاہیئے۔ موجودہ زمانہ میں ان صفات کے فقدان کی ذمہ داری بڑی حد تک ہمارے ناقص طریقۂ تعلیم پر ہے۔ جو خالص علمی ہونے کی وجہ ہم کو زندگی کے عملی حقائق سے بے بہرہ رکھتا ہے۔ صنعتی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ فنی اور تجارتی ادارے اور کلیات بڑی تعداد میں قایم کئے جائیں تاکہ کاروباری ذہنیت رکھنے والے اشخاص کو موقع ملے کہ وہ اپنی استعداد کو ترقی دے سکیں۔ تحقیقاتی کام کی تنظیم بھی ایک دوسرا اہم مسئلہ ہے جو خاص توجہ کا محتاج ہے۔

ہندوستانی صنعتوں کی ترقی کیلئے حکومت کی سرپرستی بہت ہی اہم محرک ثابت ہوگی

اس خصوص میں مستقل طور پر تدریجی ترقی ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش رفت میں ایک خاص سررشتہ موسوم بہ "انڈین اسٹور ڈپارٹمنٹ" قائم کیا گیا ہے تاکہ منجانب حکومت ملکی مصنوعات کو خرید کر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ چنانچہ سالانہ تین کروڑ روپیہ اس سررشتہ کے توسط سے ہندوستانی مصنوعات خریدنے پر صرف کئے جاتے ہیں۔ صنعتی کمیشن کی سفارش پر صوبہ جاتی صنعت و حرفت کے سررشتے قائم کئے گئے ہیں جن کا مقصد یہ بھی ہے کہ فنی اور صنعتی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ صنعتی معلومات اور مالی امداد کی فراہمی بھی ان کے فرائض میں شامل ہے۔ صنعت و حرفت کی امداد کے لئے خاص قوانین بھی منظور ہوئے ہیں۔ مثلاً پنجاب کا قانون قرضہ ہائے صنعتی تاکہ مستحق خانگی صنعتی اداروں کو مالی امداد منظور کی جائے۔ بہر حال اس قوانین سے پیمانہ کبیر کی صنعتوں کی بجائے گھریلو صنعتوں کو زیادہ امداد پہنچ رہی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں صوبہ متحدہ اور بنگال میں حکومتی امدادی قرضہ کی اسکیم کا نفاذ عمل میں آیا۔

زمانہ جنگ میں حکومت کی صنعتی پالیسی | جس طرح گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں صنعتی ترقی کے لئے ایک نیا میدان نکل آیا تھا۔ اسی طرح اس جنگ میں بھی صنعتی ترقی کے بہت کچھ امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ بلا کسی تابعی ممالک کے تمام صنعتی اشیاء کی درآمد بند ہو گئی ہے اور حکومت نے اس کا اطمینان دلایا ہے۔ کہ وہ آئندہ بھی صنعتی ترقی کے لئے کوشاں رہے گی۔ ایک بورڈ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کا قیام عمل میں آیا ہے اور اسی کے ساتھ ایک انڈسٹریل ریسرچ فنڈ بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس بورڈ کا کام یہ ہے کہ حکومت کو مشورہ دیں کہ کن نقاط پر صنعتی ترقی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں محکمہ رسد قائم کیا گیا اور اس کے دو شعبہ جات کئے گئے ایک شعبہ اسلحہ سازی اور دوسرے سوتی، اونی، اور چمڑے کے گودام اور صنعتوں سے متعلق کیا گیا۔

۱۹۳۹ء میں چیٹ فیلڈ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان بھی عصری فوج کے تمام متعلقہ ساز و سامان کو فراہم کرے اور یہ تمام سامان جنگ ہندوستان ہی میں تیار کئے جائیں۔ ۱۹۴۰ء میں روپ مشن ہندوستان آیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان

میں اسلحہ اور فوجی ضروریات کی جلد سے جلد تیاری ہو تاکہ ہندوستان اپنی دفاعی ضروریات کی تکمیل پوری کرے۔ اس مشن نے ہندوستانی کارخانوں کا تفصیلی معائنہ کیا اور ان کی امداد و ترقی کے لئے ۱۹۴۱ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

۱۹۴۰ء میں ایسٹرن گروپ سپلائی کونسل قائم ہوئی تاکہ حکومت برطانیہ کو مشرقی زیر اثر ممالک زیادہ تعداد میں صنعتی اشیاء فراہم کر سکیں۔ اور یہ ممالک ایسی حکمت عملی اختیار کریں جن سے باہمی مسابقت نہ ہونے پائے۔

۱۹۴۲ء میں ٹکنیکل مشن امریکہ سے ہندوستان آیا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ہندوستان کو مشنری اور کلیدی صنعتوں کے قیام کے لئے جن جن لوازمات کی ضرورت ہو روانہ کریگا۔ اس نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں۔

(۱) جنگی پیداوار پر نگرانی قائم کی جائے۔

(۲) الکحل، برقی قوت، فولادی صنعت، ربر، الومنیم اور گندک کی ترقی کیلئے تحقیقات کی جائے۔

(۳) ہندوستانیوں کو مختلف مصنوعات میں کام کرنے کی تربیت دی جائے۔

ان سفارشات کو روبہ عمل لانے کے لئے حکومت نے ایک مجلس "وار سپلائی بورڈ" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں قائم کی۔ یہ بورڈ دوران جنگ میں پیداوار، حمل و نقل، ساز و سامان کی رسد بندی کے مسائل سے عہدہ برآ رہا۔ ان مساعی کے علاوہ حکومت نے فنی تربیت کی ایک وسیع اسکیم جاری کی ہے۔

حکومت سرکار عالی اور صنعتی ترقی سب سے پہلے سرسالارجنگ اول نے مصنوعات ملک کو ترقی دینے کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں ملکی مصنوعات کی ایک نمائش بمقام چادرگھاٹ بلدہ حیدرآباد منعقد کی گئی۔ اگرچہ کہ اس زمانہ میں بیرونی صنعتوں سے ملکی صنعتیں کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئیں تھیں۔ ریل اور عمدہ سڑکوں کے زیادہ نہ ہونے سے بیرونی مال زیادہ مقدار میں نہ آتا تھا تمام دفاتر سرکاری میں ضروریات سرکاری کے لئے عام طور پر ملک کا بنا ہوا سامان ہی مستعمل

ہوتا تھا۔ اہل ملک کا طرز تمدن ایسا تھا کہ مغرب کے بنے ہوئے سامان استعمال کرنے کی چنداں ضرورت نہ ہوتی تھی۔

سنہ ۱۸۸۱ء میں ناراین گوڑہ ورکشاپ قایم کیا گیا۔ اس کارخانہ میں لوہے اور پیتل ڈھالنے کے لئے انتظام کیا گیا۔ زرعی آلات کی تیاری کا کام بھی ہوتا تھا۔ سرسالار جنگ نے یہ قاعدہ بھی جاری کیا کہ اگر کوئی صناع کوئی نئی چیز ایجاد کرے تو اس کا حق ایجاد محفوظ رکھا جائیگا۔

برطانیہ حکومت کی "آزاد تجارت" کی پالیسی کی وجہ سے ممالک غیر کی مصنوعات دکن میں بھی داخل ہونے لگی تھیں۔ اس لئے سرسالار جنگ نے سنہ ۱۸۸۱ء میں محصول محترفہ موقوف کردیا اور بذریعہ گشتی تمام عہدہ داروں کو ہدایت کی کہ صناعوں کی امداد میں کوشش کریں اور ہر سال مصنوعات کی ترقی کے متعلق سرکار میں رپورٹ پیش کرتے رہیں۔ محصول محترفہ ایک قسم کا محصول تھا جو تمام صناعوں سے وصول کیا جاتا تھا جس سے سرکار کو سالانہ دو تین لاکھ روپے کی آمدنی ہوا کرتی تھی اگر محصول محترفہ سے صناعوں کو نجات نہ دلائی جاتی تو انکی حالت بہت خراب ہوجاتی۔

سرسالار جنگ کے بعد عمادالسلطنت کو قلمدان وزارت تفویض کیا گیا۔ انھوں نے شُشر پر سے محصول کو برخاست کردیا جسکی ادائی کے بغیر کوئی شخص شُشر نکالنے کا کام نہیں کرسکتا تھا۔ اس معافی کی بدولت اس پارچہ کی تیاری میں ترقی ہونے لگی۔ لیکن اس زمانہ میں اہل ملک کا طرز تمدن بدل گیا۔ امرائے ملک مغربی لباس کو ترجیح دینے لگے۔ اور مغربی فرش فرنیچر سے مکانوں کو آراستہ کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ سرکاری دفاتر میں فرش و فرنیچر اور سامان صادر یورپ کا ساختہ خریدا جانے لگا اور بار ی تقاریب میں انگریزی لباس زیب بدن ہونے لگا۔ ان سب باتوں کا اثر ملکی صنعت و حرفت پر نامناسب ہوا اور وہ تباہ ہوگئی۔

عمادالسلطنت سنہ ۱۸۸۷ء میں مستعفی ہوجانے پر سر آسمان جاہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے۔ عنان وزارت کو ہاتھ میں لیکر انھوں نے جو پہلا اعلان کیا۔ اس میں یہ بھی درج تھا کہ "ملک کی زراعت و تجارت کو جو ملک کی دولت کے دو وسیع چشمے ہیں ترقی دینا صنعت و حرفت کو جس میں اب

بہ نسبت سابق کے بہت کچھ انحطاط نظر آتا ہے سنبھالا'' انھوں نے برطانوی ہند کے اصول پر سررشتۂ زراعت و تجارت بھی قائم کیا۔ جس کے ذمہ صنعت و حرفت کا کام بھی تفویض کیا گیا۔ ورنگل میں ایک مدرسہ صنعت و حرفت قائم کیا گیا جو مملکت آصفیہ میں اپنی طرز کا پہلا مدرسہ تھا۔

سر آسمان جاہ کی سبکدوشی کے بعد ۱۸۹۲ء میں وقار الامراء وزیر اعظم بنائے گئے۔ ان کے دور میں چار صوبوں میں چار صدر مجلس بنائے گئے اور ان میں صنعت و حرفت کا کام سکھایا جانے لگا۔ اس زمانہ میں قحط اور طاعون کے مسلسل حملے ہوتے رہے جس کی وجہ سے حکومت کی مالی حالت کمزور ہوگئی تھی اور تمام اصلاحی تجویزیں ملتوی کر دی گئیں چنانچہ سررشتۂ زراعت و تجارت و حرفت کو تخفیف کر دیا گیا اور اس سررشتہ کا مفوضہ کام معتمدی مالگذاری کے تفویض ہوا۔ مختلف میلوں اور عرسوں میں جو رقم مصنوعات ملکی کی ترقی پر صرف کی جاتی تھی موقوف کر دی گئی

۱۹۰۱ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد مدار المہام مقرر ہوئے ۱۹۰۵ء میں لوکل فنڈ کے مصارف سے ایک نمائش مصنوعات و پیداوار بمقام باغ عام کھولی گئی۔ اورنگ آباد اور نظام آباد میں صنعت و حرفت کے مدارس قائم کئے گئے۔ بیدر میں بیدری مصنوعات اور نارائن پیٹ میں پارچہ بافی کا ایک چھوٹا مدرسہ لوکل فنڈ کے مصارف سے کھولا گیا۔ مذکورہ بالا چار مدارس کے ماسوا ایک اور نیم سرکاری ادارہ وکٹوریہ میموریل آرفنیج کے نام سے سرورنگر میں ۱۹۰۵ء میں گراں تر مصارف سے کھولا گیا۔ مدارس صنعت و حرفت قائم کرنے سے سرکار عالی کا یہ منشا تھا کہ اہل حرفہ کی اولاد یہاں تعلیم کے ساتھ پیشوں اور حرفتوں کی تعلیم بھی حاصل کرے اور ایسی تعلیم دی جائے کہ زمانۂ حال کی ترقیات اور سائنس سے استفادہ کیا جا سکے لیکن یہ مقصد پورا نہ ہو سکا

۱۹۰۵ء میں ممالک محروسہ کی مصنوعات پر سے محصول برآمد معاف کر دیا گیا۔ اس محصول کی سالانہ مقدار تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہوتی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں سررشتۂ حرفتی کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۱۶ء میں مشیروں کی ایک مجلس جس کے ۹ رکن تھے۔ چار سرکاری اور پانچ غیر سرکاری ترقی صنعت و حرفت کے معاملات میں سرکار کو مشورہ دینے کے لئے قائم ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۷ء کے اوائل میں ایک جدید سررشتہ تجارت و حرفت قایم ہوا تاکہ مملکت کی قدیم صنعتوں کی تجدید اور ان کی امداد نیز جدید صنعتوں کو ترقی دی جاسکے۔ اس زمانہ میں سرکار عالی نے اس امر کو تسلیم کیا کہ بعض صورتوں میں سرکار کا خود کارخانے جاری کرنا ضروری ہے۔ خصوصاً ایسی صنعتوں میں جو دوسروں کے لئے رہنمائی کا کام دیتی ہیں تاکہ جن لوگوں کو اس سے دلچسپی ہے ان پر یہ ثابت کیا جائے کہ ان صنعتوں میں کیا امکانات ہیں۔ چونکہ مملکت آصفیہ میں روغنی تخم کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے سنہ ۱۹۱۸ء میں صابن سازی کا کارخانہ قایم کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد یہ مناسب تصور کیا گیا کہ سرکاری کارخانہ صابن سازی کسی تاجر یا کمپنی کے حوالہ کردیا جائے۔ بہرحال سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ کارخانہ بند کردیا گیا۔

سررشتہ تجارت و حرفت قایم کرنے کے چند ماہ قبل ایک کیمیائی تجربہ خانہ قائم کیا گیا اور پانچ کیمسٹ منتخب کرکے بنگلور بھیجے گئے تاکہ وہاں کے انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس میں تعلیم حاصل کرسکیں۔ بنگلور میں انھوں نے جو تحقیقات شروع کی اس کا سلسلہ حیدرآباد واپس آکر جاری رکھا۔

حیدرآباد کی جدید صنعتی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے۔ جبکہ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سنہ ۱۹۲۹ء میں ایک کروڑ روپے کے سرمایہ سے قائم کیا گیا۔ اب یہ فنڈ ممالک محروسہ کی صنعتی ترقی میں بہت ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔ چھوٹی بڑی دونوں قسم کی صنعتیں اس سرمایہ سے مستفید ہوتی ہیں۔ اس کا کچھ حصہ مقامی بڑی صنعتوں کے حصص خریدنے میں صرف کیا جاتا ہے اور اس سے جو منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس سے چھوٹی صنعتوں کی مالی امداد کی جاتی ہے۔ صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے طلباء کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ صنعتی نمائشوں اور دوسری ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیا جاتا ہے۔ جن سے کہ ممالک محروسہ کی صنعتی ترقی میں امداد ملے۔ اس آمدنی کا کچھ حصہ تحقیقی کاموں پر بھی صرف کیا جاتا ہے۔ سررشتہ تجارت و حرفت کی کارگزاری کو صنعتی تجربہ خانہ اور صنعتی انجینیری کے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

صنعتی تجربہ خانہ میں اشیاء کے تجزیئے اور تحقیق کا کام انجام پاتا ہے۔ مختلف سرکاری سررشتوں

اور عوام کی طرف سے وصول شدہ نمونوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ صنعتی مسائل کی دریافت اور تحقیق کے تحت یہ تجربہ خانہ مختلف صنعتوں پر کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی صنعتی تحقیقاتی مجلس کے ساتھ اشتراک عمل کیا جاتا ہے۔

صنعتی انجینیری کی جانب سے ایسے کارخانوں کی نگرانی کی جاتی ہے جن کو انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی گنجائش سے قرضے دیئے جاتے ہیں۔ کارخانوں کے نقشے تیار کئے جاتے ہیں اور مختلف کارخانوں کی طرف سے جو نقشے پیش کئے جاتے ہیں ان میں ترمیمات کی جاتی ہیں۔

حکومت کی مقرر کردہ وار سپلائی اڈوائزری کمیٹی ممالک محروسہ سرکار عالی میں مختلف نئی صنعتوں کی تحقیقات اور ان کے قیام کا کام انجام دے رہی ہے۔ جنگ کے چھڑ جانے اور جنگی اغراض کی تکمیل کے لئے ملکی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے حکومت صناعوں کی جو امداد کی ہے اس سے ان کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وار سپلائی اڈوائزری کمیٹی کے سفارشات کے بموجب حکومت نے لوہے، فولاد، المونیم، دھاتوں، سلفیورک ترشے، گیس اور ڈھلوائی وغیرہ کی صنعتوں کے علاوہ حالیہ جنگ کے دوران میں متعدد صنعتی اداروں کے قیام کی اجازت بھی دی ہے جو اپنا کام جاری کر چکے ہیں۔

فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم | سنہ [illegible]ء میں حکومت سرکار عالی نے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی اشاعت و توسیع کے لئے پانچ لاکھ روپے کی منظوائی اور نو لاکھ روپیوں کی غیر متوالی رقم سررشتہ تعلیمات کی بچت سے منظور کی۔ اس کے علاوہ مرکزی مدرسہ فنون لطیفہ و دستکاری، مدرسہ صنعت و حرفت بلدہ اور سررشتہ تعلیم صنعت و حرفت کا قیام بھی عمل میں آیا۔ صنعتی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے اورنگ آباد، گلبرگہ، ورنگل اور نظام آباد میں صنعتی مدارس قائم کئے گئے ہیں۔

ہندوستانی صنعتیں

ہندوستان میں صنعتی ترقی | ہندوستانی صنعتیں دو شعبوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں

(۱) گھریلو صنعتیں جو کاریگروں کے مکانات میں چلائی جاتی ہیں۔

(۲) جدید طرز کی منظم صنعتیں جو کارخانوں اور ورکشاپ میں تیار کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے یہاں ان ہی سے بحث کی جائیگی جس کی ابتدا ان اہم جدید صنعتوں کی تفصیلات سے ہوگی جو ہندوستان میں نشو و نما پا رہی ہیں۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہندوستان کی صنعتی ترقی پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۹۴۰ء میں کارخانوں اور ان میں کام کرنے والوں کی جملہ تعداد علی الترتیب ۱۰ ہزار ۶ سو ۳۰ اور ۱۷ لاکھ ۱۵ ہزار ایک سو ۷۳ تھی۔ ۱۹۱۴-۱۵ء میں مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کی تعداد دو ہزار پانچ سو ۵۴ تھی اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۸۱ کروڑ روپے تھا جس کے بالمقابل ۱۹۳۹-۴۰ء میں ہندوستان میں رجسٹر شدہ کمپنیوں کی کل تعداد ۱۱ ہزار ۳ سو ۷۲ اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۲۹۰ کروڑ روپے تھا۔ ۱۹۱۴-۱۵ء میں بیرون ہند رجسٹر شدہ لیکن اندرون ہند کام کرنے والی کمپنیوں کی جملہ تعداد پانچ سو سترہ تھی اور ادا شدہ سرمایہ دو سو ۸۹ ملین پونڈ تھا جس کے بالمقابل ۱۹۳۸-۳۹ء میں ایسی کمپنیوں کی تعداد ۸ سو ستر اور ان کا ادا شدہ سرمایہ ۵۴۷ ملین پونڈ تھا۔

مندرجہ بالا اعداد سے صنعتی ترقی کا پتہ چلتا ہے لیکن قومی معاشی نظام میں منظم صنعتوں کا حصہ بہت کم ہے۔ ملک میں پیمانہ کبیر کی منظم صنعتیں بہت ہی قلیل ہیں۔ ملک کی آبادی کا صرف دو فیصدی حصہ جدید صنعتوں میں مصروف ہے۔ ۱۹۳۹ء کی جنگ کے بعد سے اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

ممالک آصفیہ میں ۱۳۵۰ف-۱۹۴۱ء میں رجسٹر شدہ کارخانوں کی تعداد ۶۰۲ تھی جملہ صنعتوں میں روزآنہ ۹۴ ہزار اشخاص امور بہ کار تھے۔ کاتنے اور بننے کے کارخانوں اور دوسری صنعتوں میں کام کرنے والے بچوں کی روزآنہ اوسط تعداد ۱۳۵۱ف-۱۹۴۲ء میں علی الترتیب ۳۸۶ اور ۱۸۸۱ تھی رجسٹر شدہ کارخانوں میں بارہ ہزار عورتیں ملازم تھیں جن میں سے ۹۲۷ کاتنے اور بننے کے کارخانوں میں مامور تھیں۔

ایک سرسری اندازہ کے مطابق ممالک محروسہ سرکار عالی کی بہ پیمانہ کبیر کی صنعتوں میں دس کروڑ

کے قریب سرمایہ مشغول ہے جس میں معتد بہ حصہ سرکار عالی کی امداد پر مشتمل ہے۔ بیرونی رجسٹر شدہ کمپنیوں کا سرمایہ اس وقت ممالک محروسہ سرکار عالی میں مشغول ہے۔ اس کے متعلق کوئی صحیح سواد دستیاب نہ ہوسکا لیکن ایک عام تخمینہ کے مطابق بیرونی سرمایہ کی مقدار چار کروڑ سے کچھ زائد نہیں معلوم ہوتی۔

سوتی صنعت | پیمانہ کبیر کی صنعتوں میں جو ہندوستانیوں کی ملک اور ان کے زیر انتظام ہیں سوتی صنعت کو اوّلیت حاصل ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے بمبئی میں اس صنعت کا آغاز ہوا۔ اور آج تک بھی بمبئی اس کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ موجودہ زمانہ میں احمد آباد شولاپور، ہبلی اور ناگپور اس صنعت میں تیزی کے ساتھ ترقی کر چکے ہیں یہ شہر کپاس پیدا کرنیوالے خطوں کے وسط میں واقع ہیں۔ اور ان کو شمالی علاقوں میں آسانی کے ساتھ بازار مہیا ہونے کے علاوہ مزدور بھی بکثرت مہیا ہو جاتے ہیں۔ موجودہ صدی کی ابتدا تک یہ صنعت صرف کتائی کی حد تک محدود تھی۔ لیکن جب ہندوستانی سوت کے لئے چین کا بازار مسدود ہو گیا تو بُنائی کی صنعت کو بہت ترقی ہوئی۔ حالیہ رجحان یہ ہے کہ نہایت باریک سوت کی ساخت کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے لانبے ریشے کی کپاس کثیر مقدار میں ممالک متحدہ امریکہ، مشرقی افریقہ اور دوسرے مقامات سے ہندوستان میں درآمد کی جاتی رہی۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود جو قحط، پلیگ، بیرونی مسابقت، شرح تبادلہ کے تغیرات اور کپاس کی اعلیٰ قیمتوں کی صورت میں رونما ہوئیں۔ سوتی صنعت کی ترقی میں توسیع ہوتی رہی۔ جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کی وجہ سے اس صنعت کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ بیرونی درآمد بہت گھٹ گئی تھی۔ حکومت نے بھی فوجی اغراض کے مدنظر اس صنعت کی سرپرستی کی۔ سودیشی تحریک بھی ممد و معاون ثابت ہوئی۔ لیکن عام تجارتی کساد بازاری اور ہندوستانی بازاروں میں جاپان کی مسابقت کے باعث یہ صنعت متاثر ہوئی۔ بہرحال اس تحفظ کے باعث جو ۱۹۲۷ء سے تاحین کی صورت میں اسے حاصل ہے ہندوستانی صنعت اس قابل ہوئی کہ ان مشکلات پر غالب آسکے ۱۹۳۳-۳۴ء کے ہندوستانی

جاپانی تجارتی معاہدے کے بعد سے جس کی ۱۹۳۷ء میں تجدید عمل میں آئی جاپانی مسابقت پر قابو
حاصل کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں ہندوستان میں سوتی کارخانوں کی تعداد ۴۰۰ اور ان میں کام کرنے والے
اشخاص کی تعداد ۴ لاکھ ۳۰ ہزار تھی۔ اس کے بالمقابل ۱۹۱۲ء میں کارخانوں کی تعداد ۲۷۱ اور مزدور
۲ لاکھ ۶۰ ہزار تھے۔ ۱۹۰۰ء میں کارخانوں کی تعداد ۱۹۳ اور مزدوروں کی تعداد ایک لاکھ ۶۱ ہزار
تھی۔ ۱۸۵۷ء میں تو صرف ۱۵ کارخانے تھے۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں کارخانوں میں ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ گز پارچہ
تیار ہوا۔ ۶۷ کروڑ ۹۰ لاکھ گز کی درآمد ہوئی۔ اس کے بالمقابل ۴۵-۱۹۴۴ء میں ۴۷ کروڑ ۸۰ لاکھ
گز پارچہ تیار ہوا۔ ۲۲۸ کروڑ ۸۰ لاکھ گز کی درآمد ہوئی۔ اس کے بعد سے بیرونی درآمد بہت گھٹ
گئی۔ ہندوستان میں جو پارچہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا تقریباً ۲۵ فیصدی حصہ دستی اگھ
پر تیار کیا جاتا ہے اور اب ملکی پارچہ ہی جو کارخانوں میں تیار ہوتا ہے۔ بڑی حد تک کپڑے کی
مقامی طلب کو پورا کر رہا ہے ۱۹۳۵ء میں ٹیرف بورڈ کی سفارش پر لنکا شائر کی درآمد پر محصول ۲۵
فیصدی سے ۲۰ فیصدی تک گھٹا دیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی برطانوی تجارتی معاہدے
کے تحت مزید تخفیف کی گئی لیکن جنگ چھڑتے ہی حالات میں تبدیلی ہوئی اور اس صنعت
کی حالت بہتر ہونے لگی۔ جنگ کے آرڈر وصول ہونے کی وجہ سے منافع ہونے لگا۔ سوتی مصنوعات
کی برآمد میں بھی اضافہ ہوا۔ ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۴۴ کروڑ ۶ لاکھ روپے کا مال برآمد کیا گیا۔ ۴۸۵ کروڑ
۳ لاکھ گز پارچہ تیار ہوا۔

حیدرآباد کی صنعت پارچہ بافی | ایک صدی پیشتر تک مملکت آصفیہ میں بنے ہوئے پارچوں کی
شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سیاحان یورپ ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے گذشتہ
دور کی پارچہ بافی کی صنعت کا اندازہ ان پرانے اسباب کے ذخیروں سے ہو سکتا ہے۔ جو ابھی
تک امرار عظام کے محلات میں موجود ہیں۔

یورپ کے صنعتی انقلاب نے ہندوستان کی پارچہ بافی کی صنعت کو تباہ کر دیا تو اس
کے اثر سے دکن بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ لاکھوں خوش حال جلاہے بے روزگار ہو گئے اور زرا عت

کو اپنا پیشہ بنا لیا۔

مملکت آصفیہ میں انیسویں صدی کے اواخر پر اورنگ آباد اور گلبرگہ میں ایک ایک پارچہ بافی کا کارخانہ قائم ہوا۔ محبوب شاہی ملز گلبرگہ کا سنگ بنیاد حضرت غفران مکان نے رکھا۔ مملکت میں واڑی ریلوے لائن اور منماڑ حیدرآباد ریلوے لائن کے ساتھ ہی کپاس کی کاشت میں بڑی ترقی ہوگئی۔ اس لئے بعض تاجروں نے پارچہ بافی کے کارخانوں کی بجائے روئی دابنے اور گٹھے بنانے کے کارخانے قائم کردیئے۔ جس قدر سرمایہ ان روئی کے دابنے والے کارخانوں میں لگایا گیا۔ اس سے چند پارچہ بافی کے کارخانے قائم ہوجاتے تو اس سے اہل ملک کو بہت فائدہ پہنچتا۔ اس وقت مملکت آصفیہ میں پارچہ بافی کے حسب ذیل ملز قائم ہیں۔

(۱) اورنگ آباد ملز (۲) محبوب شاہی ملز گلبرگہ (۳) عثمان شاہی ملز ناندیڑ (۴) اعظم جاہی ملز ورنگل (۵) حیدرآباد اسپننگ اینڈ ویونگ ملز (۶) رام گوپال ملز سکندرآباد

۱۹۲۸ء میں کپاس کی کاشت اور اس کے نقل و حمل پر بعض پابندیاں عائد کی گئیں۔

۱۹۴۱-۴۲ء میں ان کارخانوں میں ۲ کروڑ ۲ ۹ لاکھ پونڈ سوت تیار ہوا اور مختلف قسم کا ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ گز کپڑا تیار کیا گیا۔ جنگی اغراض کے سلسلہ میں ان کارخانوں نے پارچہ کی سبراہی کے بڑے آرڈر حاصل کئے۔

چند چھوٹے کارخانے مثلاً پی۔ڈبلیو ملز، ایم۔ ایس۔ ملز، جیون ٹکسٹائل ورکس، بشیر سلک فیکٹری، کارخانہ بہروکمخواب اورنگ آباد اور اورنگ آباد سلک ملز بھی کافی ترقی حاصل کررہے ہیں جنگ کی وجہ سے پارچہ کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا اس لئے سرکار عالی کی جانب سے معیاری پارچہ کی دوکانیں قائم کی گئیں تاکہ غربا کو ارزاں پارچہ میسر آسکے نگرانی پارچہ و سوت کے لئے کمشنر پارچہ کا تقرر عمل میں آیا ہے۔

جوٹ کی صنعت | ہندوستان میں پیمانہ کبیر کی دوسری ترقی یافتہ صنعت جوٹ ہے جو بنگال میں ۱۸۵۵ء میں وجود میں آئی اور پہلا کارخانہ سیرام پور میں قائم ہوا۔ ابتدائی

۳۰ سال کے دوران میں اس کی رفتار ترقی سست رہی۔ جوٹ کی مصنوعات اور ان کی برآمد ناقابل لحاظ تھی۔ گذشتہ جنگ کے زمانہ میں اس صنعت کو نمایاں توسیع ہوئی اور عروج حاصل ہوا کیونکہ مختلف محاذہائے جنگ کی خندقوں میں تھیلے فراہم کرنے کی ضرورت ہوئی۔ ایک وجہ تک ڈنڈی جو اسکاٹ لینڈ میں واقع ہے۔ جوٹ کی صنعت کا خاص مرکز تھا۔ اب کلکتہ جوٹ کی مصنوعات اور ان کی تجارت کا اہم مقام بن گیا ہے۔

۳۷-۱۹۳۶ء میں جوٹ کے کارخانوں کی تعداد ایک سو پانچ تھی اور ان میں تین لاکھ آٹھ ہزار سات سو مزدور کام کرتے تھے اس کے بالمقابل ۸۰-۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۴-۸۳ء میں کارخانوں کی تعداد ۲۱ تھی اور ان میں کام کرنے والے مزدور ۳۸ ہزار ۸ سو تھے۔

جوٹ کی صنعت کو سوتی صنعت کے مقابلے میں بعض حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہندوستان کو جوٹ کا اجارہ حاصل ہے۔ اور وہ منظم بھی ہے۔ سوتی صنعت کے برخلاف جوٹ کی صنعت کے نظام میں بہت زیادہ مرکزیت پیدا کردی گئی ہے۔ چنانچہ کلکتہ سے چالیس میل کے رقبہ کے اندر اکثر و بیشتر کارخانے قائم ہیں اس صنعت کی نگرانی اور مالیہ یوروپین سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔

جوٹ کی صنعت ۳۲-۱۹۲۹ء کے کساد بازاری کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ جوٹ ملز اسوسیشن نے اس کی رسد کو محدود کردیا۔ حالیہ زمانہ میں جوٹ کی مصنوعات میں ٹاٹ کے تھیلوں کی برآمد میں زیادہ ترقی ہوئی ہے ۳۹-۱۹۳۸ء میں جوٹ کی جو مصنوعات برآمد کی گئیں ان کی مالیت ۲۶ کروڑ ۲۶ لاکھ روپے تھی ۴۴-۱۹۴۳ء میں جوٹ کی مصنوعات ۷ لاکھ ۴۳ ہزار ٹن برآمد کی گئی۔

مملکت آصفیہ میں سن کی کاشت ہوتی ہے ۴۵-۱۹۴۴ء میں اس کا زیر کاشت رقبہ ۵۰ ہزار ایکڑ تھا۔

لوہے اور فولاد کی صنعت | یہ ایک کلیدی صنعت ہے جس کو بڑی قومی اہمیت حاصل ہے۔ حالیہ دور ہی میں اس صنعت نے ترقی حاصل کی۔ باراکار آئرن ورکس ۱۸۷۴ء میں بنگال کے جھریا

کے کوئلہ کے معدنی علاقہ کے قریب قائم ہوا۔ اس کارخانے کو ہندوستان میں ایک کامیاب اولیت کا امتیاز حاصل ہوا تھا جس کو ۱۸۸۹ء میں بنگال اسٹیل اور آئرن کمپنی میں ضم کر لیا گیا۔ اس صنعت کی تاریخ کا دوسرا اہم دور اس زمانہ سے شروع ہوتا ہے جبکہ ٹاٹا اسٹیل اینڈ آئرن کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۰۷ء میں یہ کارخانہ بمقام ساکچی قائم ہوا اور ۱۹۱۱ء میں کام کا آغاز ہوا۔ حکومت کی زمانہ جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) کی ضروریات اس کی مزید ترقی کا باعث ہوئیں۔ ۱۹۲۴ء میں اس صنعت کی توسیع کی ایک بڑی اسکیم مکمل ہوئی۔ اس سال ٹیرف بورڈ کی سفارش پر لوہے اور فولاد کی صنعت کو بیرونی مسابقت سے تحفظ کے لئے قانون منظور ہوئی۔ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۴ء میں پھر اس کی تجدید عمل میں آئی جس کی بدولت اس صنعت نے نمایاں ترقی حاصل کی۔ جہاں تک خام لوہے کا تعلق ہے ہندوستان خود مکتفی ہو چکا ہے۔ خام لوہے کی پیداوار بیسویں صدی کی ابتدا میں ۳۵ ہزار ٹن تھی جو ۴۰-۱۹۳۹ء میں بڑھ کر ۱۸ لاکھ ۳۸ ہزار ٹن ہو گئی۔ فولاد کی پیداوار میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ چنانچہ ۱۷-۱۹۱۶ء کے ایک لاکھ ۳۹ ہزار ٹن کے مقابلہ میں ۴۰-۱۹۳۹ء میں تیار شدہ لوہے کی مقدار ۱۰ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن ہوئی۔ ساکچی (جس کا نام جمشید پور رکھا گیا) متعلقہ صنعتوں کا مرکز بن گیا ہے۔ مثلاً ٹن کی چادریں، تار اور کیلے، ریل کے ڈبے، وزنی کیمیائی مرکبات اور دوسری صنعتیں۔ کوئلہ کی معدنوں کے قریب بکثرت خام لوہے کے ذخائر کی موجودگی دیگر خام پیداواروں کی مناسب فراہمی اور اندرونی بازار مہیا ہو جانے کے باعث اس صنعت کا مستقبل بہت روشن ہو گیا ہے۔ خصوصاً حالیہ جنگ کی وجہ سے اس صنعت کو تیزی کے ساتھ ترقی نصیب ہوئی۔ ۱۹۴۱ء سے حکومت ہند نے لوہے اور فولاد کی تقسیم پر نگرانی عائد کی ہے۔

حیدرآباد میں لوہے اور فولاد کی صنعت

ممالک محروسہ کے ہر ایک گاؤں میں قدیم سے لوہار موجود ہیں جو زرعی آلات، تعمیراتی ساز و سامان اور اشیائے خانہ داری تیار کیا کرتے ہیں۔ ملک میں عمدہ کاریگر اب بھی موجود ہیں۔ قدیم زمانہ سے ممالک محروسہ میں لوہے کے معادن کی وجہ سے بہت سے مقامات پر فولادی اشیا تیار کئے جاتے تھے۔ قدیم دمشقی تلواریں جن کو بین الاقوامی

شہرت حاصل ہے وہ دکن کے فولاد ہی سے بنائی جاتی تھیں، فولاد سے تلوار، بندوق، چاقو قینچی، سروتے اور تار تیار ہوا کرتے تھے، قدیم زمانہ کی بنی ہوئی بڑی بڑی توپیں جو مملکت کے ویران قلعوں میں رکھی ہوئی ہیں، اب بھی دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ ضلع بیڑ میں کیتلیاں بنائی جاتی ہیں، ضلع عثمان آباد میں چاقو اور سروتے اچھے تیار ہوتے ہیں۔

یاقوت پورہ حیدرآباد میں گذشتہ جنگ عظیم سے قبل ایک کارخانہ موسوم بہ "صنعت ہند" آہنی سامان تیار کرنے کے لئے قائم ہوا۔ اس کارخانہ میں ستون، قندیل، جالیاں، آہنی کرسیاں وغیرہ بہت اچھی تیار ہوتی تھیں۔ حیدرآباد آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کے نام سے ایک جدید کمپنی ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی لیکن زیادہ ترقی نہ کر سکی۔ اس سلسلہ میں دارالضرب سرکار عالی اور لالہ گوڑہ ریلوے ورکشاپ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

حال ہی میں آلوین میٹل ورکس کا افتتاح عمل میں آیا، جہاں آہنی سامان مثلاً تجوریاں، الماریاں، آہنی فرنیچر اور چاقو وغیرہ بہترین تیار ہو رہے ہیں۔ یہ کارخانہ سترہ لاکھ روپے کے سرمایہ سے صنعتی رقبہ مشیرآباد میں قائم کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں اس کارخانہ کو ایک لاکھ ۴۴ ہزار روپے کا خالص منافع حاصل ہوا۔ ابتدائی مشکلات عظیم کے باوجود کارخانہ اچھی طرح کام کر رہا ہے۔

صنعت دباغت وچرم سازی | دباغت ملک کی ایک قدیم صنعت ہے۔ کثیر مقدار میں چمڑے اور کھالوں کی دباغت ہوا کرتی تھی۔ قدیم زمانے میں جرمنی، آسٹریا اور ممالک متحدہ امریکہ کو بمقدار کثیر ان کی برآمد ہوا کرتی تھی۔ آج کل بھی ملک میں ان سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا جاتا۔ گھوڑوں کے ساز و سامان اور دوسری فوجی ضرورتوں کے لئے سب سے پہلے فوجی عہدہ داروں نے دباغت کے یوروپی طریقے رائج کئے۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں ہارنس اور زین کی تیاری کے لئے کانپور میں ایک سرکاری کارخانہ قائم کیا گیا، اس کے بعد خانگی کارخانے قائم ہوئے۔ اس طرح کانپور چمڑے کی تجارت کا ہندوستان میں بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد بمبئی اور مدراس میں بھی اس صنعت کو قابل لحاظ ترقی ہوئی گذشتہ جنگ کے زمانے میں اس صنعت کو ہندوستانی محکمہ اسلحہ کی سرپرستی کی بدولت خوب

شروع ہوا کیونکہ اس مجلس کو فوجیوں کے لئے کثیر تعداد میں جوتوں کی ضرورت تھی ۱۹۱۹ء کے بعد سے اس صنعت کو محدود تامین عطا ہوئی۔ اس صنعت میں اندرونی اصلاح کے لئے بھی کافی گنجائش موجود ہے۔ انڈسٹریل ریسرچ بیورو نے ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی صنعت چرم سازی کی سروے کی۔ حالیہ جنگ کی وجہ سے فوجی ساز و سامان کثیر مقدار میں تیار ہوا۔ بنگال، صوبہ متحدہ اور پنجاب میں جدید کارخانے قائم ہوئے ہیں۔

مملکت آصفیہ میں چرم سازی | مملکت آصفیہ کے ہر گاؤں میں موچی موجود ہیں، جو آب بر آری اور زرعی ضرورتوں کے لئے چرمی اشیاء تیار کر لیتے ہیں، ان کے تیار کئے ہوئے چپل اور جوتے بھی دیہاتی آبادی کے لئے کافی ہو جاتے ہیں، قدیم زمانے سے بیڑ کی چپاگلیں مشہور ہیں۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کے سرمایہ سے صنعت دباغت اور چرم سازی کی سروے کرائی گئی۔ اسکے لئے کیپٹن اسے۔ گوتری کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو لیدر ٹریڈ انسٹی ٹیوٹ مدراس کے ایک عہدہ دار تھے۔ اس رپورٹ کے نتیجہ کے طور پر عزیز فیاکٹری کو پچاس ہزار روپے قرض دئیے گئے تاکہ چرم سازی کے لئے جدید وضع کی مشنری خریدی جاسکے۔ ہنگولی کے ایک کارخانہ کو امداد دی گئی تاکہ چرمی صندوق تیار کئے جاسکیں۔

موجودہ زمانہ میں مملکت میں صنعت دباغت کے تقریباً ۴۰ کارخانے پیمانہ صغیر پر موجود ہیں اضلاع رائچور۔ ورنگل۔ نظام آباد اور حیدرآباد اس صنعت کے لئے مشہور ہیں۔

سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں تقریباً ۱۳ لاکھ ۲۶ ہزار روپے کے چمڑے اور چرمی اشیاء ہماری مملکت سے برآمد کئے گئے پنج سالہ اصلاحی اسکیم کے تحت اب صنعت چرم سازی کو ترقی دی جارہی ہے اس اسکیم کے مطابق ممالک محروسہ کے موزوں مقامات پر چندہ چرم خانے قائم کئے جائیں گے صنعت چرم سازی کے تمام شعبوں مثلاً کھال اُدھیڑنے، نمک لگانے، چمڑا کمانے اور چرمی اشیاء بنانے کی تعلیم جدید طریقوں کے مطابق دی جائے گی۔ حال ہی میں حیدرآباد ٹینانریز کمپنی کا قیام عمل میں لایا ہے۔

کیمیائی صنعتیں | کسی ملک کی عام معاشی ترقی کے لئے کیمیائی صنعتوں خصوصاً وزنی کیمیائی مرکبات مثلاً سلفیورک ترشہ، کاسٹک سوڈا، نائٹرک ایسیڈ، ہائیڈرو کلورک ترشہ، سوڈیم کاربونیٹ کی تیاری بہت ضروری ہے۔ یہ بنیادی صنعتیں ہندوستان میں بہت ہی کم ترقی کرسکیں، اس لئے کثیر مقدار میں بیرونی ممالک سے ان کی درآمد کرنی پڑتی ہے۔ جنگ عظیم بہت سی کیمیائی صنعتوں کی ترقی کے لئے محرک ثابت ہوئی۔ اگر مختلف معدنی کچ دھاتوں کو موزوں طور پر استعمال کیا جائے تو ہندوستانی خام پیداوار کے وسائل وزنی کیمیائی مرکبات کی تیاری کے لئے ناکافی ثابت نہ ہونگے سلفیورک ترشہ کی صنعت میں قابل لحاظ کامیابی حاصل ہوچکی ہے، جو تمام کیمیائی صنعتوں کے لئے بنیاد متصور ہوتی ہے ٹیرف بورڈ کی سفارش پر ۱۹۳۱ء میں اس صنعت کو تامین عطا کی گئی

حالیہ جنگ کی وجہ سے کیمیائی صنعتوں کی اہمیت میں اضافہ ہوا ۱۹۳۹ء میں بمقام کلکتہ ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اس صنعت کی ترقی کے امکانات پر غور کیا گیا۔ ادویات اور دوسری کیمیائی صنعتیں مثلاً سوڈا آش اور سلفیورک ایسیڈ یماں تیار کئے جارہے ہیں

حیدرآباد میں کیمیائی صنعتیں | حکومت سرکار عالی کی امداد سے ایک انڈسٹریل کارپوریشن قائم کیا گیا ہے تاکہ کیمیائی صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک تحقیقاتی سائنٹیفک اور صنعتی ریسرچ بورڈ بھی قائم کیا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں بھی صنعتی کیمیا کا آغاز ہوچکا ہے سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ بورڈ کی جانب سے طلبہ کو وظائف بھی عطا کئے جارہے ہیں حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسیوٹیکل ورکس اور حیدرآباد کیمیکل اینڈ فرٹی لائزرس کمپنیوں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔

کاغذسازی | ہندوستان میں کاغذ کی جدید صنعت کا آغاز ۱۸۷۰ء سے ہوتا ہے جبکہ دریائے ہوگلی کے کنارے بیلی ملز قائم ہوئی۔ اس مقام کے مضافات اب تک بھی کاغذ سازی کا اہم مرکز ہیں، ٹیٹا گھر پیپر ملز ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی ۳۹-۱۹۳۸ء میں ہندوستان میں کاغذ سازی کے گیارہ کارخانے تھے۔ سابائی گھانس شمالی ہند میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے جو اس صنعت

کے لئے اصلی خام پیداوار ہے لیکن ہندوستانی پیپر پلپ کمپنی بانس کے گودے سے کاغذ بناتی ہے یہ نئی ترقی بہت امید افزا ہے۔ اس صنعت کو ۱۹۲۵ء میں تا میں عطا ہوئی اور ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۹ء میں اس کی تجدید ہوئی ۳۹-۱۹۳۸ء میں تقریباً تیس لاکھ ۷۳ ہزار ہنڈرویٹ درآمد شدہ کاغذ اور چھاپیوں کے بالمقابل ہندوستان میں ۱۴ لاکھ ۱۶ ہزار ہنڈرویٹ کاغذ تیار ہوا۔ حالیہ جنگ کی وجہ سے کاغذ کی قیمتوں میں بے حد اضافہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے دو نئے کارخانے قائم ہوئے ہیں ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۱۴ لاکھ ۲۶ ہزار ہنڈرویٹ کاغذ تیار ہوا۔

مملکت آصفیہ میں کاغذسازی | دولت آباد کے ایک محلہ موسوم بہ کاغذی پورہ کو جو اب ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت میں آباد ہے کاغذ سازی میں کئی صدیوں سے شہرت حاصل تھی۔ ہر قسم کی سرکاری خط و کتابت اور کتب کے لئے اسی مقام کا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ دولت آباد کی ویرانی اور تباہی کے ساتھ ہی وہاں کی صنعت پر اثر پڑنے لگا۔ تاہم پچاس ساٹھ سال قبل چھ سات سو گھرانے اس کی تیاری میں مصروف رہتے تھے، اور اس کی بدولت خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ بیرونی کاغذ کے رواج کے ساتھ یہاں کی صنعت پر تباہی آگئی اور اب صرف چار پانچ گھرانوں میں کاغذ بنا کرتا ہے۔ دولت آباد کے علاوہ کاغذ بلدہ حیدرآباد، کریم نگر، جگتیال اور کوڑنگلہ میں بنتا ہے۔ یہ مقامات بھی اچھی حالت میں تھے، مگر اب زوال پذیر ہیں۔

۱۹۳۱ء میں مولا بخش صاحب اور خواجہ نظام الدین صاحب نے مشترکہ طور پر کاغذ سازی کے امکانات پر ایک رپورٹ تیار کی تھی، اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ کاغذ سازی کے لئے موزوں ترین مقام ضلع عادل آباد ہے جہاں بانس کے گھنے جنگل موجود ہیں۔ خام پیداوار مثلاً کوئلہ اور چونا قرب و جوار میں بہ آسانی دستیاب ہوسکتا ہے۔ ان حالات کے مدنظر ۱۹۳۹ء میں مشترکہ سرمایہ سے ایک کمپنی قائم کی گئی جس کا نام دی سرپور پیپر ملز لمیٹڈ ہے۔ یہ کارخانہ بلہارشاہ ریلوے لائن پر بمقام کاغذنگر واقع ہے جہاں سے حمل و نقل کی سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ کمپنی کا منظورہ سرمایہ ایک کروڑ روپیہ اور اجرا شدہ ۴۵ لاکھ روپے ہے۔ اس کارخانہ میں پانچ تا

چھ ہزار ٹن سالانہ کاغذ تیار کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ یہاں تین ہزار پانچ سو اشخاص مامور بہ کار رہیں۔

دوسری صنعتیں شکر اور دیا سلائی کی صنعتیں بھی قابل ذکر ہیں، جن کو موجودہ زمانہ میں تامین کی وجہ سے سرعت کے ساتھ فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ گذشتہ جنگ کے بعد سے سمنٹ کی صنعت وسعت پذیر ہو رہی ہے۔ پورٹ لینڈ سمنٹ کی جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے برطانوی سمنٹ کے ہم پلہ ہے۔ ۱۹۱۴ء میں تیار شدہ مقدار ۹۴۵ ٹن تھی ۱۹۲۴ء میں ۲ لاکھ ۶۳ ہزار ٹن اور ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۹ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن تک پہونچ گئی۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں درآمد شدہ سمنٹ کی مقدار ۱۲ ہزار ٹن تک گھٹ گئی۔ تیل کی گرنیوں، شیشہ سازی، پرنٹنگ روشنائی اور ریشم جیسی صنعتوں کو بھی ترقی حاصل ہو رہی ہے، اور ان میں مزید ترقی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ کوئلہ، پٹرولیم، تیل اور چائے کی صنعتوں کا اس سے قبل تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ متعدد آٹے کی گرنیاں، چاول کے کارخانے، روئی اوٹنے اور دابنے کے کارخانے، ریلوے ورکشاپ اور ٹائیل و اینٹ کے کارخانے تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ربر تیار کرنے کی صنعت سے خاص طور پر ٹائر ٹیوب بنانے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ حالیہ جنگ کے دوران میں بعض نئے کارخانے قائم ہوئے ہیں جن میں الومنیم، اسلحہ سازی، طیارہ سازی اور جہاز سازی قابل تذکرہ ہیں۔

مملکت آصفیہ کی دوسری صنعتیں (۱) شکر سازی ۱۹۳۸ء میں نظام شوگر فیاکٹری بودھن کی تعمیر تکمیل کو پہونچی جو ۳۵ لاکھ روپے کے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے۔ نظام آباد سے بودھن تک ریلوے لائن ڈالی گئی ہے۔ سررشتۂ کروڑگیری کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کمپنی کی تیار کردہ شکر بتدریج باہر سے درآمد شدہ شکر کی جگہ لے رہی ہے نیشکر کی کاشت کے لئے ایک بڑھتا ہوا رقبہ زیر کاشت آنے کی وجہ سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ یہ کارخانہ بہت جلد اس قابل ہو جائیگا کہ حیدرآباد کو شکر کے لئے خود مکتفی بنا دے۔ بودھن کے اس

کارخانۂ شکرسازی نے ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۱۶ ہزار ۸ سو ٹن شکر تیار کی، جس پر ۱۴ لاکھ ۳۹ ہزار روپے کا خالص منافع ہوا۔

شکر بنانے کے بعد شیرہ اور دوسری چیزیں جو بچ جاتی ہیں اُن کو فائدہ مند طریقہ سے ضمنی حاصل کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ شیرہ سے پاور الکحل حاصل کی جاتی ہے اور اب تقریباً سالانہ چار لاکھ گیالن پاور الکحل فیاکٹری بودھن میں تیار ہو رہی ہے جس کا کچھ حصہ سرکار عالی کی ریلوے کے لئے فراہم کیا جاتا ہے۔

(۲) دیا سلائی حکومت ہند کی جانب سے دیا سلائی کی صنعت کو جو تامین عطا کی گئی ہے اسکی وجہ سے مملکت آصفیہ میں بھی دیا سلائی کے کارخانے قائم ہوئے لیکن دیا سلائی پر محصول خشکی عائد کرنے کے بعد سے اس صنعت کو خصوصاً بڑے پیمانہ کے کاروبار کو ایک طرح سے دھکا لگا نیز جنگ کی وجہ سے بھی بعض کیمیائی اجزا نہ ملنے سے مشکلات پیش آرہی ہیں۔ البتہ اس کا میلان بڑھتا نظر آرہا ہے کہ چھوٹے پیمانے کے کارخانے قائم کئے جائیں جن میں صرف دستی مشینوں سے کام لیا جاتا ہے اور جہاں روزانہ ایک سو گروس یا اس سے کم دیا سلائیاں تیار کی جاتی ہیں۔

اس وقت مملکت میں دیا سلائی کے تیرہ کارخانے ہیں۔ ان کارخانوں نے ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۳ لاکھ ۹۷ ہزار گروس دیا سلائی کی ڈبیاں تیار کیں۔

(۳) سمنٹ سازی مملکت آصفیہ میں سمنٹ سازی کی صنعت ۱۹۲۵ء میں ۳۵ لاکھ روپے کے سرمایہ سے شاہ آباد ضلع گلبرگہ میں جاری کی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں شاہ آباد سمنٹ کمپنی کا ہندوستانی ایسوسی ایٹڈ سمنٹ کمپنیز لمیٹیڈ کے ساتھ انضمام عمل میں آیا تاکہ کفایت سے سمنٹ تیار کی جاسکے اور داخلی یا خارجی مسابقت کا مقابلہ کرسکے۔ شاہ آباد سمنٹ کمپنی نے ۴۲-۱۹۴۱ء میں ایک لاکھ ۴۶ ہزار ٹن سمنٹ تیار کی۔ اس موقع پر اس امر کا تذکرہ قابل دلچسپی ہوگا کہ منتو ہر ڈام کی تعمیر میں شاہ آباد سمنٹ ہی استعمال کیا گیا۔ اس کارخانہ میں ۲۲۷۳ مرد اور ۱۵۹ عورتیں کام کرتے ہیں۔

(۴) شیشہ سازی۔ ۱۹۲۸ء میں دکن گلاس ورکس کے نام سے ایک کارخانہ بمقام فتح نگر

(بیگم پیٹ) قائم ہوا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بہت جلد کارخانہ بند کردینا پڑا۔ لیکن اس موقع پر حکومت سرکار عالی نے اس کارخانہ کی مالی امداد کی اور نیز مملکت آصفیہ میں صنعت شیشہ سازی کے امکانات پر غور کیا گیا۔ کوہ نور گلاس فیاکٹری کے نام سے اس کارخانہ کی دوبارہ تجدید عمل میں آئی جو تشفی بخش طور پر ترقی کررہا ہے۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں جو کانچ کا سامان تیار کیا گیا۔ اس کی قیمت ۳۴ لاکھ ۴۸ ہزار روپیے ہوئی۔ اس کارخانہ میں اوسطاً ۵۳۲ مزدور کام کرتے ہیں

حال ہی میں تاج گلاس ورکس کی بھی قانون کمپنی سرکار عالی کے تحت رجسٹری عمل میں آئی ہے اور اس کارخانہ کا کام فتح نگر میں جاری ہوچکا ہے۔ نیز رحیم آباد لنگم پلی میں ایک گلاس فیاکٹری بھی قائم ہوئی ہے۔

(۵) سگریٹ سازی۔ مملکت آصفیہ میں سگریٹ سازی کے دو کارخانے وزیر سلطان تمباکو کمپنی اور حیدرآباد دکن سگریٹ فیاکٹری بلدہ حیدرآباد میں واقع ہیں۔ سگریٹ سازی کے دونوں کارخانوں نے ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۱۷ کروڑ ۸۸ لاکھ سگریٹ تیار کئے۔ ان کارخانوں میں روزانہ اوسطاً ۶۴۴ مرد اور ۶۳۹ عورتیں کام کرتی ہیں۔

مملکت کے غریب طبقوں میں بیڑی کا زیادہ رواج ہے۔ بیڑی سازی کے اہم مقامات یادگیر نظام آباد اور اورنگ آباد ہیں۔

(۶) تیل نکالنے کی صنعت۔ روغنی تخم کے پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان میں مملکت آصفیہ کو خاص شہرت حاصل ہے۔ اور ہمہ اقسام کے روغنی تخم مثلاً مونگ پھلی، ارنڈی، بنولہ، تل، السی رائی وغیرہ ہیں۔ لیکن بعض مقامات میں روغن کشی کے چند کارخانے قائم ہیں، مگر اس روغن کو مقطر اور صاف کرنے کا خیال عرصہ تک پیدا نہ ہوا۔ بہت سے روغنی تخم برآمد کردیئے جاتے تھے۔ اور روغن کشی کی صنعت بہت ہی پست حالت میں تھی، اس لئے سررشتۂ تجارت و حرفت کی جانب سے ۱۹۳۰ء میں اس صنعت کی سروے کی گئی۔ اس کی تائید کی غرض سے روغن کی برآمد پر محصول کروڑگیری برخاست کردیا گیا۔ اس کے علاوہ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ کی جانب سے جدید قسم کی روغن کشی

کی مشنری کے لئے قرضہ بھی منظور کیا گیا۔ ان وجوہ سے مملکت میں روغن کشی کے کارخانوں میں تدریج
اضافہ ہوا، اور اب یہ صنعت مستقل بنیادوں پر قائم ہو گئی ہے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۵ء کے درمیان
مملکت میں روغن کش آلوں کی تعداد ۶۰ اور تیل کے گھانوں کی تعداد ۱۹۱۷ تھی۔

۱۹۳۶ء میں روغن مونگ پھلی پر ۲½ فی صدی محصول برآمد عائد کیا گیا، کیونکہ یہ صنعت
کثیر منافع کے ساتھ ترقی پذیر تھی۔ مونگ پھلی کا تیل نکالنے کے مملکت میں ۶۰ کارخانے قائم ہیں
اور بڑی مقدار میں مونگ پھلی کا روغن نکال کر برآمد کیا جاتا ہے۔

ارنڈی کی زیادہ مقدار ممبئی اور مدراس کی بندرگاہوں سے باہر روانہ کر دی جاتی ہے۔
اس کے چند کارخانے جڑچرلہ، شاد نگر، بھونگیر، سرا پیٹ اور ورنگل میں قائم ہیں۔ البتہ کافی بہت
ہی کم مقدار میں یہاں تیل نکالا جاتا ہے اور تمام پیداوار برآمد کر دی جاتی ہے۔ مملکت میں ممبئی
اور مدراس کے تاجروں کے ایجنٹ پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے کاروبار کے فروغ کے خاطر یہاں
روغن تیار کرنے کی صنعت جاری کرنا پسند نہیں کرتے۔ ملک کے کاروباری اور سرمایہ دار اصحاب
اب اس صنعت کے فروغ میں لگے ہوئے ہیں

(۷) بٹن سازی۔ حیدرآباد میں بٹن سازی کا آغاز ۱۹۱۶ء سے ہوا۔ اس وقت بٹن سازی
کے ۱۶ کارخانے کام کر رہے ہیں، جن میں دکن بٹن فیاکٹری کو اولیت حاصل ہے۔

یہ کارخانے ڈنامل اور دھات وغیرہ کی گنڈیاں، شیروانی، قمیص کے کف اور کالر کے لئے تیار
کرتے ہیں۔ بعض کارخانے ایرنگ اور چوڑیاں بھی بنا رہے ہیں۔ ملکی ضروریات کی تکمیل کے بعد تقریباً
دو لاکھ روپے سے زائد مالیت کی گنڈیاں برآمد کی جاتی ہیں۔ حالیہ جنگ میں ان میں سے اکثر
کارخانوں نے جنگی ضروریات کی تکمیل کے لئے آرڈر حاصل کئے۔

(۸) بسکٹ کی صنعت۔ حیدرآباد میں بسکٹ کی صنعت بھی ترقی کر رہی ہے۔ دکن بسکٹ
ورکس ۱۹۳۰ء میں قائم ہوا۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں دو لاکھ روپے کا مال تیار ہوا۔ بسکٹ۔ چاکلیٹ کے
علاوہ لاکھ کی مہریں، فنائل اور صابن بھی یہاں تیار ہوتے ہیں۔ اس کمپنی میں روزانہ ۸۶ آدمی کام

سے لگے ہوئے ہیں۔

(۹) پینٹ اور وارنش :- مملکت میں پینٹ اور وارنش کی صنعت بھی موجود ہے۔ حیدرآباد پینٹشیل اینڈ سپلیرز کمپنی واقع لنگم پلی سنہ ۱۹۳۵ء میں قائم ہوئی۔ اس نے سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں ۲ لاکھ ۵۹ ہزار پونڈ پینٹ اور وارنش تیار کی۔ اس کی برآمد بھی کی جارہی ہے۔ جوش زدہ تیل اور پینٹ کی تیاری کے لئے اور بھی کارخانے قائم ہو رہے ہیں۔

(۱۰) پائپ سازی۔ یہاں پائپ سازی کا کام بھی جاری ہے سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں انڈین ہیوم پائپ کمپنی کی حیدرآبادی شاخ نے مختلف سائز کے پائپ اور ٹائیل تیار کئے جن کی قیمت دو لاکھ روپے تھی۔ اس کارخانہ میں روزانہ ۷۳ مزدور کام کرتے ہیں۔

(۱۱) سنگ مرمر کی صنعت۔ سنگ مرمر کی صنعت بھی قابل ذکر ہے۔ دکن ماربل اینڈ مائننگ کمپنی جو سنہ ۱۹۳۱ء میں پانچ لاکھ روپے کے سرمایہ سے قائم ہوئی، اس نے صاف شدہ سنگ مرمر کی سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں ۳۵ ہزار مربع فیٹ سیلین یلندو ضلع ورنگل میں برآمد کیں۔

(۱۲) اشیائے گلی۔ ممالک محروسہ میں کمہار قدیم زمانہ سے موجود ہیں جو عام ضرورت اور خانہ داری کے مٹی کے اشیاء تیار کرتے ہیں۔ کلبرگہ میں صراحیاں اور آب خورے اچھے تیار ہوتے ہیں۔ اس صنعت کا سب سے بڑا مرکز تاج کلے ورکس محدود ہے۔ یہ کارخانہ پانچ لاکھ روپے کے سرمایہ سے آغاز کیا گیا ہے، جہاں پیمانہ کبیر پر اینٹ، مٹی کے برتن اور دوسرے تعمیری اشیاء تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کارخانہ میں تین سو مزدور کام کرتے ہیں۔ تام چینی کی صنعت کے بھی دو تین بڑے کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔

کوئلہ | سنگارینی کولیریز کمپنی سنہ ۱۸۸۶ء سے کوئلہ کی صنعت کا کام انجام دے رہی ہے۔ کوئلہ کی یہ کانیں تعلقہ یلندو ضلع ورنگل میں واقع ہیں۔ ڈورناکل جنکشن سے ریلوے کی ایک شاخ ۱۶ میل تک ڈالی گئی ہے جو ان معدنوں تک پہونچتی ہے۔ سنگارینی میں دو کانیں ہیں، پہلی ۵۰۷ فیٹ گہری ہے جس سے روزانہ ۱۲۵۰ ٹن کوئلہ برآمد ہوتا ہے۔ دوسری کان ۵۰۴ فیٹ گہری ہے جس سے

روزانہ ۷۵۰ ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔

تانڈور کولیریز کا کام ۱۹۲۷ء سے آغاز کیا گیا۔ یہ معدن تعلقہ آصف آباد میں واقع ہیں۔ بیلم پلی جو قاضی پیٹ بلہار شاہ ریلوے لائن پر واقع ہے اس معدن سے ملاتی ہے۔ تانڈور میں کوتاگوڈم کی کوئلہ کی کان بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۱۹۴۱ء میں مذکورہ بالا کانوں سے ۱۳ لاکھ ٹن کوئلہ برآمد ہوا جس سے حق شاہی کے بابت ۲ لاکھ ۸۸ ہزار روپے کی رقم وصول ہوئی۔ ہندوستان کی کل پیداوار کا تقریباً پانچ فی صدی مملکت آصفیہ سے برآمد ہوتا ہے۔

ان تمام معدنوں میں جدید مشنری سے کام لیا جا رہا ہے۔ کوئلہ صاف شدہ اور اچھی قسم کا ہوتا ہے۔ حادثات سے محفوظ رہنے کے لئے معدنوں میں کام کرنے والوں کو خاص ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ان کو روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ ان معدنوں کے ساتھ برقی اور میکانیکل ورکشاپ بھی قائم ہیں جہاں مشنری کی درستی اور تیاری کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اب حکومت سرکار عالی نے ممالک محروسہ میں کوئلہ کی کھدائی سے متعلق اجارہ دارانہ حقوق سنگارینی کالیریز کمپنی سے معاوضہ دیکر حاصل کرلئے ہیں۔ یہ ایک ایسا اقدام ہے جس کی بدولت ہر قسم کی بھاری اور دیگر صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ایک وسیع میدان کھل گیا ہے۔

گھریلو صنعتوں کی بقا | مشین کے ساختہ اشیاء کی مسابقت بعض قدیم گھریلو صنعتوں کی تباہی کا باعث بن چکی ہیں۔ گھریلو صنعت کے جدید طریقوں کو اگر قدیم طریقوں پر فوقیت حاصل ہو چکی ہے تو ان کی ترویج ضروری ہے۔ جو لوگ قدیم وضع کی گھریلو صنعتوں میں مشغول ہیں اُن کی سہولت اور آسائش کی منظم کوششیں عمل میں لائی جانی چاہئیے۔ گو یہ صورت جدید صنعتی نظام کی ترویج اور ترقی میں کسی حد تک کیوں نہ حائل ہو۔ یہاں ان قدیم صنعتوں سے بحث نہیں کی جائے گی جو جلد یا بدیر معدوم ہونے والی ہیں۔ صرف ان صنعتوں کا ذکر کیا جائے گا جن میں جدید حالات کے باوجود اپنی بقا اور ارتقاء کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ صنعتیں جن کے لئے سادہ آلات کی ضرورت ہے،

اور جن کا تعلق زراعت سے ہے ان کو کارخانوں میں تیار شدہ اشیا سے کوئی اندیشہ نہیں ہے ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جہاں کاریگروں نے بہتر خام پیداوار اور بہتر آلات کے استعمال کا طریقہ معلوم کرکے جدید حالات کے ساتھ کامیاب توازن پیدا کرلیا ہے۔ جُلاہے کارخانے کا سوت، رنگریز رنگ کے مرکبات، کسار دھاتی چتر اور لوہار آسانی سے مڑنے والا لوہا استعمال کررہے ہیں۔ اور ہر صورت میں صناع فائدہ حاصل کررہے ہیں اور مصارف پیدائش میں تخفیف ہورہی ہے اور ساتھ ہی بازار بھی وسیع ہو رہا ہے۔ درزی بھی سینے کی مشین استعمال کررہے ہیں، اور شہری کاریگر یورپ اور امریکہ کے بنے ہوئے ترقی یافتہ آلات خرید رہے ہیں بعض صورتوں میں ایسی اشیا تیار کی جاتی ہیں جن کے لئے مشنری اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی احتیاج نہیں پائی جاتی۔ بازار کی قربت اور صارفین کی ضروریات سے بخوبی واقفیت حاصل ہوجائے تو گھریلو صناعوں کی آمدنی میں مزید اضافہ کا موقع ہے۔ جدید کارخانوں میں تیار شدہ اشیا کی وجہ سے بعض قسم کی ٹوپیاں دھوتیاں اور ساڑیاں جن کو ملکی جلاہے تیار کرتے ہیں معدوم نہیں ہوگئے۔ ڈھاکہ، مرشد آباد، مدورا، اور بنارس کے جلاہے، لکھنؤ اور دہلی کے کارچوبی کام کرنے والے، سورت کے لیس باف ایسی اشیا تیار کرتے ہیں جن کی طلب اس ملک میں ابھی تک باقی ہے مشنری میں بنی ہوئی اس قسم کی اشیاء کے مقابلے میں ان کو بہر حال ترجیح حاصل ہے۔ دھات کا کام کرنے والے کفش ساز، سنار، درزی، حلوائی اور دوسرے کاریگر اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ اور ان کی تیار کردہ مصنوعات کو بھی کوئی خوف نہیں ہے۔ مختلف گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ابھی تک منظم صنعتوں میں کام کرنے والوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ پیمانۂ کبیر کی صنعتوں کے ساتھ گھریلو صنعتوں کی اہمیت ملک کی آئندہ صنعتی اسکیم کے ضمن میں بہت بڑھ گئی ہے جس کے لئے ۱۹۳۸ء میں کانگریسی وزارتوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ حالیہ جنگ کی وجہ سے ان گھریلو صنعتوں کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔ اب ہم بعض گھریلو صنعتوں کی حالت کا جائزہ لیں گے۔

دستی پارچہ بافی | صنعت پارچہ بافی سے تقریباً ۱۰ لاکھ افراد کے لئے اسباب معیشت مہیا ہوجاتے ہیں۔ ان صناعوں کے مقابلے میں جو بھدے نازک یا حسن کاری کے حامل اشیاء تیار کرتے ہیں جلاہو

کی حالت زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ مشنری کی مسابقت کے سلسلہ میں وہ اپنے مفاد کا تحفظ کر سکتا ہے۔ دستی پارچہ بافی سے ہندوستان کی کل طلب کا تقریباً ۲۵ فیصدی حصہ مہیا ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد سے بیرونی مسابقت اور ہندوستانی پارچہ بافی کے کارخانوں کی وجہ سے جلاہے کثیر نقصان برداشت کر رہے تھے۔ جنگ کی وجہ سے دستی پارچہ بافی کی طلب میں اضافہ ہوا۔ سوت کی فراہمی میں مشکلات پیدا ہو گئے اور ان کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔

اُونی صنعت مغلوں کے عہد میں اونی قالینوں کی صنعت درجۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ صنعت قالین بافی کا وجود موجودہ زمانہ میں ممالک غیر کی طلب پر منحصر ہے۔ تقریباً کل پیداوار کا نو فی صدی اسی طلب کی تکمیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ قالین بافوں کا افلاس اَن پڑھ ہونے اور ان کی عدم تنظیم کے باعث اونی صنعت زوال پذیر حالت میں ہے۔ بعض مجالس میں اب قالین بافی کا کام ہو رہا ہے۔

ایک اور اُونی صنعت جس کا یہاں بکثرت استعمال ہوتا ہے وہ کمزور کمبل ہے۔ چرواہوں اور کاشتکاروں نے اس صنعت کو ذیلی پیشے کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ ہر حصہ ملک میں خام پیداوار کے حصول میں جو سہولت ہے اور اندرون ملک بازار جو فراہم ہے اس کے پیش نظر اس صنعت کی ترقی کے نا سے امکانات ہیں جن کی کامل احتیاط کے ساتھ تحقیق ضروری ہے۔ حالیہ جنگ کے زمانہ میں کمبل بافی کو ترقی نصیب ہوئی کیونکہ افواج کو کثیر تعداد میں بنا کمبل فراہم کئے گئے۔

سلک اور ریشمی مصنوعات ریشم سازی کی صنعت بنگال، کشمیر اور میسور میں کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ صوبۂ متوسط، بہار اور آسام میں اونی قسم کا سلک پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان کے پارچہ بافوں کی مخالفت کے باعث ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی اُن مساعی سے دست بردار ہونا پڑا جو ہندوستان کی ریشمی مصنوعات کی برآمد کے لئے اختیار کی گئی تھیں۔ ریشمی مصنوعات کے حق میں کمپنی کی مابعد مخالفانہ پالیسی نے پارچہ بافی کی ملکی صنعت کو بہت نقصان پہنچایا۔ یورپ اور خود ملک میں طلب کی نوعیت میں تبدیلی یورپ میں ریشمی پارچہ بافی کی ترقی اور اس کے بعد جاپان، چین اور ممالک متحدہ امریکہ کی مسابقت دوسرے مخالف اثرات تھے جن کی وجہ سے اس صنعت کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ ہندوستان میں

ریشم سازی اور ریشمی مصنوعات کی اچھی حالت نہیں ہے۔ بہت سا ریشم کویا کی صورت میں برآمد کر دیا جاتا ہے، کیونکہ ہندوستان میں اس کے لپیٹنے کا کام بہت ہی بری طرح انجام پاتا ہے خود ہندوستانی پارچہ باف بیرونی ریشم کو ملک کے تیار شدہ ریشم پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستانی ریشم کو بہتر بنانے کے لئے اب صوبہ بنگال میں کوشش کی جارہی ہے۔ اسی صوبہ کے سررشتہ زراعت کے تحت ریشم سازی کے دو مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے اور کثیر تعداد میں مزرعے بھی قائم ہو چکے ہیں۔ سرکاری مدارس میں جو طلباء زیر تربیت ہیں اُن کو انعامات عطا کئے جاتے ہیں اور سرکاری مزرعوں سے تخم بھی مہیا کئے جاتے ہیں صنعت ریشم سازی کو ترقی دینے کے لئے آسام، میسور اور کشمیر میں بھی کوششیں جاری ہیں۔ صنعت ریشم سازی کے فروغ کی خاطر مختلف صوبجات کی امداد کی غرض سے لائحہ عمل کی ترتیب اور اس کے نفاذ کے لئے حکومت ہند کی جانب سے بھی امداد کی جارہی ہے۔ ریشمی مصنوعات کے لئے ہندوستان میں بعض خاص سہولتیں ہیں اس لئے اس صنعت کو کامیابی حاصل ہونا چاہیئے لیکن پیدائش بہ پیمانۂ کبیر کے لئے اس کو کپاس سے زیادہ مشکلات حائل ہیں، اور ابھی تو ہندوستان میں اس صنعت کا آغاز ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بہ لحاظ نوعیت ریشمی مصنوعات کا آسائشی اشیاء میں شمار ہوتا ہے جن کی ساخت میں تنوع کو بہت بڑا دخل ہے۔ اس لئے یہ گھریلو صنعت کے لئے بہت موزوں ہے۔ بیرونی مصنوعات کی درآمد پر بھاری محصول عائد کیا جاتا ہے

دوسری گھریلو صنعتیں

باب دوم میں بعض دیہی صنعتوں کی موجودہ حالت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ نیز زراعت کی ذیلی صنعتوں پر بحث ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد گھریلو صنعتیں ہیں، مثلاً کارچوب فرنیچر، دھاتی کام، چھری کانٹے، گوٹہ سازی، ظروف سازی، صابن سازی، ٹوپی سازی اور ریت کا کا کام ان میں سے ہر صنعت کو ترقی دینے کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیئے، وہ ان کی مکمل تحقیقات کے نتائج پر مبنی ہوگا۔

مملکت آصفیہ کی گھریلو صنعتیں

(۱) مملکت کی سب سے اہم گھریلو صنعت دستی پارچہ بافی ہے اس صنعت کا درجہ اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے زراعت کے بعد ہے۔ مجموعی آبادی کے تقریباً

فی صد حصہ نے اس صنعت کو اختیار کیا ہے، اور اس میں سالانہ ۴۶ لاکھ روپیہ کا درآمد شدہ سوت صرف ہوتا ہے اور تقریباً نصف دیہی آبادی کا پارچہ مہیا کرتا ہے۔ درآمد شدہ خام اشیا کے علاوہ مقامی گرنیوں کا کتا ہوا تقریباً ۲۰ لاکھ روپے کا سوت اور ہاتھ سے بنا ہوا دو لاکھ روپے کا سوت اس میں استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ اس دستی پارچہ بافی کی صنعت میں لگے ہوئے ہیں وہ ہندوؤں میں شالی اور مسلمانوں میں مومن کہلاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی جاہل، غیر تعلیم یافتہ، غریب مقروض اور قدامت پرست ہیں۔ حالیہ جنگ کے باعث مملکت حیدرآباد کے دستی پارچہ بافوں کو سوت حاصل کرنے میں بڑی دقت پیش آرہی ہے، کیونکہ ایک طرف تو کپڑے کی گرنیوں میں سوت کی کھپت پہلے سے زیادہ ہونے لگی ہے، اور دوسری طرف سوت کی جو مقدار درآمد کی جاتی تھی وہ بہت کچھ گھٹ چکی ہے جس سے سوت کی قیمت میں قابل لحاظ اضافہ ہوگیا ہے۔ ان حالات سے دستی پارچہ بافوں کے روزگار پر سخت ضرب لگی۔ ان پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے سررشتۂ تجارت و حرفت تجاویز مرتب کر رہا ہے اور ایک ماہر پارچہ بافی کا تقرر عمل میں آیا ہے۔

(۲) ناندیڑ کے سیلے اپنی ساخت اور نفاست کے لحاظ سے صنعت گری کے کمال میں شہرۂ آفاق ڈھاکہ ململ کے لگ بھگ ہیں، لیکن ان کی گراں قیمتی کی وجہ سے ان کی نکاسی بہت کم ہوتی جارہی ہے۔

(۳) دکن کے ریشمی پارچوں کی شہرت قدیم زمانہ سے دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ صنعت ریشم سازی میں چار ہزار کاریگر مصروف ہیں۔ اورنگ آباد کے مشہور مشروع اور کمخواب جو صنعتی ریشم سے تیار کیے جاتے ہیں نسبتاً ارزاں ہیں۔ آرمور، سنگاریڈی، نارائن پیٹ اور سدی پیٹ کے ریشمی پارچے بہت مشہور ہیں۔ ساڑیاں اور دوپٹے جو پیٹھن میں تیار ہوتے ہیں بہت دلکش ہوتے ہیں۔ یہ صنعت اب صرف چند خاندانوں میں باقی رہ گئی ہے۔

(۴) کمبل دکن کے ہر ایک گاؤں میں بنے جاتے ہیں جو غربا کا ضروری لباس ہے۔ مویشیوں سے اون با آسانی دستیاب ہو جاتی ہے۔ تقریباً چودہ ہزار اڈے صنعت کمبل سازی میں استعمال ہوتے ہیں، تین لاکھ دس ہزار روپے کی کمبلیں باہر بھیجی جاتی ہیں۔ جنگی رسد کے سلسلہ میں حکومت ہند کی جانب سے بڑے آرڈر

حاصل ہوئے۔ اس صنعت کی اصلاح کے لئے حال ہی میں سررشتہ صنعت و حرفت کے تحت ایک اسکیم منظور ہوئی ہے۔

(۵) صنعت رنگ سازی پارچہ بافی ہی سے متعلق ہے بلکہ اس کا تتمہ ہے۔ ممالک محروسہ کے مختلف مراکز پارچہ بافی میں رنگ سازی کا کام ہوتا ہے۔ اس کے لئے تقریباً نو لاکھ روپے سالانہ کے رنگ اور کیمیائی مرکبات کی درآمد ہوتی ہے

(۶) قالین سازی مملکت کی مشہور ترین صنعت ہے جو کئی صدیوں سے اپنی شہرت قائم کئے ہوئے ہے۔ دکن میں یہ ایجاد ایک مسلمان کاریگر کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔

۱۹۳۰ء میں ورنگل میں قالین سازی کے ۷ء کارگھے تھے، درحصل یہ صنعت اس وقت تنزل کی حالت میں تھی۔ اس کے بعد حکومت نے قالین سازی کا ایک آزمائشی کارخانہ قائم کیا جس کی کوششوں سے کارگھے کی تعداد اس وقت ۲۵۰ ہوگئی ہے، اور سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے کے قالین اور دریاں باہر بھیجی جاتی ہیں، حالانکہ اس سے قبل صرف تیس ہزار روپے کی قیمت کا مال برآمد ہوتا تھا۔ ورنگل کے قالین تمام ہندوستان میں بلحاظ خوبی، نفاست اور نقش و نگار بہترین سمجھے جاتے ہیں

(۷) بیدری صنعت کا نام اپنے مقام کی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ ممالک محروسہ کے مشہور مصنوعات میں بیدری برتن داخل ہیں۔ بہمنی بادشاہوں کے زمانہ میں اس صنعت کو بہت ترقی ہوئی، اور یورپ تک اس کی قدر ہونے لگی۔ بیدری برتنوں کی صنعت میں جو چیزیں استعمال ہوتی ہیں ان میں تانبے اور جست کی آمیزش ایک خاص تناسب کے ساتھ ہوتی ہے جو ڈزائن ان میں استعمال ہوتے ہیں وہ مختلف النوع اور بے نظیر ہیں۔ ان میں سے بہت زیادہ دلکش وہ ہیں جو قلعہ بیدر اور اطراف کے گنبدوں کی آرائش و زیبائش سے لئے گئے ہیں۔ بیدری برتن ابتداً حقے، پاندان، صراحیوں، رکابیوں، ڈبیوں اور مختلف مقاصد کے لئے استعمال کئے گئے۔ اب تو نئے ڈزائن نکل رہے ہیں اور جدید استعمال کی چیزیں بنائی جارہی ہیں۔ مثلاً سگریٹ کیس، گلدان، چوڑیاں، گھنڈیاں، پن اور بے شمار دوسری اشیاء۔ اب بیدر میں تاج دکن اور گلزار دکن کے نام سے دو بیدری کارخانے موجود ہیں۔

(۸) نرمل کے کھلونوں کی صنعت بہت مشہور ہے، پردے، شطرنج کے سیٹ، گنجفے، میوے اور ترکاریوں کے سیٹ، پرندے اور حیوانات وغیرہ مشہور چیزیں ہیں جو یہاں تیار ہوتی ہیں۔

(۹) کریم نگر میں چھ خاندان چاندی کے نازک اور باریک کام میں مصروف ہیں۔ چاندی کے دوسرے اشیاء کے علاوہ ہر سال یہ خاندان نازک اور باریک چاندی کے کام کی اشیاء پانچ ہزار کی قیمت کے تیار کرتے ہیں۔

(۱۰) چوڑی سازی: حیدرآباد کی چوڑی کی صنعت بیرون ملک میں بڑی شہرت رکھتی ہے۔ اس کی کافی تعداد میں برآمد کی جاتی ہے۔ بلدۂ حیدرآباد اور ضلع محبوب نگر چوڑی سازی کی صنعت کے لئے مشہور ہیں۔ حیدرآباد میں چوڑیوں پر متعدد وضع کا طلائی اور نقرئی کام نفاست سے کیا جاتا ہے۔

گھریلو صنعتوں کی امداد کے طریقے سب سے پہلے یہ امر تصفیہ شدنی ہے کہ وہ کونسی قدیم صنعتیں ہیں جو موجودہ حالات کے تحت کامیاب ہو سکتی ہیں، اور کونسی نئی صنعت کامیابی کے ساتھ جاری کی جا سکتی ہے۔ دوسرا امر معمولی دستکاروں کی امداد کے ذرائع پر غور کرنا ہے تاکہ ان کا کاروبار مستحکم ہو جائے۔ دستکاری کی مفید ابتدائی ٹریننگ کا انتظام بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ صوبہ بمبئی کے مدارس پارچہ بافی کے مماثل خصوصی مدارس صنعتی کا قیام بھی ضروری ہے۔ اچھی قسم کی ارزاں خام پیداوار کی فراہمی، عملی مظاہروں اور دوسرے ذرائع سے مفید آلات و اوزار کی ترویج بھی خصوصی توجہ کی محتاج ہے۔ فنی مشوروں سے دستکاروں کی مدد کی جا سکتی ہے اور ان کو نئی نئی وضع کے نمونے فراہم کئے جا سکتے ہیں، جن کی عوام میں مقبولیت کا امکان ہو۔ صنعتی بینکوں اور انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ دستکاروں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش بھی ضروری ہے۔ دیگر امور کی طرح ایک منظم مارکیٹنگ تنظیم کو بھی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لکھنؤ اور لاہور کے آرٹس اور انڈسٹریز ایمپوریا کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ صوبہ واری مارکیٹنگ بورڈ، اجازت یافتہ گودام اور امداد باہمی کے تھوک فروشی گوداموں کے قیام سے بھی بہت مدد مل سکتی ہے۔ امداد باہمی کے اصول پر صوبہ بمبئی کے اہم مراکز میں ضلع واری اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ دستی مصنوعات کی فروخت میں سہولتیں مہیا کی جائیں۔ بہت سے صوبوں نے صنعت

وحرفت کی امداد کے قوانین منظور ہو چکے ہیں، حکومت مفید گھریلو اور دوسری صنعتوں کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ حکومت ہند نے پانچ لاکھ ۷۵ ہزار روپیے نومبر ۱۹۳۴ء سے پانچ سال کے لیے صوبہ واری حکومتوں کو اس غرض سے عطا کئے۔ ان رقموں کی مدد سے مختلف اسکیمیں دستی پارچہ بافی کی صنعت کی ترقی کے لئے نافذ ہوئی ہیں۔ بمبئی انڈسٹریل اینڈ اکنامک سروے کمیٹی (سنہ ۱۹۳۸-۴۰ء) نے گھریلو صنعتوں کی امداد کے لئے متعدد سفارشات کی ہیں، مثلاً نمائشوں کا انعقاد، مستقل میوزیم کا قیام، گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والوں کے لئے خاص سرکاری امدادی ادارے اور گھریلو مصنوعات کی خریدی کے لئے ہمدردانہ پالیسی۔

سرکار عالی اور گھریلو صنعتیں | سررشتۂ صنعت وحرفت سرکار عالی کا یہ کام مرکز تعلیم مصنوعات دیہاتی اضلاع کی مظاہراتی جماعتوں، فروخت گاہ مصنوعات ملکی، ادارہ پارچہ بافی پیٹھن اور کارخانہ قالین بافی ورنگل پر مشتمل ہے۔

(۱) مرکز تعلیم مصنوعات دیہاتی کا سنہ ۱۹۳۴ء میں اعلیحضرت بندگان عالی نے افتتاح فرمایا تھا اور یہ ارشاد ہوا تھا کہ

"میں دیکھتا ہوں کہ دنیا کے تمام ممالک میں گھریلو مصنوعات کی خریدی کا رجحان پایا جاتا ہے، خواہ وہ اتنی عمدہ نہ ہوں جیسی کہ درآمد شدہ اشیاء ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ میری قلمرو میں بھی اس عالمگیر فطری رجحان پر کیوں نہ عمل کیا جائے۔ ایسی حالت میں جبکہ میں خود حتی الامکان اپنے ہی قلمرو کی مصنوعات کی خریدی اور اس کا استعمال کرتا ہوں تو میرا خیال ہے کہ میرا یہ عمل بہ نفس میری رعایا پر اثر انداز ہوگا وہ مجھ سے اور میرے ملک سے اس قدر محبت رکھتی ہے کہ اتنا مسئلہ پر اس کو میری تقلید پر آمادہ کرنے کے لئے کسی مزید ترغیب کی ضرورت نہ ہوگی۔"

اس ادارہ نے پانچ سال کے عرصہ میں چھ سو طلبہ کو ٹریننگ دی اور حسب ذیل شعبوں میں

طلبہ کو تعلیم دی جاتی ہے۔

(۱) پارچہ بافی (۲) رنگ سازی اور پرنٹنگ (۳) کارچوبی کام (۴) بید بافی (۵) لاکھ سازی
(۶) کمبل بافی (۷) ریشم سازی

(۲) اضلاع کی مظاہراتی جماعتوں کی تعداد سات ہے جن کو حسب ذیل مرکزوں میں متعین کیا گیا ہے
(۱) نارائن پیٹ (۲) کریم نگر (۳) مالوت (۴) رائچور (۵) گلبرگہ (۶) آرمور (۷) جوگی پیٹ
یہ مظاہراتی جماعتیں اپنے اپنے علاقوں کے مختلف مرکزوں، جاترا، میلہ اور ہفتہ وار سنتوں میں پارچہ بافندگی اور رنگ ریزی کے ترقی یافتہ آلات و اوزار کے عملی مظاہرے کرتے ہیں۔ اسکیم جدید کے تحت مظاہراتی پارٹیوں سے اضلاع کے پیداواری مراکز کی نگرانی کا کام لیا جارہا ہے۔

(۳) فروخت گاہ مصنوعات ملکی - بلدۂ حیدرآباد میں ساٹھ ہزار روپے کے صرفہ سے ملکی مصنوعات کی فروخت گاہ قائم کی گئی ہے۔ اس فروخت گاہ نے ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۸۵ ہزار روپے کی اشیاء فروخت کیں۔ فروخت گاہ کے کاروبار میں حسن کارانہ اور تجارتی حیثیتوں سے مدد لینے کے لئے خواتین کی ایک مشاورتی کمیٹی قائم ہے اور ایک شعبۂ نسواں بھی قائم ہے۔ کلکتہ اور بمبئی کے شوروم کو اب یہاں سے سامان روانہ کیا جارہا ہے۔

(۴) ادارۂ پارچہ بافی پیٹھن دو خاص مقاصد کو پیش نظر رکھکر قائم کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مقامی جلاہوں کو اس امر کی ترغیب دی جائے کہ قانی مخمل سے پلے اور ڈاپی رکھنے والے ناگ پرنگر و شمع کی ساڑیاں تیار کریں، اور دوسرے یہ کہ پیٹھن کی پگڑیاں اور سنہری قوز کی ساڑیاں بننے کی صنعت کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں اس ادارہ نے ۶۱ ہزار روپے کا مال فروخت کیا۔

(۵) کارخانہ قالین بافی ورنگل کا قیام ۱۹۳۲ء میں عمل میں آیا۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں اس کارخانہ میں ۴۰ کاریگر جن میں سے اکثر خاص طور سے اعلیٰ درجہ کے قالین بنانے کی مہارت حاصل کئے ہوئے ہیں مامور تھے۔ کارخانہ قالین بافی کے زیر نگرانی سستی قسم کے قالین اور دریاں بھی تیار کئے جارہے ہیں۔

صنعتی مزدور

ہندوستانی مزدوروں کی خصوصیات | اب ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کے بعض اہم مسائل پر بحث کی جائے گی۔ ہندوستان میں کارخانوں کے مزدوروں کی حالت مغربی ممالک کے کارخانوں کے اکثر باپ مزدوروں کی طرح نہیں ہے۔ مغربی ملکوں میں خالص صنعتی کام کرنے والے مزدوروں کو ایک مستقل طبقہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس طبقہ کو زراعت سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ اس کے برخلاف ہندوستانی مزدور دیہات کے باشندے ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ اپنے تعلقات دیہات سے برقرار رکھتے ہیں جہاں اس کا گھر بار ہوتا ہے اور جہاں اس کی کچھ نہ کچھ زمین بھی ہوتی ہے جسکی حفاظت اس کے خاندان کے لوگ کرتے ہیں۔ مزدور وقتاً فوقتاً دیہات کو جایا کرتے ہیں۔ اگر حسب خواہش جانے کا موقع نہ ملے تو پیرانہ سالی کا انعام یا وظیفہ حاصل کرنیکے بعد تو ضرور یہ اپنے اپنے دیہاتوں کو واپس چلے جاتے ہیں۔ وہ شہر کو اس لئے واپس آتا ہے کہ دیہات میں ذرائع معاش کا حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ورنہ شہر ان کے لئے جاذب توجہ نہیں ہوا کرتے۔ اگر دیہات میں ان مزدوروں کو بقدر ضرورت غذا اور کپڑا مل جائے تو وہ دیہات میں گذر بسر کرلیں گے۔ مزدور کا شہر کی ملازمت سے مستقل طور پر دلچسپی نہ لینے کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر لیبر کمیشن نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ حالات کے تحت دیہات سے شہر کے تعلق کو گویا لعنت تصور کرنا چاہیئے۔ اس کو کمزور کرنے کی بجائے مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس کو قوی اور باقاعدہ بنایا جائے۔

مزدوروں کی قلت | بعض اوقات شکایت سنی جاتی ہے کہ ہندوستان میں مزدوروں کی قلت ہے۔ جہاں تک ہنرمند مزدوروں کی فراہمی کا تعلق ہے یہ شکایت درست ہے مواصلات اور ذرائع حمل و نقل کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ دیہات میں زرعی زمینات سے پیداوار میں جو کمی ہورہی ہے اس کی وجہ سے دیہاتیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد شہروں کی

جانب روانہ ہونے پر آمادہ ہوگئی ہے تاکہ قابل حصول ذرائع معیشت سے استفادہ ہو سکے۔

اس سلسلہ میں مزید اصلاح اس طرح ممکن ہے کہ براہ راست کارخانوں کے منیجر مزدوروں کی بھرتی کیا کریں، بجائے اس کے کہ یہ کام درمیانی اشخاص یا جابرس کے سپرد کیا جائے۔ دلال چونکہ ملازمت کے حصول میں واسطہ ہوتا ہے اس لئے اس کو غیر تعلیم یافتہ اور بے بس مزدوروں کے مقابل میں وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں جن کا وہ عموماً ناجائز استعمال کرتا ہے۔ اب کارخانوں کے آجر براہ راست بھرتی کے مسئلہ کی جانب توجہ کر رہے ہیں۔

مزدوروں کے مفاد کے لئے قانون سازی

مزدوروں میں کارکردگی پیدا کرنے اور اُن کو قناعت پسند بنانے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ شہروں کی زندگی اور محنت کو خوشگوار بنایا جائے۔ اس کا اطمینان بخش انتظام قانون سازی سے ہی ہو سکتا ہے چنانچہ آجکل قانون کے ذریعہ مزدوروں کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے مسلسل کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ قانون کارخانہ جات بابتہ ۱۹۳۴ء[1] کے تحت روزانہ اور ہفتہ واری کام کے اوقات معین کر دیئے گئے ہیں۔ روزانہ دس گھنٹوں اور فی ہفتہ ۵۴ گھنٹوں سے زائد کام دوامی کارخانہ جات میں نہیں لیا جا سکتا بچوں سے روزانہ پانچ گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ ہفتہ میں ایک روز کی تعطیل اور آرام کے لئے وقفہ بھی دینا چاہئے۔ یہ قانون بعض شرائط مثلاً روشنی، ہوا اور حرارت کی فراہمی پر بھی زور دیتا ہے تاکہ مزدوروں کی صحت کا تحفظ ہو اور انہیں کوئی سخت تکلیف نہ پہنچنے پائے۔

کارخانوں میں جو عورتیں کام کرتی ہیں اُن کے مفاد کی خاطر بعض صوبجات مثلاً بمبئی، صوبجات متوسط اور مدراس نے خاص قوانین منظور کئے ہیں جس کی رو سے زچگی سے قبل اور اس کے بعد ایک مقررہ مدت کے لئے ایک مناسب الاؤنس کے ساتھ رخصت منظور کی جاتی ہے۔ ہر صوبہ میں فیکٹری انسپکٹر مقرر ہیں۔ وہ فیکٹری کے منیجروں کو مجبور کر سکتے ہیں کہ مزدوروں کو [illegible]

---

[1] ابتدائی قوانین کارخانہ جات بابتہ ۱۸۸۱ء، ۱۸۹۱ء، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۲ء میں منظور ہوئے تھے۔ معدنوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے علحدہ قوانین معدنیات نافذ ہیں۔

لگانے سے جو حادثات یا نقصانات ہوسکتے ہیں اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کریں۔ مزدوروں
کے مفاد کے لئے بعض صوبوں کی حکومتوں نے قرار دیا ہے کہ خود کارخانوں میں طبی امداد اور مرہم پٹی کا
سامان بھی مہیا رکھا جائے۔

قانون معاوضہ مزدوران سنہ ۱۹۲۳ء میں منظور ہوا اور اس کے بعد سنہ ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۳ء
اور سنہ ۱۹۳۹ء میں جو ترمیمات ہوئیں اُن کی رو سے مزدور یا اس کے خاندان کا یہ حق تسلیم کیا گیا کہ کوئی حادثہ
یا موت واقع ہو تو اس کو مقررہ شرح سے معاوضہ دیا جائے۔

قانون ادائی اجرت بابتہ سنہ ۱۹۳۶ء کے تحت ادائی اجرت میں باقاعدگی اور اجرت میں طریقہ وضعات
پر پابندیاں عائد ہوئیں۔

قانون کارخانہ جات سرکار عالی | کارخانہ جات میں کام کرنے والوں کے متعلق قانون سنہ ۱۹۲۷ء میں منظور
کیا گیا۔ اور سنہ ۱۹۳۱ء میں اس میں مزید ضروری ترمیم کی گئی۔ اس کی وجہ سے کارخانوں میں کام کرنے والے
مزدوروں کی حالت میں کچھ اصلاح ہوگئی ہے۔

اس قانون کے لحاظ سے کارخانہ سے مراد وہ مقام ہے جس میں یا جس کے حدود کے اندر سال کیا
کسی ایک دن کم از کم بیس اشخاص ایک ساتھ کام پر لگائے جائیں اور جہاں کسی شئے یا شئے کے کسی جزو کو
بھاپ پانی یا کسی قسم کے کل کی قوت یا برقی قوت سے از سر نو بنایا جائے

کارخانہ میں کام کرنے والوں کی صحت اور ان کی حفاظت کے لئے ہر کارخانہ دار پر لازم کیا گیا ہے کہ
مندرجہ ذیل امور کی پابندی کی جائے۔

کارخانہ میں صفائی کا انتظام رکھے۔ کارخانہ میں کام کے وقت کام کرنے والوں کی اتنی کثرت نہ ہو کہ
جو ان کی تندرستی کے لئے خطرناک یا مضر ہو۔ کارخانہ میں ہوا اور روشنی کے داخل اور خارج ہونے کا انتظام
کیا جائے۔ ہوا میں مصنوعی طریقے سے اتنی زیادہ نمی پیدا نہ کی جائے جس سے کارخانہ میں کام کرنے والوں
کی صحت کو نقصان پہونچے۔ کارخانہ دار پر لازم ہے کہ کلوں کے گرد کٹھرا لگایا جائے۔ قانون کارخانہ جات کے
تحت اس کی بھی ممانعت ہے کہ کسی عورت یا طفل سے کارخانہ میں کلوں کی صفائی کا کام لیا جائے جبکہ

وہ بھاپ یا پانی کی قوت یا قوت برقی کسی اور قوت محرکہ سے چل رہی ہوں۔ ہر کارخانہ میں کام کے دن ہر کام پر لگائے ہوئے شخص کو زیادہ سے زیادہ چھ گھنٹے کے کام کے بعد کم از کم ایک گھنٹہ کا وقفہ آرام کے لئے دیا جائے۔ کسی کارخانہ میں جمعہ کے دن کسی شخص سے کام نہ لیا جائے بجز اس کے کہ جمعہ سے قبل کے یا بعد کے تین دنوں میں سے کسی ایک دن اس کو پورے دن کی تعطیل دی گئی ہو۔ کوئی طفل کسی کارخانہ میں کام پر نہ لگایا جائیگا۔ تا وقتیکہ اس کی عمر بارہ سال سے متجاوز ہو۔ کسی کارخانہ میں صبح ساڑھے پانچ بجے سے پہلے یا شام کے سات بجے کے بعد کسی طفل یا عورت سے کام نہیں لیا جا سکتا کسی طفل سے کسی دن چھ گھنٹے سے اور کسی عورت سے دس گھنٹے سے زیادہ کسی کارخانہ میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ قانون کارخانہ جات کے تحت کسی کام پر لگائے ہوئے شخص سے فی ہفتہ ۶۰ گھنٹے سے زیادہ کسی کارخانہ میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ اور کسی کام پر لگائے ہوئے شخص سے کسی ایک دن گیارہ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔

۱۹۴۲ء میں چھٹی سالانہ نمائش مصنوعات ملکی حیدرآباد کا افتتاح فرماتے ہوئے حضرت اقدس و اعلیٰ نے یہ ارشاد فرمایا تھا:—

"صناعوں، سرمایہ داروں اور مزدوروں کو معلوم ہو جائے کہ صنعتی ہنر کی ترقی، سرمایہ کے بہتر استعمال اور مزدوروں کی خوش حالی میری غائر فکر اور ہمدردی کے مرکز ہیں۔"

بندگان عالی نے جس معیار کی توقع ظاہر فرمائی اُس کے حصول کے لئے محکمۂ صنعتی لیبر کا قیام عمل میں آیا ہے اور ایک لیبر کمشنر مامور ہو گئے ہیں۔ صنعتی لیبر کے تحت امپلائمنٹ اکسچینج بھی قائم کیا گیا ہے۔

مسٹر نائیک کی صدارت میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ مزدوروں کے مسائل کی تحقیقات کی جائے۔

قانون معاوضہ مزدوران سرکار عالی بابتہ ۱۹۳۹ء	قانون معاوضہ مزدوران ممالک محروسہ سرکار عالی سے یہ مقصد ہے کہ آجرین سے مزدوروں کو ایسی مضرت کا معاوضہ دلایا جائے جو کسی حادثہ سے

وقوع میں آئے مزدور کو اس کے کام کی وجہ سے اور اس کے دوران میں کسی حادثہ کے ذریعہ جسمانی مضرت پہنچے تو آجر پر لازم ہے کہ مضرت کا معاوضہ مزدور کو ادا کرے۔ مضرت سے موت واقع ہو تو بالغ ہونے کی صورت میں مزدور کی اجرت کی شرح کے لحاظ سے اس کے بیوی بچوں کو معاوضہ دیا جاتا ہے اگر مزدور کی ماہانہ اجرت دس تا پندرہ روپے ہو تو پانچ سو روپیہ معاوضہ دیا جائے گا۔ مزدور اگر نابالغ ہو تو اس صورت میں دو سو روپئے دیئے جائیں گے۔ اگر مضرت سے مستقل کامل معذوری لاحق ہو تو بالغ کی صورت میں مزدور کی اجرت کی شرح کے لحاظ سے یعنی اگر مزدور کی ماہانہ اجرت دس تا پندرہ روپے ہو تو چار سو ستر روپے دیئے جائیں گے۔ نابالغ ہونے کی صورت میں بارہ سو روپے دیئے جائیں گے۔ برعکس بالغ کی جزوی معذوری کی صورت میں سرپندرھویں روز ادا شدنی معاوضہ پانچ روپے ہوگا۔

قانون سرپرائی مصارف زچگی | زنان مزدور پیشہ کو زچگی سے کچھ مدت قبل اور کچھ مدت بعد کارخانہ جات میں کام کرنے سے باز رکھنے اور ان کے مصارف زچگی کی سبیل کرنے کے متعلق یہ قانون ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد میں نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے کوئی مالک کارخانہ دانستہ اپنے کارخانہ میں کسی مزدور پیشہ عورت کو اس کی زچگی سے چودہ دن بعد تک کام پر نہیں لگا سکتا، اور ایسا مالک کارخانہ جس کے ذمہ اس عورت کے مصارف زچگی تحت قانون عاید ہوتے ہوں ایسی عورت کو زچگی کے بعد بہ شمول یوم زچگی چار ہفتہ تک کام پر نہیں لگا سکتا۔

زچگی سے عین ما قبل ایام غیر حاضری کی بابت جس کی انتہائی مدت تین ہفتہ ہوگی اور زچگی سے چار ہفتہ بعد تک مالک کارخانہ سے بحساب آٹھ آنہ روزانہ مصارف زچگی پانے کی مستحق ہوگی بشرطیکہ کم از کم نو مہینہ قبل سے مسلسل کارگذاری ہو

قانون اتحاد پیشہ وران | قانون اتحاد پیشہ وران کا ۱۹۴۵ء میں نفاذ عمل میں آیا۔ اتحاد پیشہ وران سے ایسا عارضی یا مستقل اتحاد ہے، جس کا مقصد مزدوروں اور آجروں یا مزدوروں یا مزدوروں اور آجروں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرنا یا کسی تجارت یا کاروبار کے طریقۂ کار پر تحدیدی قیود عائد کرنا ہے کسی اتحاد پیشہ وران کے سات یا زیادہ اراکین اتحاد پیشہ وران کی رجسٹری کے لئے درخواست

کرسکتے ہیں کسی رجسٹری شدہ اتحاد پیشہ وران کا عام سرمایہ صرف مقاصد ذیل پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اتحاد پیشہ وران کے عہدہ داران کے مشاہرہ، الونس، اور اس کے علاوہ اس کے نظم ونسق کے مصارف کی ادائی

(۲) کسی قانونی کارروائی کی پیروی یا مدافعت کے مصارف جس میں اتحاد پیشہ وران یا اس کا کوئی رکن فریق مقدمہ ہو۔

(۳) موت، کبرسنی، بیماری، حوادث یا اراکین کی بے روزگاری کی صورت میں ان کے یا ان کے متوسلین کے الونس۔

(۴) اراکین کی جان کا بیمہ یا بیماری، حادثہ، بے روزگاری کے خلاف اراکین کا بیمہ کرانا، اور اس کے خطرات کی ذمہ داری۔

(۵) اراکین یا ان کے متوسلین کے لئے تعلیمی، سماجی یا مذہبی امداد کا انتظام۔

(۶) کسی ایسے رسالہ کی امداد جو بالخصوص ایسے مسائل پر بحث کرنے کے لئے شائع ہوتا ہو جو آجروں یا مزدوروں سے متعلق ہو۔

مکانات۔ صنعتی مراکز میں مزدوروں کے لئے مکانات کی فراہمی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے مزدوروں کے قیام گاہوں کی موجودہ حالت بہت ہی ابتر ہے۔ بمبئی جیسے صنعتی شہروں میں مزدوروں کی آبادی خطرناک حد تک بہت زیادہ گنجان ہو گئی ہے۔ اور ان کو آتنی بھی جگہ میسر نہیں آتی جتنی کہ گوداموں کے لئے فراہم کی گئی ہے۔ مزدوروں کی کثیر تعداد کی زندگی صرف ایک کمرہ میں بسر ہوتی ہے جو گندہ اور مضر صحت ماحول میں واقع ہوتا ہے۔ ان حالات کے تحت مزدوروں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ معمولی طور سے خوشحال گھریلو زندگی بسر کریں۔ اس لئے بہت سے مزدور اپنے اہل وعیال کو دیہات ہی میں چھوڑ دینے پر مجبور ہیں۔ امپرووسنٹ ٹرسٹ بلدی ادارے اور بعض آجروں نے اس نقص کی اصلاح کی فرداً فرداً کوشش کی ہے لیکن اس مشکل کا اطمینان بخش حل حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

مملکت آصفیہ میں کارخانوں کے مالکوں نے مزدوروں کی رہائش کے مسئلہ سے دلچسپی لینی شروع کی ہے، چنانچہ سوت کاتنے اور کپڑا بُننے اور سیمنٹ تیار کرنے والے کارخانوں، کاغذ اور بنگر بنانے والے کارخانے اور دوسرے بڑے کارخانوں نے اپنے عملے اور مزدوروں کے لئے مکانات فراہم کئے ہیں۔ کپاس اوٹنے اور دبانے کے کارخانے اگرچہ کہ موسمی ہوتے ہیں اور سال میں صرف تین مہینے جاری رہتے ہیں، تاہم ان میں سے بھی متعدد کارخانوں نے مزدوروں کے لئے پختہ اور صحت بخش مکانات بنانے شروع کر دیئے ہیں۔

رفاہی کام متذکرۂ صدر مساعی کے علاوہ دوسرے امور بھی ہیں جن کا مقصد اصلاح صحت تحفظ جان اور مزدوروں کی صنعتی کارکردگی میں افزائش پیدا کرنا، ان امور کو رفاہی کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض روشن خیال آجروں نے اپنے مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے بطور خود رفاہی کاموں کی اسکیمیں مرتب کی ہیں۔ بعض ادارہ جات مثلاً وائی۔ یم۔ سی۔ اے سوشیل سروس لیگ پست اقوام مشن سوسائٹی، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی نے رفاہی امور کی انجام دہی میں آجروں کی بیش بہا اعانت کی ہے۔ یا خود انفرادی طور پر اس کام کو انجام دیا ہے۔ یہ ان کا رفاہی کام تعلیم طبی امداد زچگی کی سہولتوں، تفریحات (مثلاً گیمس سینما، قانونی تقاریر، شراب اور قمار خانوں کی ترغیب مخالف کے طور پر) فراہمی مکانات، غلہ اور پارچہ کی دکانوں، مزدوروں کی انجمن ہائے امداد باہمی، چائے گھر اور طعام خانوں سے متعلق ہے۔

حیدرآباد کے رفاہی کام حیدرآباد میں چند چھوٹے پیمانہ کے موسمی کارخانوں سے قطع نظر دوسرے تمام کارخانوں میں عام صحت و صفائی کی حالت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے دوامی کارخانوں کے مالک کام کرنے والوں کے رہائشی مکانات کی تعمیر کے مسئلہ میں دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ رفاہ عام کے کاموں میں توجہ کی جا رہی ہے۔ مزدوروں کی طبی امداد کے لئے ڈاکٹر متقرر ہیں۔ بعض مقامات میں کلب بھی موجود ہیں۔ مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے لئے مدارس بھی قائم ہیں۔ بچوں کی پرورش گاہ دایہ خانے اور قرض و فروخت کے ادارے قائم کئے جا رہے ہیں۔ آرام گاہیں اور تفریح گاہیں بھی بنائی جا رہی ہیں۔

مزدوروں کی انجمنوں میں حیدرآباد ٹیکسٹائل ورکرس یونین گرنی کامگار یونین اور نظام اسٹیٹ ریلوے ایمپلائی یونین قابل تذکرہ ہیں

تحریک مزدور سبھا | ان تمام رفاہی امور کی ابتدا اور تکمیل دراصل مزدوروں ہی کو کرنی چاہیئے۔ دوسروں پر تکیہ کرنے کے بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر مزدور اپنی مدد آپ بہتر کر سکتے ہیں۔ مغربی ممالک میں مزدوروں کی خود اپنی طاقتور اور منظم انجمنیں ہیں جو ہر ممکنہ طریقہ سے اپنے اراکین کے مفاد کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ ایک فال نیک ہے کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی تحریک کا آغاز ہو چکا ہے سنہ ۱۹۱۸ء میں صوبہ مدراس میں اس کی ابتدا ہوئی، لیکن اس تحریک کو اتنی ترقی حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ اس نے مغربی ممالک میں حاصل کی۔ ہندوستانی مزدور سبھاؤں کی قیادت ہنوز متوسط طبقہ کے افراد تک محدود ہے۔ اگرچہ کہ ان کی نیت نیک ہوتی ہے لیکن مزدور طبقہ کی آئے دن کی مشکلات اور ضرورتوں سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔ بعض اوقات مزدوروں کے مفاد کے علاوہ ان کے سامنے سیاسی اور دوسرے مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ صنعتی شہروں میں مزدور طبقہ کی عدم یکسانیت ہندوستان میں مزدور سبھا تحریک کی ایک دوسری کمزوری ہے۔ ایک ہی مرکز میں کام کرنے والے مزدوروں کا مختلف مقامات سے وطنی تعلق ہوتا ہے۔ یہ لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان حالات میں ان کا موثر ارتباط بہت مشکل ہوتا ہے۔ عام طور پر مزدوروں کی ناخواندگی بھی دوسری بڑی کمزوری ہے۔ سب سے آخر میں ہندوستانی مزدوروں کی ایک اور خصوصیت کا ذکر بھی ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ جب کوئی مزدور اپنے دیہات کو چھوڑ کر برسوں شہر میں آباد ہو جاتا ہے، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ ابتدا سے انتہا تک ایک ہی کارخانہ میں کام کرتا رہے وہ اس عرصہ مدت میں کئی دفعہ اپنے آجر بدلتا رہتا ہے اور جب یوں کوئی مزدور ایک کارخانہ سے دوسرے کارخانہ میں تبدیل ہوتا رہے تو وہ مزدور سبھا یا کسی اور ادارہ کا کارآمد رکن ثابت نہیں ہو سکتا۔

بہرحال ہندوستان میں متذکرہ صدر امور کی تدریجی اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے۔ قانون مزدور سبھا بابتہ سنہ ۱۹۲۶ء مزدور سبھاؤں کے ارتقاء کا باعث ہوا۔ کیونکہ اس کے نفاذ کا منشا مزدوروں کے مفاد کا تحفظ ہے۔ جن مزدور سبھاؤں کی اس قانون کے تحت رجسٹری ہوتی ہے، ان پر سرمایہ کا

باقاعدہ انتظام رکھنا اور کاروبار کو صحیح اصول پر چلانے کے قیود عائد کردیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کو چند ایسی مراعات بھی عطا کی جاتی ہیں جو غیر رجسٹر شدہ انجمنوں کو حاصل نہیں ہیں، مثلاً رجسٹر شدہ انجمنوں کے جائز مقاصد کی پیش رفت میں کام کرنے والے تمام عہدہ داروں کا اس قانون کے تحت دیوانی اور فوجداری ذمہ داریوں سے تحفظ عمل میں لایا گیا ہے۔

ایک طاقت ور مزدور سبھا کا قیام نہ صرف مزدوروں کے مفاد کی نگرانی کے لئے لازمی ہے بلکہ اس سے صنعت کی منظم ترقی کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے۔

ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی کا نقص

مزدوروں کے موجودہ حالات کی اصلاح جن طریقوں پر ہونی چاہیئے ان کی جانب اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ان اصلاحوں کے عمل میں آنے سے ایک زیادہ قانع مزدور جماعت کا وجود عمل میں آسکتا ہے۔ اس سے ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی میں بھی اضافہ ہوگا۔ ہندوستانی مزدور مغربی مزدوروں کے مقابلہ میں کام کی کمتر صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یوروپین مزدور بڑھیا اُجرت پاتا ہے۔ لیکن کام کی نوعیت کے لحاظ سے وہ اس اجرت کا حقدار بھی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ کارکردگی کا یہ فرق اختلافِ ماحول کی بناء پر ہے نہ کہ نسلی اعتبار سے ہندوستانی مزدوروں میں یوروپین مزدور کے مقابلہ میں وہی کارکردگی پیدا کی جاسکتی ہے بشرطیکہ ترقی کے لئے ضروری ماحول مثلاً تعلیمی سہولتیں، حفظانِ صحت کے مؤثر ذرائع بہتر مکانات وغیرہ مہیا کئے جائیں۔ ان کی کارکردگی کو بڑھانے کے لئے اجرتوں کے اضافہ پر بھی احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہے

صنعتی ہم آہنگی

موجودہ دور میں ہندوستان کے صنعتی تنازعات میں اضافہ ہو رہا ہے آجروں اور مزدوروں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی جانب خود حکومت متوجہ ہے۔ قانون تنازعات مزدوران ۱۹۲۹ء میں منظور ہوا اور ۱۹۳۴ء میں اس کو زیادہ مستقل صورت میں نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے حکومت کو تحقیقاتی عدالت (جو بیرونی اور غیر متعلقہ اشخاص پر مشتمل

ہوتی ہے) اور مفاہمتی بورڈ (جو فریقین کے نمایندوں پر مشتمل ہوتا ہے) کے قائم کرنے کا حق دیا گیا۔ تاکہ اختلافی اُمور کی کامل وضاحت ہو جائے۔ اور عوام آسانی کے ساتھ تنازعات کی واجبیت یا عدم واجبیت کا اندازہ کر سکیں۔ یہ تنازعات جبری طور پر طے نہیں کئے جاتے بلکہ قیام امن کے لئے رائے عامّہ کی قوت پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

مختلف صوبجاتی حکومتوں نے خصوصی عہدہ دار مقرر کئے ہیں جن کا فرض یہ ہے کہ صنعتی تنازعات کے انسداد کی حکمنہ کوشش کریں صنعتی تنازعات کے انسداد کی خاطر جو ذرائع مہیا کئے گئے ہیں ان کو تقویت پہنچانے کے لئے مجلس قانون ساز بمبئی میں ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء میں قوانین منظور ہوئے۔ حکومت بمبئی کے صنعتی قانون تنازعات بابتہ ۱۹۳۸ء کی رو سے جبری تصفیہ کیا جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف مرکزی حکومت کے قانون کے تحت سمجھوتہ فریقین کی صوابدید پر منحصر رکھا گیا ہے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ کے آغاز پر مرکزی حکومت نے ایک نئے قلمدانِ وزارت لیبر کا اضافہ کیا۔ حال ہی میں حکومت ہند نے مزدوروں کے مسائل کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔

پانچواں باب

حمل ونقل اور تجارت

حمل ونقل کی اہمیت

بری، بحری اور ہوائی حمل ونقل کے ذرائع کے مناسب اور موزوں نظام کو کسی قوم کی مرفہ الحالی کی اہم شرطوں میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ اس سے ملک کے مختلف اقطاع کے مابین بیگانگت دور ہوجاتی ہے، اور شہر و دیہات میں ربط بڑھتا ہے جو دونوں کے لئے مفید ہے۔ حمل ونقل کے ذرائع تجارت کی روح رواں اور زراعت و صنعت وحرفت کی ترقی کے لئے محرک ثابت ہوتے ہیں۔ لوگوں اور اشیاء کی آزادانہ نقل وحرکت، خام پیداوار، مصنوعات اور وسائل ملک سے پوری طرح مستفید ہونے کے لئے حمل ونقل اور آمد ورفت کے ترقی یافتہ ذرائع بہت ضروری اور اہم ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ریلوے، موٹر اور حمل ونقل کے دوسرے ذرائع کی وجہ سے آمد ورفت کی مشکلات بڑی حد تک دور ہوچکی ہیں۔

ہندوستان ایک نیم براعظم ہے۔ اس لئے ایک خطہ سے دوسرے خطہ میں جانے کے لئے بڑی بڑی روکاوٹیں پیش آئیں تو کوئی تعجب نہیں۔ بارش کے زمانہ میں آمد ورفت اکثر بند ہوجاتی ہے۔ قدرتی آبی راستوں کی ہندوستان میں انگلستان کی بہ نسبت کم اہمیت ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں آمد ورفت کے ذرائع عصری معیار کے اعتبار سے بہت ناقص تھے۔ ہندوستانی حکمرانوں خصوصاً مغلوں کے زمانہ میں بڑی شاہراہیں تعمیر ہوئی تھیں ان پر مسافروں کی آسائش کے لئے ضروری انتظامات کافی اہتمام کے ساتھ عمل میں لائے جاتے تھے بہت سے اندرونی اقطاع میں داخل ہونے کا ذریعہ لدو بار ہوا کرتے تھے۔ دکن میں ناہموار پہاڑی

علاقوں اور آبی گذرگاہوں کی کمی کی وجہ سے بجز دو ساحلی مقامات کے ذرائع حمل ونقل کی حالت اور بھی ناقابل اطمینان تھی۔ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ ہندوستانی دیہات کی خودکفیلی زندگی صرف ناکمل ذرائع آمدورفت کا نتیجہ تھی۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے بعد سے موجودہ زمانہ کا اصلی عمرانی اور معاشی انقلاب رونما ہوا۔

حمل ونقل کے ذرائع کے سلسلہ میں چار اہم عنوانوں کے تحت غور کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ریلوے (۲) سڑکیں (۳) آبی راستے (۴) ہوائی جہاز

ریلوے

ہندوستانی ریلوے کی تاریخ کو مندرجہ ذیل دس دور میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

(۱) قدیم ضمانتی نظام ۱۸۴۴ء تا ۱۸۶۹ء ریلوں کی تعمیر کی پہلی تجویز ۱۸۴۴ء میں ہوئی۔ کلکتہ اور بمبئی کے قریب دو ریلوے لائنوں کی تعمیر کے لئے ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی اور گریٹ انڈین پننشلا ریلوے کمپنی کو علی الترتیب ٹھیکے دیئے گئے۔ لیکن حقیقی ترقی کی بنیادیں لارڈ ڈلہوزی نے ڈالیں جبکہ اس نے ۱۸۵۳ء میں ریلوں کی توسیع کے متعلق ایک مشہور تجویز مرتب کی۔ اس تجویز کی رو سے حکومت کی پالیسی میں ایک قطعی تغیر پیدا ہوگیا اور ریلوے کمپنیاں جو انگلستان میں رجسٹرڈ ہوئی تھیں ان کے توسط سے ریل کی تعمیر مناسب خیال کی گئی۔ حکومت نے ان کمپنیوں کو ایک مقررہ کم سے کم منافع یا مشغول سرمایہ پر شرح سود کا یقین دلایا لارڈ ڈلہوزی نے اس بات پر زور دیا کہ ریل کی مسلسل طویل لائنوں کی تعمیر سے ملک کو عمرانی، سیاسی اور تجارتی فوائد حاصل ہونگے۔ خیال یہ کیا گیا کہ ہندوستان میں اس زمانہ میں ریلوں کی تعمیر کے لئے خانگی سرمایہ مہیا نہیں ہوسکے گا۔ اس لئے ضمانتی نظام اختیار کیا گیا۔ ۱۸۵۴ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان ہندوستان کے مختلف حصوں پر ریلوں کی تعمیر اور انتظام کے لئے ۸ کمپنیوں سے معاہدے کئے گئے، اور حکومت ۴½ فی صدی سے ۵ فی صدی تک سود کی ضامن ہوئی۔ حکومت کی جانب سے کمپنیوں کو بلا معاوضہ اراضی عطا کی گئی اور اس نے اپنے لئے نگرانی کے بعض اختیارات نیز پچیس یا پچاس

سال کے اختتام پر ریلوے لائن خرید لینے کا حق چند شرائط کے تحت محفوظ کر لیا۔ مقررہ شرح سود ادا کرنے کے بعد جو زائد منافع حاصل ہو اس کے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کو مساوی طور پر حکومت اور کمپنیاں تقسیم کرلیں۔ لیکن اس نظام کے ابتدائی نتائج بہت مایوس کن رہے اور حکومت کے ذرائع آمدنی پر یہ نظام بار ثابت ہونے لگا چونکہ حکومت نے کچھ منافع کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اس لئے کمپنیوں کو اپنے اخراجات میں احتیاط اور کفایت برتنے کی ترغیب نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی، اس لئے کسی فوری منافع کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ کمپنیاں سال بہ سال معمولی شرح سود کے حاصل کرنے میں بھی ناکام رہیں اس طرح سے اس کمی کی تلافی سرکاری خزانے سے کرنی پڑی۔

(۲) حکومت کی جانب سے تعمیر اور انتظام سنہ ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۹ء مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر حکومت نے تصفیہ کیا کہ نئی ریلوے لائن بطور خود تعمیر کرکے خود نفع حاصل کرے اور تعمیر میں کفایت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس پالیسی کے تحت سندھ اور پنجاب میں ریلوے لائن تعمیر کئے گئے۔ لیکن مالی مشکلات سے تنگ آکر حکومت نے اپنی یہ پالیسی ترک کردی۔

(۳) جدید ضمانتی نظام ۱۸۷۹ء تا سنہ ۱۹۰۰ء حکومت نے دوبارہ تصفیہ کیا کہ ضمانتی کمپنیوں کے توسط سے استفادہ کیا جائے چنانچہ بنگال ناگپور ریلوے کمپنی اور مدراس اینڈ سدرن مرہٹہ ریلوے کمپنی سے معاہدات کئے گئے۔ اس دور میں کمپنیوں نے جو ریلوے لائن تعمیر کیں وہ حکومت کی ملکیت قرار دی گئیں۔ حکومت نے اپنے لئے یہ اختیار حاصل کیا کہ ۲۵ سال کے بعد اصل ادا کرکے ٹھیکہ ختم کردے۔ ضمانت کی میعاد کے دوران میں شرح سود ۳½ فی صدی قرار دی گئی۔ اس جدید ضمانتی طریق کے تحت جن شرائط پر ٹھیکے دئے گئے وہ ہر اعتبار سے حکومت کے حق میں ابتدائی نظام کے مقابلہ میں زیادہ نفع بخش تھے۔ ریلوے لائنوں کی تکمیل کے بعد کمپنیوں کو انتظام سپرد کردیا گیا۔ بعد ازاں جبکہ قدیم اور جدید ٹھیکے کے معاہدوں کی مدت ختم ہوگئی تو حکومت نے یا تو لائن خرید لیں اور ان کو راست حکومت کے انتظام میں لے لیا گیا جیسے کہ ایسٹرن بنگال ریلوے اور سندھ پنجاب

ریلوے یا دوبارہ ان ہی کمپنیوں کے انتظام میں ان کو رہنے دیا گیا جیسے کہ ایسٹ انڈیا ریلوے اور جی۔ آئی۔ پی ریلوے۔ اس طرح بڑی بڑی ریلوے لائن حکومت کے قبضہ میں آ گئیں۔ حال حال تک انتظام کمپنیوں کے تفویض تھا اور حکومت ایک ریلوے بورڈ کے ذریعہ نگرانی کرتی تھی جو ۱۹۰۵ء میں قائم ہوا تھا۔ سب سے آخر میں بنگال ناگپور ریلوے کا ٹھیکہ ہے جو ۱۹۵۰ء میں ختم ہوگا۔

(۴) ریلوں کی توسیع اور منافع کی ابتدا ۱۹۰۰ء تا ۱۹۱۴ء

ما قبل جنگ کی چودہ سالہ مدت کے دوران میں ترقی و توسیع کے ساتھ ساتھ منافع کی بھی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں یہ نظام العمل اختیار کیا گیا کہ حکومت آئندہ کے لئے سالانہ ½۱۲ ملین پونڈ ریلوے کے معیاری اخراجات کے لئے مختص کرے گی۔ اس مقصد کے لئے انگلستان میں حصول قرضہ کا طریقہ جاری کیا گیا۔ ملک کی عام معاشی ترقی اور کچھ پنجاب اور سندھ میں کارہائے آبپاشی کی توسیع کے باعث منافع حاصل ہونے لگا۔

(۵) ریلوے نظام میں رخنہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۱ء

اس دور میں کچھ تو جنگی کاروبار کی وجہ سے اور کچھ تو مقرر کردہ نظام العمل کے تحت سرمایہ لگانے میں تخفیف کی بدولت ریلوے نظام میں بڑا رخنہ پیدا ہو گیا۔

(۶) اکورتھ کمیٹی اور اس کے بعد کے حالات

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کا اختتام ہو گیا تو حکومت ریلوے سے متعلق امور کی تحقیقات کے لئے ایک خاص کمیٹی سر ولیم اکورتھ کی صدارت میں مقرر کی۔ اس کی سفارشات کی بنا پر ۲۱-۱۹۲۰ء میں سررشتہ ریلوے کے طریق عمل میں تبدیلیاں کی گئیں۔ کمیٹی نے ریلوں کی سرکاری ملکیت اور ریلوے لائنوں کی سرکاری توسط سے تعمیر کی تائید کی۔ ہندوستانی رائے عامہ کمپنیوں کے انتظام کی شدت سے مخالفت کرتی رہی۔ اس منافع کے قطع نظر جو کمپنیاں ہندوستان سے حاصل کیا کرتی تھیں۔ یہ الزام بھی ان پر عائد کیا گیا کہ کمپنیوں کو ہندوستانی قومی مفاد سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اس سے ہندوستانی

صنعت وحرفت اور تجارت کو بھی کوئی امداد نہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ درجہ سوم کے مسافروں کے آرام کی جانب بہت کم توجہ برتی جاتی تھی، حالانکہ اسی درجہ کے مسافرین سے ریلوے کی آمدنی کا بڑا حصہ وصول ہوا کرتا ہے۔ جدید پالیسی کے تحت دی گریٹ انڈین پنینشلا، دی ایسٹ انڈین، دی سدرن پنجاب، دی بی۔ بی۔ اینڈ سی آئی، اور آسام بنگال ریلوے کمپنیاں سرکاری انتظام کے تحت لے لی گئی ہیں۔ ریلوے بورڈ کی بھی جدید تنظیم کی گئی۔ اسی بورڈ کے ذریعہ سے حکومت ہند ملک کی تمام ریلوں کی موثر طریقہ پر نگرانی کرتی ہے۔ ریلوے کے اخراجات کے لئے بھی بڑی بڑی رقمیں فراہم کی گئیں۔ اکورتھ کمیٹی کی اہم سفارش کے مطابق ریلوے کے موازنہ کو عام موازنہ سے سنہ ۱۹۲۵ء میں علیحدہ کر دیا گیا تاکہ ریلوے کے کاروبار کو تجارتی نقطۂ نظر سے چلایا جائے۔ اس نئے نظام کے تحت ریلوے کے لئے یہ امر ضروری قرار دیا گیا کہ عام موازنہ کے لئے سالانہ رقمی امداد دیا کرے۔

(۷) **ریلوے کی حالیہ تاریخ سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء تا ۳۰-۱۹۲۹ء** ریلوے کے موازنہ کو عام موازنہ سے علیحدہ کرنے کی وجہ سے ابتدائی چھ سال میں خوشحالی کا دور رہا۔

(۸) **سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء تا ۳۶-۱۹۳۵ء** تجارتی کساد بازاری اور سڑکوں کے نقل و حمل سے مسابقت کی وجہ سے ریلوے کی آمدنی میں چھ سال تک نقصان ہوا، اس لئے ریلوے اس رقم کے ادا کرنے سے قاصر رہی۔

(۹) **سنہ ۱۹۳۶ء مالی حالت کی اصلاح اور تحقیقات** سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں کچھ تو قیمتوں اور تجارت کی بحالی اور کچھ تو اخراجات میں مزید تخفیف کے باعث ریلوے کی مالی حالت اصلاح پذیر ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں انڈین ریلوے انکوائری کمیٹی کا انعقاد عمل میں آیا اور سر رالف ویجوڈ اس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جون ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی جس میں ریلوے کی کارکردگی میں اضافہ اور اخراجات میں کمی کرنے کی سفارشات کی گئیں۔ اس کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ ریلوے کا عوام سے ربط بڑھایا جائے اور ریلوے کی جانب سے سررشتۂ اطلاعات کا قیام عمل میں لایا جائے۔

سنہ ۱۹۴۱ء کے اختتام پر ریلوے کی لائینیں ۴۱۰۵۲ میل تھیں اور ان پر تقریباً ۸۵۳ کروڑ ۸۷ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں وار ٹرانسپورٹ بورڈ کا قیام عمل میں آیا تاکہ تمام ذرائع نقل و حمل میں

انضباط قائم کیا جائے اور مقاجاتی صورت آمد و رفت پر نگرانی رکھی جائے۔ حالیہ جنگ کے دوران میں فوجی حمل و نقل کی زیادتی، پٹرول کی قلت اور اندرون ملک صنعتی ترقی کے باعث ریلوں پر زیادہ بار پڑا ۱۹۴۰ء میں شرح ٹکٹ میں اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۴۱-۴۲ء میں ہماری ریلیں اس قابل ہوئیں کہ مرکزی حکومت کا جملہ قرضہ بے باق کر دئے۔

۱۹۴۲ء میں محکمہ جنگی نقل و حمل کا قیام عمل میں آیا۔ حمل و نقل کے بہتر انتظامات کے سلسلہ میں یہ سلسلہ اختیار کیا گیا کہ سب سے پہلے فوجی ضروریات کو ترجیح دی گئی اور اس کے بعد دیگر سامان کی بھی آمد و رفت کا انتظام کیا گیا۔

ریلوں کے معاشی اثرات ریلوں سے ملک کو ٹھوس فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ عام نظم و نسق کی کارکردگی اور فوجی مدافعت کے علاوہ اس سے ملک کی ثقافتی ترقی میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کے معاشی اثرات بھی مساوی طور پر اہم ہیں۔

ہندوستان جیسے ملک میں امداد قحط کا کام ریلوے کے ہی ایک باقاعدہ نظام پر مبنی ہے تاکہ قحط زدہ مقامات پر غلّہ جلد مہیّا کیا جا سکے۔ ملک بھر میں معاشی ترقی، قیمتوں کی یکسانیت، روزگار کے نئے ذرائع اور آبادی کی مساوی تقسیم کا امکان ریلوں ہی کے باعث حاصل ہوتا ہے۔ ریلوں کی ترقی سے دیہاتوں کی معاشی انفرادیت اور وہاں کا خود مکتفی نظام زندگی تہ و بالا ہو گیا۔ زراعت کو اب تجارتی اصول پر چلایا جا رہا ہے جس سے کاشتکار نہ صرف اپنے قوت لایموت کی حد تک غلّہ پیدا کرتا ہے۔ بلکہ وسیع بازاروں میں اپنی پیداوار کی فروخت سے منافع بھی حاصل کرتا ہے یہ موقع ریلوں کی توسیع کے باعث ہی وجود میں آسکا۔ ریل سے جلد جلد حمل و نقل کا جو ذریعہ مہیا ہو گیا ہے۔ اسکی بدولت بندرگاہوں تک مال و اسباب کے پہنچانے اور وہاں سے اندرون ملک تجارتی اشیاء کی تقسیم میں سہولتیں پیدا ہوئیں۔ ان کی وجہ سے نہ صرف قومی تجارت کو فروغ حاصل ہوا ہے بلکہ دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات کے قیام میں بھی مدد ملی اس کے ساتھ ریلوے کے وجود سے بعض ناگوار نتائج بھی پیدا ہوئے مثلاً سب سے بڑا نقصان ملکی صنعتوں کی فوری زوال کی صورت میں نمودار ہوا

کیونکہ مشین کی بنی ہوئی اشیاء سے سخت مسابقت شروع ہوئی کیونکہ یہ چیزیں ریلوں کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچنے لگیں۔

ریلوں کی مزید ترقی کی ضرورت | بہ حیثیت مجموعی ریلوں کے فوائد کے مقابل نقصانات کو نظر انداز کر دیا جاسکتا ہے اور جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے دیہی رقبوں میں جہاں ریل کا جال بہت کم بچھایا گیا ہے خصوصیت کے ساتھ ریلوں کی مزید ضرورت پائی جاتی ہے۔ ریلوں کی ترقی میں ہندوستان دوسرے ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں فی سو مربع میل ۸٫۲ میل ریلوے لائن ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں فی سو مربع میل میں صرف ۲٫۲ میل ریلوے لائن ہے ریلوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ریلوں سے متعلقہ صنعتوں کو ترقی دی جائے ریلوں کے کرایہ اور اخراجات حمل و نقل کی پالیسی کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ملک کی عام صنعتی ترقی میں مدد ملے۔ ریلوے کرایہ کی مشاورتی کمیٹی قائم ہے۔ جو متعدد شکایات مثلاً بے جا ترجیح، بڑھیا شرح، تجارت کی ضروری سہولتوں سے محرومی وغیرہ کی تحقیقات کرتی ہے اور ان معاملات سے متعلق حکومت کے پاس سفارشات پیش کرتی ہے۔

مملکت آصفیہ میں ریلوے

ریلوے کی ابتدائی تاریخ | مملکت آصفیہ میں ریلوے لائن کی تعمیر کا خیال پہلے پہل سنہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا تاکہ بمبئی اور مدراس کو ریلوے سے ملحق کر دیا جائے۔ چنانچہ سکندرآباد اور واڑی کے درمیان پہلی ریلوے لائن سنہ ۱۸۷۴ء جاری کی گئی۔ جو ۱۱۷ میل لانبی تھی۔ اس کیلئے ۷۹ لاکھ روپیے کا سرمایہ سرکار عالی اور رعایائے سرکار عالی سے فراہم کیا گیا۔ رقم کافی نہ ہونے سے پانچ لاکھ پونڈ کا قرضہ انگلستان سے چھ فیصدی منافع کی ذمہ داری سے حاصل کیا گیا۔ ریلوں کی تیاری اور انتظام جی۔ آئی۔ پی ریلوے کے سپرد کیا گیا ابتدائی سالوں میں سرکار عالی کو منافع ملنا تو درکنار رعایائے ملک کے حصص کی ذمہ داری منافع میں معتدبہ رقم مملکت کو ادا کرنی پڑی۔ اس کے بعد چار سال تک ریلوے کی تعمیر کی رفتار بہت تیز رہی سنہ ۱۸۸۶ء میں سکندرآباد تا ورنگل ریلوے لائن جاری کی گئی اسکی لانبائی ۸۷

میل تھی۔ ۱۸۸۸ء میں ورنگل تا ڈورنا کل ریلوے لائن ڈالی گئی۔ اس کا فاصلہ ۳۵ میل تھا۔ اسی سال ۱۶ میل تک ڈورنا کل تا سنگرینی کالریز کو ریلوے سے ملحق کر دیا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں حیدرآباد گوداوری دیلی ریلوے لائن سکندرآباد تا منماڑ کی تکمیل ہوئی۔ اس کی تعمیر سے مملکت آصفیہ کے علاقہ مرہٹواڑہ کے ذرخیز خطہ کو آباد کرنے میں مدد ملی اور یہاں کی پیداوار کو بمبئی کے بازاروں تک پہنچانے میں سہولت ہوگئی۔ اس ریلوے کی تعمیر کے بعد سے مملکت میں نئی ریلوں کی تعمیر کا مسئلہ ایک عرصہ تک ملتوی رہا۔

۱۹۱۲ء میں پورنا ہنگولی ریلوے لائن پایۂ تکمیل کو پہونچی اس تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی چھوٹی پٹری کی ریلوں میں اتصال قائم کیا جائے لیکن جس غرض سے اس لائن کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا وہ پورا نہیں ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں سکندرآباد تا کرنول ریلوے لائن کی تعمیر کا کام آغاز ہوا اور ۱۹۱۷ء تک وبیرتی روڈ تک ریلوے لائن ڈالی گئی۔ جنگ عظیم اور اس کے بعد مالی مشکلات کے مدنظر یہ کام ملتوی رہا۔ ۱۹۲۸ء میں وبیرتی روڈ سے ڈورنا چلم تک ریلوے لائن ملادی گئی اس سے جنوبی ہند کی چھوٹی پٹری کی ریلوں سے اتصال پیدا ہوگیا۔ قاضی پیٹھ بلہارشاہ ریلوے لائن کی ابتدا بھی اسی زمانہ میں ہوئی۔ اس کی وجہ سے شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان بڑی پٹری کی ریل سے قریب ترین راستہ مہیا ہوگیا۔ اس ریلوے لائن کا افتتاح ۱۹۲۸ء میں حضرت اقدس و اعلیٰ نے بہ نفس نفیس فرمایا۔ ۱۹۲۹ء میں پربھنی تا پرلی ویجناتھ ریلوے لائن کی تکمیل ہوئی جو چالیس میل لانبی ہے۔ مانجرا کی زرخیز وادی میں ریل کے ذریعہ حمل و نقل کی سہولت ۱۹۳۰ء میں ہوئی اور وقارآباد سے بیدر تک ریلوے لائن ڈالی گئی۔ جس کی مسافت ۵۷ میل ہے۔

اس موقع پر اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ ۱۹۱۲ء کے بعد سے ریلوے کی تعمیر سرکار عالی کے سرمایہ سے ہوئی۔ البتہ ان کی تعمیر اور انتظام نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے تفویض رہا۔ ریلوے کی تاریخ کا ایک نیا باب یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ ۔ ین۔

جی۔ ایس ریلوے کمپنی سے مملکت آصفیہ کی تمام ریلیں سرکار عالی نے خرید لیں ۱۹۳۱ء میں بیدر سے پرلی ویجناتھ تک کی ریلوے لائن مکمل ہوئی ۱۹۳۸ء میں نظام آباد سے بودھن تک ۱۲ میل کی ریلوے لائن ڈالی گئی تاکہ کارخانہ شکر سازی بودھن کی ضرورت کی تکمیل کو پورا کرے۔ اب مکھیڑ سے عادل آباد کی ریلوے لائن تعمیر کی جا رہی ہے تاکہ ملک کے ایسے غیر ترقی یافتہ حصوں کے راستے کھل جائیں جو قدرتی اور معدنی وسائل سے معمور ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مملکت آصفیہ میں ریلوے لائن کا مجموعی طول ۱۳۶۰ میل ہے جس میں ۶۸۹ میل چوڑی پٹری اور ۶۷۲ میل چھوٹی پٹری ہے ان میں سے ۵۸ میل کی ریلوے لائن حکومت ہند کی جانب سے بیرون ملک سرکار عالی تیار کی گئی ہے۔

سڑک اور ریلوے میں اشتراک عمل

ہماری ریلوے کی حالیہ تاریخ میں ایک امتیازی چیز ریل اور سڑک کے حمل و نقل میں باہمی اشتراک عمل ہے۔ ہندوستان میں یہ ایک نئی چیز ہے اس لئے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس بارہ میں سرکار عالی کی ریلوے نے ہندوستان کے دوسرے ریلوں کی رہنمائی کی ہے۔ اس اقدام سے بڑی حد تک ریلوے اور روڈ ٹرانسپورٹ سرویس کی مسابقت کا خوف جاتا رہا۔ جون ۱۹۳۲ء میں آزمائشی طور پر ۲۷ بسوں سے بعض خاص راستوں پر ابتدا کی گئی۔ اس اسکیم کے لئے ساڑھے چار لاکھ روپے منظور کئے گئے۔ منظم اور آرام دہ ریلوے بسوں کا مقررہ کرایہ اور مقررہ نظام الاوقات میں چلنے کی وجہ سے بہت جلد ہر دل عزیز ہو گئے۔ اس سے پہلے خانگی بس سرویس جاری تھی لیکن یہ غیر آرام دہ ہونے کے علاوہ مقررہ اوقات میں بھی نہ چلتی تھیں اور ریلوے سے ان کی مسابقت کا خطرہ تھا۔ اس پالیسی کے مالی نتائج اس قدر حوصلہ افزا ثابت ہوئے کہ روڈ ٹرانسپورٹ سرویس میں مزید توسیع کی حکمت عملی قبول کر لی گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء کے ختم پر ریلوے کی بس سرویس کا فاصلہ ۱۳۶۴ میل اور ۱۱۸ ریلوے بس چلتی رہیں ۱۹۳۷ء میں اہم اسٹیشنوں پر اس امر کا انتظام کیا گیا کہ تاجروں کے گودام سے اسٹیشن تک اور وہاں سے گودام تک اشیاء کا حمل و نقل لاریوں کے ذریعہ

ہو سکے ۴۲-۱۹۴۱ء کے ختم پر بس سروس ۲۶۷۴ میل کے طول پر حمل ونقل کا کام انجام دیتی رہی۔ یہ ۲۸۵ بسوں موٹروں اور ۲۵ سامان کی لاریوں پر مشتمل تھیں۔ مملکت آصفیہ کے شوارع کے تقریباً ۳/۴ مجموعی فاصلہ پر بس سروس جاری رہی ۴۲-۱۹۴۱ء کے ختم پر اس سروس پر ۶۷ لاکھ ۷۷ ہزار روپے کلدار کا سرمایہ لگایا گیا۔ اس سال خالص آمدنی ۴۴ لاکھ ۲۶ ہزار روپے کلدار ہوئی اور اخراجات ۲۷ لاکھ ۱۷ ہزار روپے کلدار ہوئے اور خالص منافع ۱۶ لاکھ ۵۴ ہزار روپے ہوا اس طرح کل لاگت پر ۷ر۹ فیصدی منافع حاصل ہوا۔

۱۹۳۶ء میں ریلوے کی تنظیم جدید کی گئی اور اس کے دو شعبے کر دیئے گئے ایک صیغہ تجارتی اور دوسرے ٹرانسپورٹیشن صیغہ تجارتی ریلوے سے متعلقہ تجارتی مسائل کرایہ جات، بیرونی ریلوے سے معاہدات تشہیر اور تصفیہ مقدمات و مطالبات کا کام انجام دیتا ہے۔ شعبہ ٹرانسپورٹیشن کا کام ٹرینوں پر کنٹرول اور نقل و حرکت پر نگرانی کرنا۔ یہ جدید تنظیم بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ ہندوستان کے لیئے ریجوڈ کمیٹی نے بھی اس کی سفارش کی تھی۔ مسافروں کو آرام اور سہولت پہنچانے کے لیئے ریلوے کی ایک مشاورتی کمیٹی بھی قائم ہے۔ حیدرآباد ریلوے بورڈ ۱۹۴۱ء سے لندن سے حیدرآباد میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

ریلوے کے سررشتہ کو اپنے ملازمین کے آرام اور سہولت کا خیال رہا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے رہائشی مکانات اور تفریح کے سامان فراہم کئے گئے ہیں۔ بچوں کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ طبی امداد بھی حاصل ہے۔ ریلوے کے بالغ ان پڑھ ملازمین کے لئے اضلاع میں جماعتیں قائم کی گئی ہیں تاکہ ان کی کارکردگی میں اضافہ ہو سکے۔ بمقام لالہ گوڑہ ایک مرکز بہبودی اطفال اور زچگی خانہ قائم کیا گیا ہے

واڑی، ورنگل اور سیدرتک ڈیزل کار چلانے کا انتظام کیا گیا ہے یہ درجہ سوم کے مسافرین کیلئے سہولت مہیا کرتے ہیں جو ہندوستان میں پہلی مثال ہے۔

حالیہ جنگ میں ریلوے ورکشاپ میں سامان جنگ بنانے کا کام بڑھتی ہوئی رفتار سے انجام

پاتا رہا۔ ہندوستانی افواج کے لئے میکانکس ڈرائیوروں کی تربیت کی اسکیم میں خاصی توسیع کی گئی۔

سڑکیں

سڑکوں کی حالیہ تاریخ | انیسویں صدی کے وسط تک بھی ہندوستان میں اچھی سڑکیں بہت کم تھیں لارڈ ولیم بنٹنگ نے شمالی ہند کو بنگال سے ایک شاہراہ کے ذریعہ ملانے کی تجویز کی تجدید کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پشاور سے دہلی اور دہلی سے کلکتہ تک ایک وسیع شاہراہ "گرانڈ ٹرنک روڈ" تعمیر ہو گئی۔

لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ سے سڑکوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور سڑکیں تعمیر کرنے کی ایک مستحکم پالیسی کی ابتدا ہوئی۔ مرکزی محکمۂ تعمیرات کا قیام عمل میں آیا اور ملٹری بورڈس کی بجائے (جو سڑکوں کی نگرانی کیا کرتے تھے) ۱۸۵۵ء میں ہر صوبہ میں تعمیرات کے سررشتے قائم کئے گئے۔ جب ریلوے کی تعمیر تیزی کے ساتھ شروع ہوئی تو سڑکوں کی تعمیر ضروری ہوئی تاکہ ریلوے کو اس سے مدد حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے ریلوں سے مسابقت مقصود نہ تھی۔ تاہم طویل مسلسل سڑکوں کی تعمیر کی جانب بہت کم توجہ کی گئی۔ کیونکہ حکومت ریلوں کے زیادہ نفع بخش کاموں کی طرف زیادہ مشغول تھی۔ لارڈ میو اور لارڈ رپن کے زمانہ میں مقامی حکومت خود اختیاری کی تدریجی پالیسی جو اختیار کی گئی اس کے باعث مقامی امور پر مقامی باشندوں کو اختیار حاصل ہوا جس سے سڑکوں کی تعمیر میں بھی بڑی ترقی ہوئی اور اس کے مجموعی طول میں مستقل طور پر اضافہ ہوا یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء کے ختم پر ۲۸۱۹۱ میل سڑکیں تیار ہو گئیں۔ اس طرح اگر روزانہ موٹر کے ذریعہ ۲۰۰ میل سفر کیا جائے تو چار سال کی مدت درکار ہو گی۔

ہندوستانی سڑکوں کی اہم خصوصیت | ہندوستانی سڑکوں کی اہم خصوصیات مختصراً حسب ذیل ہیں۔ ملک میں چار بڑی شاہراہیں موجود ہیں جن سے ذیلی سڑکیں ملائی گئی ہیں۔

(۱) سب سے مشہور شاہ راہ ملک کے شمالی حصہ میں خیبر سے کلکتہ تک جاتی ہے جو قدیم زمانہ میں فوجی شاہ راہ تھی۔ (۲) کلکتہ سے مدراس تک (۳) مدراس سے بمبئی تک (۴) بمبئی سے دہلی تک۔

۳۸-۱۹۳۷ء میں برطانوی ہند میں پختہ سڑکیں ۶۴۰،۰۷ میل تھیں ان میں پانچ ہزار میل کی مندرجہ بالا چار بڑی شاہراہیں بھی شامل ہیں۔ جنوبی ہند اپنی سڑکوں کی تعداد اور اپنی ذیلی سڑکوں کی عمدگی کی وجہ سے بہت قابل رشک ہے۔ سڑکوں کے لحاظ سے راجپوتانہ، سندھ پنجاب کے کچھ حصے، اڑیسہ اور بنگال بہت پس ماندہ حصے ہیں۔ بنجر مقامات آبادی کے فاصلہ کی درازی، دشوار اور ناقابل عبور آبی گذرگاہیں میدانوں کی مشکلات (جیسا کہ ہمالیہ کے دامن میں ہے) سڑکوں کی تعمیر میں تعمیری اشیاء کا فقدان وغیرہ وہ چند مشکلات ہیں جو فوری ترقی میں مانع ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں کچی سڑکیں بھی ہیں ۳۸-۱۹۳۷ء میں ان کا طول ۲۲۰،۴۸۵ میل تھا۔ اکثر کچی سڑکیں بھی موسم گرما میں موٹر کے عبور و مرور کے لئے موزوں ہیں۔

مزید سڑکوں کی ضرورت رقبہ کے لحاظ سے ہندوستان میں بہت ہی کم سڑکیں ہیں۔ سڑکوں کی قلت اس وجہ سے بھی محسوس ہو رہی ہے کہ موٹر کے ذریعہ حمل و نقل میں سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس سے سڑکوں کی تعمیر اور نگہداشت کے متعدد مسائل پیدا ہو چکے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ایک لاکھ نفوس کی آبادی میں پچیس ہزار میل کی سڑکیں ہیں تو ہندوستان میں صرف ۸۴ میل کی سڑکیں ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں جہاں مزید اور بہتر سڑکوں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے موجودہ سڑکوں ہی کو اچھی حالت میں قائم رکھنے میں مشکلات حائل ہو رہی ہیں۔ ان سڑکوں کی حالت خصوصیت کے ساتھ بُری ہے جو مقامی مجالس کی نگرانی میں ہیں۔ کیونکہ ان مجالس کے ذرائع اور وسائل نہایت محدود ہیں ملک کی وسیع داخلی اور خارجی تجارت کا بوجوہ احسن انتظام کرنے، زرعی پیداوار سے متعلقہ مصنوعات کی تیاری و نشو و نما اور جنگلات کے مفید وسائل سے مستفید ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ ملک بھر میں شاہراہوں اور ذیلی سڑکوں کا جال بچھا دیا جائے۔

ریلوے لائن اور سڑکوں کے مابین ارتباط سڑکوں کی ترقی سے ریلوں پر مضر اثر نہ پڑنا چاہیئے حقیقت میں ریلیں ذیلی اور الحاقی سڑکوں سے قابل لحاظ فائدے حاصل کرینگی۔ جہاں

تک کم فاصلہ اور قلیل التعداد افراد کے سفر کا تعلق ہے موٹروں کو ریلوے پر فوقیت حاصل ہے لیکن دور دراز فاصلے کے سفر و ثقیل اشیاء کے حمل و نقل کے لئے ریلیں نسبتاً زیادہ آرام دہ اور کم خرچ ذریعہ حمل و نقل ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی سڑکیں اور ریل مسابقت سے زیادہ ایک دوسر کے لئے ممد و معاون ہونا چاہیئے۔ موجودہ زمانہ میں ریل اور سڑک کے ذریعہ حمل و نقل میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر زیادہ توجہ کی جارہی ہے۔ شملہ میں روڈ ریل کانفرنس جو منعقد ہوئی اس میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی اور ۱۹۳۷ء میں ویجوڈ انکوائری کمیٹی نے بھی تحقیقات کی۔ اس کمیٹی کی سفارشات پر ۱۹۳۹ء میں قانون سواری ہائے موٹر مرکزی مقننہ میں منظور ہوا۔ موٹر لاریوں اور بسوں کے قواعد بھی مرتب ہوئے تاکہ ان کو مفاد عامہ کی خاطر استعمال کیا جاسکے۔ ان ہی قواعد کے تحت صوبہ داری حکومتوں کو سڑکوں پر نقل و حمل کی نگرانی کا اختیار دیا گیا ہے تاکہ ریلوں اور سڑکوں میں نامناسب مسابقت نہ ہونے پائے۔ اس نئے قانون کے نفاد کے بعد توقع ہے کہ نقل و حمل کے ذرائع میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ جنگ کی وجہ ریل و موٹر میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی پٹرول کی کمی کی وجہ سے سڑکوں سے مسابقت کم ہو گئی ہے۔

سڑکوں کی جدید پالیسی | ہندوستان کے سڑکوں کی ترقی کے مسائل پر غور کرنے کیلئے ۱۹۲۷ء میں ایک خاص روڈ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کمیٹی نے سڑکوں کی ایک وسیع پالیسی اختیار کرنے اور مقامی مجالس سے ربط قائم کرنے پر زور دیا۔ اس کمیٹی نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سڑکوں کو ترقی دینے کا کام صوبہ جاتی حکومتوں اور مقامی مجالس کے مالیاتی حدود سے متجاوز ہو رہا ہے۔ قومی مفاد کا مسئلہ ہونے کے باعث اس کا تعلق بڑی حد تک مرکزی حکومت کے مالیات سے ہونا چاہیئے۔ روڈ کمیٹی نے اس کی بھی سفارش کی کہ صوبوں کی آمدنی سے مقامی مجالس کو فیاضانہ امداد عطا کی جانی چاہیئے۔

روڈ کمیٹی کے سفارشات کے بموجب مارچ ۱۹۲۹ء میں پٹرول پر درآمدی محصول اور چنگی چار آنہ سے بڑھا کر چھ آنے فی گیلن کردی گئی۔ اس زائد محصول کی آمدنی سڑکوں

کی ترقی کے لئے محفوظ کردی گئی اور ایک علیحدہ کھاتہ میں اس رقم کا اندراج ہونے لگا۔ اس رقم سے حکومت ہند کا سالانہ حصہ ۱۵ فیصدی علیحدہ کرنے کے بعد (اس کی مقدار سنہ ۱۹۳۴ء تک دس فیصدی تھی) ہر صوبہ کو اس کے پٹرول کے صرفہ کے تناسب سے رقم سالانہ تقسیم کردی جاتی ہے۔ یہ رقم ان اسکیموں پر صرف کیجاتی ہے جس کو سرکزی مقننہ کی سڑکوں کی مجلس قائمہ کے مشورہ سے گورنر جنرل باجلاس کونسل کی منظوری حاصل ہو سڑکوں سے متعلق مسائل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے صوبہ جاتی حکومتوں کے نمائندے مذکورہ صدر مجلس قائمہ کے مشاورتی اجلاسوں میں شرکت کرتے ہیں سنہ ۱۹۳۷ء میں اس پالیسی کو مستقل صورت دی گئی۔ اگر کوئی صوبہ داری حکومت اپنے حدود کے اندر موٹر گاڑیوں کے حمل و نقل کی تنظیم یا اس پر نگرانی رکھنے سے قاصر رہ جائے تو قرارداد بابتہ سنہ ۱۹۳۷ء کی رو سے حکومت ہند کو مجاز گردانا گیا ہے کہ پٹرول کے محاصل میں اس کا حصہ رسدی مسدود کردے۔ جنگ کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء میں موٹروں کی درآمد بند کردی گئی اور ساتھ ہی فوجی اغراض کے لئے موٹروں کی طلب میں اضافہ ہوا۔ جنگ کے دوران میں پٹرول کا صرفہ بڑھ گیا۔ اور اسکی رسدمیں کمی ہوگئی۔ اس لئے حکومت ہند نے سنہ ۱۹۴۱ء میں پٹرول کی راشننگ کا آغاز کیا پٹرول کے بدل کے طور پر کول گیاس کا استعمال کیا جانے لگا۔

حیدرآباد میں سڑکیں تمام اہم شہروں اور اضلاع کے مستقر اور بلدہ حیدرآباد کے مابین آمد و رفت کا ذریعہ قائم کرنے کے لئے سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک پروگرام مرتب کیا گیا جسکی رو سے ۱۱۴ میل کے سڑکوں کی درستی اور ۲۱۲۰ میل کے جدید سڑکوں کی تعمیر ہوئی سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک ۵۴ میل کی جدید سڑکیں مکمل ہوئیں اور تجارت کے لئے کھل گئیں جس سے ان سڑکوں کی مسافت جن کی نگہداشت ختم سنہ ۱۹۲۱ء پر منجانب سررشتہ تعمیرات ہوئی ۲۶۲۵ میل ہوتی ہے۔

اضلاع عادل آباد اور محبوب نگر اور بعض انقطاع ورنگل، اور کریم نگر میں گھنے جنگل موجود ہیں۔ ان مقامات پر جو سڑکیں بنائی گئی ہیں وہ نہ صرف دیہی ترقیات کے لئے بلکہ جنگلات

کی پیداوار مثلاً بانس اور چوبینہ وغیرہ کی برآمد کے لئے تعمیر کئے گئے ہیں۔ نظام ساگر، ویرا اور ڈلیر کے خزانۂ آب کے تحت جو آبپاشی کے بڑے بڑے رقبہ جات ہیں۔ یہاں خاص طور سے سڑکوں کی ضرورت ہے تاکہ کثیر مقدار میں زرعی پیداوار بازار اور ریلوے کے مقامات تک روانہ کی جاسکے ان اقطاع میں سڑکیں زیر تعمیر ہیں۔ مملکت آصفیہ میں جہاں سونے، کوئلہ اور چونے وغیرہ کی معدنیں موجود ہیں وہاں سڑکیں تعمیر ہو چکی ہیں اور مزید سڑکیں زیر تعمیر ہیں۔

مملکت کے شمال مغربی حصے میں سطح مرتفع کا علاقہ ہے۔ ان پر گھاٹ روڈ تعمیر کئے گئے ہیں۔ دولت آباد، ایلورہ اور اجنٹہ کے گھاٹ روڈ تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔

مملکت کی زراعت اور صنعت و حرفت کو ترقی دی جانے کے لئے مزید سڑکوں کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے حکومت ہند کی طرف سے محصول پٹرول کا ایک حصہ سالانہ حکومت سرکار عالی کو ملا کرتا ہے جو ترقی شوارع کی مد کے لئے مختص کر دیا گیا ہے سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں جو رقم اس گنجائش سے وصول ہوئی اس کی مقدار ۲ لاکھ ۹۱ ہزار روپے کلدار تھی۔ اس گنجائش سے بہت سی سڑکوں کی تعمیر پر روپیہ صرف کیا گیا۔ موٹر گاڑیوں کے محصول سے جو رقم وصول ہوتی ہے اس کی گنجائش سے بھی سالانہ ڈھائی لاکھ روپے سڑکوں اور پلوں کی تعمیر و اصلاح کے لئے مختص کر دیئے جاتے ہیں۔

تعلقوں کے اہم قصبات اور تجارتی مرکزوں کو اضلاع کے مستقروں اور بلدہ حیدرآباد سے ملانے اور جہاں کہیں ہو ان کے لئے ریلوں کا راستہ قریب تر کر دینے، موجودہ سڑکوں پر نالے، سنگ بستہ راستے اور پل تعمیر کرنے نیز موٹروں کی بڑھتی ہوئی آمد و رفت کے خیال کرتے ہوئے موجودہ موسم سڑکوں کو مثل اندازی سے زیادہ مضبوط بنانے کا لائحہ عمل بدستور پیش نظر ہے۔

سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء کے ختم تک سررشتۂ تعمیرات نے جن سڑکوں کی دیکھ بھال اور مرمت کی ان کی مجموعی لانبائی ۲۳۴۵ میل تھی۔ سررشتۂ لوکل فنڈ کی جانب سے جو سڑکیں باقی

جاتی ہیں وہ اس کے سوا ہیں۔

مملکت کا جملہ رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل ہے اور یہاں ۵۳۳۶ میل کی پختہ سڑکیں ہیں اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مربع میل میں ایک میل کی پختہ سڑکیں ہیں۔

حیدرآباد میں روڈ پروگرام کی جدید اسکیم مرتب کر لی گئی ہے اور عالیہ موازنہ میں اس کے لئے رقم مہیا کی گئی ہے۔

مملکت میں سڑکوں کی قلت کو دور کرنے کے لئے پلوں کی تعمیر بھی ضروری ہے تاکہ آسانی سے نقل و حمل ہوسکے۔ حکومت سرکار عالی کی جانب سے بڑے بڑے دریاؤں پر پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ دریائے گوداوری جو مملکت میں سات سو میل تک بہتی ہے۔ اس پر نو مقامات پر پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دریائے مانجرا، بھیما، پین گنگا، تنگھدرا اور موسٹی پر بھی پل تعمیر کئے گئے ہیں۔ بہرحال یہاں مزید پلوں کی ضرورت ہے۔

مملکت کے پایۂ تخت میں سمنٹ اور ڈامبر کی سڑکیں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔ ہندوستان میں حیدرآباد اگرچہ چوتھا بڑا شہر ہے لیکن سمنٹ کنکریٹ کی سڑکیں جدید وضع کی سب سے زیادہ طول میں تعمیر کی گئی ہیں۔ ان کی تعمیر سے نہ صرف شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ گرد آلود سڑکوں سے جو بیماریاں پھیلتی ہیں ان کا انسداد ہوچکا ہے۔

آب راہوں کے ذریعہ حمل و نقل

اندرون ملک کی آب راہیں ریلوں کے دور سے قبل وزنی اشیاء کے لانے لیجانے میں آب راہوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آجکل بھی اندرون ملک تجارت میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ریلوں کے وجود میں آنے کے بعد سے اندرونی تجارت میں اب راہوں کا استعمال ان کے بعض فوائد اور ارزانی کے باوجود بہت کچھ گھٹ گیا ہے۔ آب راہوں کے ذریعہ حمل و نقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اندرونی آب راہیں (۲) بحری حمل و نقل۔

شمالی ہند کے بڑے بڑے دریاؤں کے ذریعہ کافی حمل و نقل ہوتی ہے دریائے سندھ، گنگا اور برہم پتر تمام سال سینکڑوں میل تک جہاز رانی کے قابل رہتے ہیں۔ دریائے سندھ کے معاون چناب اور ستلج میں بھی تمام سال کشتی رانی ہوتی ہے۔ دکن کے دریا عام طور پر جہاز رانی کے قابل نہیں ہیں کیونکہ وہ سال بھر نہیں بہتے اور پہاڑی حصوں میں سے گذرتے ہیں۔ لیکن مہاندی گوداوری اور کرشنا کے بالائی حصے کشتی رانی کے قابل ہیں اندرونی جہاز رانی جس کا قدیم زمانہ میں رواج تھا۔ (چنانچہ دریائے گنگا دریائی تجارت کا بہت بڑا ذریعہ رہا ہے) ریلوے کے وجود میں آنے کے بعد سے متاثر ہوچکی ہے۔ صنعتی کمیشن بابتہ ۱۹۱۸ء نے ریلوے اور آب راہوں کے نظم ونسق میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر زور دیا تھا تاکہ ریلوے نظام کی خامیوں کو دور کرکے ملک میں پیمانہ صغیر کی حمل و نقل کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔

بحری حمل و نقل ہندوستان قدرتاً جہاز رانی کے لئے موزوں ہوسکتا ہے۔ اور جہاز رانی کے ذریعہ دنیا میں ترقی یافتہ ملک ہونے کی بجا طور سے توقع کرسکتا ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک ہندوستان ایک بحری ملک کہلایا جاسکتا تھا۔ جہاز رانی کی صنعت ترقی یافتہ حالت میں تھی۔ اور تجارتی اشیاء کی ایک بڑی مقدار ہندوستان میں بنے ہوئے جہازوں میں بار کی

جاتی تھی۔ لوہے کے جہازوں کی ایجاد بحری ساز و سامان کی ساخت میں اصلاح و ترقی اور انگریز جہازران طبقہ کی رقابت کے باعث ہندوستانی جہاز سازی کی صنعت تباہ ہوگئی۔ ساحلی تجارت میں ہندوستان کا حصہ ۲۵ فیصدی اور بیرونی سمندروں میں تو صرف دو فیصدی ہے۔ کاروبار میں منافع کا یہ بڑا شعبہ موجودہ زمانہ میں بیرونی جہازران کمپنیوں کے زیر نگرانی ہے جن کی مسابقت ایک ہندوستانی تجارتی بحریہ کی فوری ترقی میں مانع ہے۔ گلوتراش متقابلہ کم کرایہ اور سامان کے حمل و نقل کے اخراجات میں تخفیف جیسے مسابقتی تدابیر ہندوستانی جہازی کمپنیوں کی ترقی میں حایل ہیں۔

ہندوستانی تجارتی جہازرانی تجارتی جہازرانی کمیٹی بابتہ ۱۹۲۳ء نے ہندوستانی تجارتی جہازرانی کی ترقی کے لئے بہت زور دیا تھا۔ اس کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ساحلی تجارت کا حق ان جہازوں کے لئے محفوظ کر دیا جائے جو ہندوستانیوں کی نگرانی میں ہیں ۱۹۲۸ء میں مسٹر ایس این حاجی نے مرکزی مقننہ میں ایک مسودہ قانون پیش کرنے کی بے فائدہ کوشش کی کہ ساحلی تجارت کا حق صرف ہندوستانی جہازوں کو دیا جائے ۱۹۳۷ء میں بھی اس طرح کی ایک اور کوشش کی گئی۔ ہندوستانی تجارتی جہازران کمیٹی کی سفارش پر بہرحال حکومت نے جہازرانی کی تربیت پانے والے ہندوستانی امیدواروں کے لئے ایک تربیتی جہاز موسوم بہ ڈفرن مہیا کیا ہے۔

وزاگاپٹم میں جہازسازی کا کارخانہ تجارتی جہازران کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی تھی کہ کسی ہندوستانی کمپنی اور حکومت کی مدد سے جہازرانی کا کارخانہ ہندوستان میں قایم کیا جائے۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے اس بات کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر بحری ملک کو اپنے جہاز اپنے ہی ملک میں تیار کرنے چاہئے۔ بہرحال وزاگاپٹم جیسے موزوں مقام پر جہازسازی کا کارخانہ قائم ہوچکا ہے۔ جہاں آٹھ ہزار سے بارہ ہزار ٹن کے جہاز تیار ہورہے ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس صنعت میں تین ہزار سے چار ہزار مزدوروں کی کھپت ہوگی اور ہر سال ۱۶ جہاز تیار ہونگے۔

ہوائی جہاز | ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ہوابازی نے مغربی ممالک میں خصوصاً زیادہ ترقی کی ہے جسکی وجہ سے حمل ونقل کے ذرائع میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا ہے۔

ہندوستان میں غیر فوجی ہوابازی کا شوق اس وقت ہوا جبکہ کراچی اور بمبئی کے درمیان ہوائی ڈاک کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس کے بعد انگلستان اور کراچی کے درمیان ہوائی ڈاک اور ہوائی آمدورفت قائم کی گئی۔ حکومت ہند نے ایک ناظم ہوائیہ کا بھی تقرر کیا۔ پرواز کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے مدنظر بتدریج ترقیاں ہوئیں اور اس کے خانگی کلب بھی قائم ہوئے ۱۹۴۱ء میں یہاں ایسے دس کلب قائم تھے۔ حکومت کی جانب سے ان کی امداد بھی کی جاتی ہے تاکہ نوجوانوں کو ہوابازی کی ٹریننگ دی جائے۔ ٹاٹا کمپنی نے حکومت ہند کی سرپرستی اور امداد سے کراچی اور بمبئی وغیرہ بمبئی اور مدراس کے درمیان ہوائی سرویس قائم کی جس سے نہ صرف مسافروں کی آمدورفت کے لئے ایک نیا ذریعہ پیدا ہوا۔ بلکہ ڈاک کو زاید خرچ ادا کرنے کے بعد جلد تر بھیجنے کا امکان بھی ہوا۔

سیٹھ وال چند ہیرا چند نے بنگلور میں چار کروڑ روپیہ کے مشترکہ سرمایہ سے طیارہ سازی کا ایک کارخانہ قائم کر دیا ہے۔ بنگلور کا مقام اس لئے پسند کیا گیا ہے۔ کہ یہاں ارزاں قوت برقی اور بھدراوتی کے کارخانہ سے اعلیٰ درجہ کا فولاد حاصل ہوتا ہے۔ حکومت ہند نے سالانہ کم از کم پچاس طیارے اس کارخانہ سے خریدنے کا وعدہ کیا ہے اور ضروری مشنری باہر سے خریدنے میں مدد دے گی۔ اس کارخانہ میں دو ہزار سے زاید ماہر فن کاریگر کام پر لگائے گئے ہیں جو ۲۰۰ سند یافتہ انجینیروں کی راست نگرانی میں کام کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں ہوائی حمل ونقل | حکومت سرکار عالی کے قبضہ میں کوئی بندرگاہ موجود نہیں ہے اس لئے یہاں ہوائی حمل ونقل میں ترقی کے امکانات موجود ہیں۔ بیگم پیٹ میں ہوائی بندرگاہ کی عمارت کا سنگ بنیاد نومبر ۱۹۳۶ء میں رکھا گیا۔ ٹاٹا اینڈ سنس کی ایر میل سرویس بھی قائم کیگئی اورنگ آباد، ورنگل، رائچور، بیدر، محبوب نگر، عادل آباد، عثمان آباد، مومن آباد اور دیور کنڈہ میں ہوائی اسٹیشنوں کی تعمیر کے لئے پیمائش کی جاچکی ہے۔ سررشتہ فضائی واقع بیگم پیٹ وسیع پیمانے

پر ہندوستانی فضائی فوج کے ہوابازوں کی ٹریننگ کے اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔

خارجی تجارت

ہندوستان کی خارجی تجارت کی تاریخ | تین سو سال قبل مسیح سے ہندوستان نے بابل، مصر، روما یونان، چین، ایران اور عرب سے تجارتی تعلقات قائم کر دیئے تھے۔ قدیم زمانہ کی یہ تجارت قیمتی اور کمیاب اشیاء کی ہوتی تھی۔ برآمدی اشیاء میں نفیس پارچے، دھاتی برتن، ہاتھی دانت، عطر، رنگ گرم مسالے وغیرہ شامل تھے۔ اس کے مقابل پیتل، ٹن، جست، شراب، گھوڑے وغیرہ کی درآمد ہوا کرتی تھی۔ سونا بھی کثیر مقدار میں درآمد ہوتا تھا۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سونے کی برآمد کے مقابل درآمد زیادہ تھی جو ہمیشہ سے ہندوستانی خارجی تجارت کی خصوصیت رہی ہے مسلمانوں کے زمانہ میں شمال مغربی سرحد سے ہوکر ایران اور دوسرے شمالی ممالک کے ساتھ ہندوستان کے جو تعلقات قائم ہوگئے وہ بیرونی تجارت کا مزید موجب ہوئے۔ پندرھویں صدی کے اختتام پر واسکوڈی گاما نے احمد بن ماجد کی ناخدائی میں راس امید سے ہوکر ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا اور اس طرح مغرب اور مشرق کے مابین عہد آفرین تعلقات قائم ہوگئے پرتگال، ہالینڈ، انگلستان اور فرانس نے ہندوستان سے تجارتی اجارہ کے لئے جدوجہد کی۔ آخر کار انگلستان نے دوسری قوموں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی تجارت پر اپنا قبضہ جمالیا۔ اور بالآخر یہاں سیاسی اقتدار بھی حاصل کرلیا۔ انیسویں صدی کی ابتدا سے ملکی صنعتوں کا زوال بعض معاشی اور سیاسی اسباب کی بنا پر جو عمل میں آیا اور دیہاتی زندگی کی ترقی کا تذکرہ اس سے قبل کیا جاچکا ہے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر ہندوستان کی خارجی تجارت کی نوعیت میں تبدیلی واقع ہوئی اور ملک سے بڑی مقدار میں خام پیداوار اور اشیائے خوراک برآمد ہونے لگے اور درآمد خاص طور پر مصنوعات کی ہونے لگی۔

دکن کی تجارت سلطنت آصفیہ کے دور میں | دکن پر آصفی پرچم لہرانے کے ساتھ ہی ہندوستان بھر میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا، ہر طرف خانہ جنگی کا زور تھا۔ اقوام یورپ کو جدا کشور کشائی کا خیال پیدا ہوا، ان اُمور کا اثر تجارت پر پڑا۔ یورپی اقوام کی تجارتی مسابقت اور جنگ و جدل کی وجہ سے ایران، افغانستان، اور وسط ایشیا کی تجارت ختم ہونے لگی۔ اب تجارتی منڈیاں سواحل کے شہر بننے لگے۔ دکن کے قدیم تجارتی بازار اُجڑ گئے اور ہر جگہ یوروپین تاجر پھیل گئے۔

آصف جاہ اوّل کے دور میں فرانسیسی اور ڈچ تاجروں کا زور تھا، اور وہ انگریزوں کے تجارتی کاروبار کو نقصان پہونچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عرضیاں دربار آصفی میں امداد و حمایت کی غرض سے آتی تھیں، اور یہاں ان کی فریاد رسی ہوتی تھی۔

آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ایک تجارتی معاہدہ ۱۸۰۲ء میں ہوا جس کی رو سے سرکار عالی نے تمام تجارتی محاصل موقوف کر دیئے۔ پانچ فیصد سے زائد محصول تجارت کسی چیز پر بلا رضامندیٔ فریقین معاہدہ نہ لینے کا اقرار کیا گیا۔ انگریز بلا مزاحمت تجارت کرنے کے مجاز کئے گئے کمپنی نے اس کے عوض یہ معاہدہ کیا کہ رعایائے سرکار آصفیہ کو بلا کسی روک ٹوک کے ممالک ہند میں حق تجارت حاصل ہے۔ علاوہ بریں سرکار عالی کو حق ہے کہ تجارتی جہازی بیڑا بنائے اور ان پر اپنا پرچم لہرا کے مچھلی بندر میں تجارتی کوٹھی قائم کرے، ایجنٹوں کو مقرر کرے۔ بحری تجارت سواحلی ہند پر آزادی کی جائے۔ سرکار عالی کے ملک سے برآمد ہونے والے مال پر بھی پانچ فی صد سے زائد محصول نہ لیا جائیگا۔

مذکورہ بالا معاہدہ قلمرو آصفی کی تاریخ میں ایک اہم چیز ہے، تمام تجارتی انتقالات اور محاصلات سرکاری اب اسی کی پابندی سے جاری ہیں۔

اس عہد نامہ سے سرکار عالی اور اس کی رعایا نے ایسا کوئی نمایاں فائدہ حاصل نہیں کیا جس طرح دوسرے فریق معاہدہ اور اس کی رعایا نے حاصل کیا۔ تجارتی جہازی بیڑا بنانے اور مچھلی بندر میں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کا ارادہ کبھی قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ کہا جاتا ہے کہ سرکار عالی کے چند جہاز

گزشتہ صدی میں سمندروں میں چلتے تھے، لیکن وہ صرف حاجیوں کے لانے لے جانے کے ہی کام میں آتے رہے اور ناکارہ ہو جانے پر فروخت ہو گئے۔

لارڈ کیننگ وائسرائے ہند نے آصف جاہ خامس سے بذریعہ عہد نامہ جدید ایسٹ انڈیا کمپنی وغیرہ کے معاہدات کی تجدید کی تو اس میں ایک فقرہ تجارتی پالیسی کے متعلق بھی حسب ذیل داخل کیا گیا:۔

جہازرانی دریائے گوداوری اور اس کی شاخوں میں جہاں تک حدود سرکاریں واقع ہیں بلا مزاحمت ہوا کرے گی، اور کوئی محصول راہداری دونوں فریق معاہدہ وصول نہ کریں گے۔ اور نہ ان کی رعایا بھی دریائے مذکور پر آمد و رفت میں کوئی محصول حاصل کرے گی۔" سابقہ معاہدات کی تجدید کے بعد ۱۸۶۲ء میں سررشتہ کروڑگیری قائم کیا گیا، اور جابجا سررشتہ کروڑگیری کے محصول خانے اور چوکیاں قائم کی گئیں اور تجارتی محصول زمانہ حال کے مروجہ اصول پر لیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت اور سرکاری آمدنی میں اضافہ شروع ہوا۔

ہندوستان کی خارجی تجارت کا ارتقاء ہندوستان کی خارجی تجارت میں ۱۸۶۹ء کے بعد سے سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی جبکہ نہر سویز جہازرانی کے لئے کھول دی گئی۔ ملک میں ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے باعث خارجی اور داخلی تجارت میں ترقی ہوئی۔ ۱۸۶۴-۶۵ء تا ۱۸۶۸-۶۹ء کے درمیان پانچ سال کی مدت میں برآمد کی سالانہ قیمت کا اوسط ۵۵ کروڑ ۸۶ لاکھ روپے تھا تو ۱۹۲۴-۲۵ء تا ۱۹۲۸-۲۹ء کے پانچ سال کی مدت میں ۳۵۴ کروڑ روپے سالانہ ہو گیا۔ اسی مدت میں درآمد ۳۱ کروڑ ۷ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۲۵۱ کروڑ روپے کی ہو گئی۔ ملک میں امن و امان کا قیام، ذرائع حمل و نقل میں اصلاح جس میں بمبئی اور سویز کے درمیان آبدوز "تار" بچھانے سے مزید سہولت ہوئی۔ جہازوں کی ساخت میں اصلاح۔ اور دوسرے ملکوں میں تجارتی جہازرانی میں بسرعت ترقی ہونا، نیز ہندوستان میں داخلی محاصل، اور محاصل راہداری کی موقوفی اور آزاد تجارت کی پالیسی اس اضافہ کے خاص اسباب تھے۔ ایک عرصہ تک برطانیہ کو ہندوستانی بازار میں غلبہ حاصل رہا۔ انیسویں صدی کے اختتام پر جرمنی، جاپان، ممالک متحدہ

امریکہ اور دوسرے ممالک برطانیہ کے حریف بن گئے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں جاپان اور ممالک متحدہ امریکہ ہندوستان کی خارجی تجارت میں بڑا حصہ لینے لگے۔ حالیہ جنگ سے قبل جاپانی اشیاء نہ صرف برطانوی ساخت کی اشیاء کو بلکہ ہندوستانی ساختہ اشیاء کو بھی خود ہمارے ہی بازاروں میں نیچا دکھا رہے تھے۔ گذشتہ جنگ عظیم کی وجہ سے ہندوستان کی خارجی تجارت میں خصوصاً درآمد کو عارضی طور پر نقصان پہونچا۔ لیکن برآمدی تجارت اسی تناسب سے متاثر نہیں ہوئی کیونکہ ہندوستان کی اہم درآمدی اشیاء کی طلب بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ جنگ کے اختتام کے بعد دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی تجارتی گرم بازاری کا دور دورہ رہا۔ جو بالآخر کساد بازاری پر منتج ہوئی۔ ایک عارضی بحالی کے بعد پھر ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک دنیا ایک طویل سخت اور عدیم النظیر معاشی کساد بازاری سے گذری۔ جس نے ہندوستان کی خارجی تجارت کو بری طرح متاثر کردیا۔ اشیاء برآمدی کی تجارت کے بالمقابل درآمدی اشیاء کی تجارت کو زیادہ نقصان ہوا کیونکہ خام پیداوار اور اشیائے خوراک کی قیمتیں دیگر مصنوعات کے مقابلہ میں نسبتاً بہت گھٹ گئی تھیں۔ اور ہندوستان کی اہم اشیائے برآمد کی طلب بھی کم ہوچلی تھی ۱۹۳۲-۳۳ء میں خارجی تجارت ۱۳۶ کروڑ روپے کی مالیت تک گھٹ چکی تھی۔ اور ۱۹۳۳-۳۴ء میں اشیائے درآمد کی تجارت ۱۱۷ کروڑ روپے کی جیسی قلیل مقدار تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد سے کسی قدر ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۷-۳۸ء میں ۱۸۱ کروڑ روپے کے مال کی برآمد اور ۱۷۳ کروڑ روپے کے مال کی درآمد ہوئی۔ ہندوستان کا توازن تجارت جو پہلے ہندوستان کے موافق رہتا تھا۔ وہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں تین کروڑ تک کم ہوگیا۔ جس میں اب جزوی طور پر اصلاح ہو رہی ہے ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۲۱۴ کروڑ روپے کی برآمد اور ۱۶۵ کروڑ روپے کی درآمد ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں ہندوستان کی درآمد اور برآمد پر بعض پابندیاں عاید کردی گئی ہیں جن ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں ہیں ان ممالک سے تجارت ممنوع کردی گئی ہے۔

ہندوستان کی خارجی تجارت کی نمایاں خصوصیات | مندرجہ ذیل دو جدولیں ۱۹۴۰-۴۱ء اور

سالہا ئے ماقبل کے دوران میں برطانوی ہند کی اشیائے درآمد و برآمد کی تقابلی اہمیت کو واضح کرتی ہیں

ہندوستانی تجارت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی برآمد زیادہ تر اشیائے خوردنی اور خام پیداوار اور درآمد کا بیشتر حصہ مصنوعات پر مشتمل ہے۔ جنگ عظیم کے بعد صنعتی ترقی کی وجہ سے مصنوعات کی برآمد کے فی صدی تناسب میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۷۳٫۶ فی صدی درآمد جزاً یا کلاً تیار شدہ مصنوعات پر مشتمل تھی اس کے بالمقابل جنگ سے قبل اس کا تناسب ۶۷٫۶ فیصدی تھا اور تقریباً ۲۳ فیصدی برآمد خام پیداوار اور اشیاء خوردنی پر مشتمل تھی اور جنگ سے قبل ۷۲٫۹ فیصدی۔

ہندوستانی تجارت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ درآمد میں قسم قسم کی چیزیں شامل ہیں مگر برآمد نسبتاً چند اہم اشیاء مثلاً خام کپاس، جوٹ، چائے، روغنی تخم اور غلہ تک محدود ہے۔

تیسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کی خارجی بالخصوص درآمد تجارت میں انگلستان کا نمایاں حصہ شامل ہے لیکن ہندوستان کی برآمد کا جہاں تک تعلق ہے انگلستان گو اہم ترین واحد خریدار ہے لیکن اس تجارت میں دوسرے ممالک بھی حصہ دار ہیں۔

ہندوستانی تجارت کی آخری اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ برآمد زیادہ اور درآمد کم ہے۔ ہم بہت زیادہ قیمت کا مال بھجواتے ہیں اور نسبتاً کم قیمت کا مال منگواتے ہیں۔

مندرجۂ ذیل جدول کے ذریعہ ان اہم اشیاء کی تقابلی اہمیت واضح کی گئی ہے جو ۱۹۳۸-۳۹ء، ۱۹۳۹-۴۰ء، ۱۹۴۰-۴۱ء میں برطانوی ہند میں درآمد کی گئیں۔

لاکھوں روپے میں

اشیاء	سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں تجارت جملہ درآمد کا فیصدی تناسب
(۱) کپاس اور پارچہ	۲۲۶۶	۲۲۱۰	۲۰۸۲	۱۳٫۲۸
(۲) غلہ، دالیں اور آٹا	۱۳۷۶	۲۱۸۰	۱۴۳۵	۹٫۱۵
(۳) مشنری کارخانہ کی مصنوعات	۱۹۰۵	۱۴۶۷	۱۱۱۶	۷٫۱۲
(۴) مصنوعی سلک	۲۲۴	۴۵۹	۵۴۴	۳٫۴۷
(۵) رنگ اور اشیائے دباغت	۳۱۴	۳۶۱	۵۳۰	۳٫۳۸
(۶) آلات و اوزار	۵۸۵	۵۵۸	۴۹۸	۳٫۱۸
(۷) اون (خام اور تیار شدہ)	۲۸۲	۲۱۶	۴۲۸	۲٫۷۳
(۸) کاغذ اور مقوے	۳۲۳	۳۴۶	۳۹۲	۲٫۵۲
(۹) لکڑی اور چوبینہ	۲۸۷	۲۷۰	۲۸۹	۱٫۸۵
(۱۰) اشیائے خوردنی اور کھانے	۲۴۸	۲۶۳	۲۲۶	۱٫۴۴
(۱۱) مسالے	۲۶۳	۲۵۴	۲۱۹	۱٫۴۰
(۱۲) ادویات	۲۲۰	۲۶۱	۲۱۸	۱٫۴۰
(۱۳) آہنی سامان	۲۵۷	۲۲۶	۲۰۶	۱٫۳۲
(۱۴) دیسی شراب	۲۱۱	۲۱۹	۲۰۰	۱٫۲۸
(۱۵) سلک خام اور تیار شدہ	۱۹۴	۱۸۲	۱۷۲	۱٫۱۰
(۱۶) ربر کی مصنوعات	۱۳۱	۱۴۸	۱۵۶	٫۹۹
(۱۷) چائے کے چوبی صندوق	۹۰	۸۳	۱۳۴	٫۸۶

(۱۸) تمباکو	۱۰۴	۱۱۷	۱۳۴	٫۸۵
(۱۹) سامان مصوری	۸۹	۱۰۲	۱۰۲	٫۶۵
(۲۰) میوے اور ترکاریاں	۱۳۴	۱۲۱	۱۰۲	٫۶۵
(۲۱) شیشہ اور کانچ کا سامان	۱۲۵	۱۰۲	۸۶	٫۵۵
(۲۲) کھاد	۱۰۵	۱۲۵	۸۰	٫۵۱
(۲۳) عمارت سازی اور انجنیرنگ کے اشیاء	۶۲	۵۶	۶۶	٫۴۲
(۲۴) دھاتی پتر	۴۹	۵۳	۶۲	٫۴۰
(۲۵) صادر کا سامان	۶۷	۶۴	۵۷	٫۳۶
(۲۶) دوسری متفرق اشیاء	۵۳۱۶	۶۰۸۶	۶۱۴۳	۳۹٫۲۴
درآمد کی کل قیمت	۱۵۲۳۶	۱۶۵۲۸	۱۵۶۷۹	۱۰۰

از ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا بابتہ ۴۱-۱۹۴۰ء

جدول نمبر (۲) برآمد

مندرجہ ذیل جدول کے ذریعہ ان اہم اشیاء کی اہمیت واضح کی گئی ہے جو ۳۹-۱۹۳۸ء، ۴۰-۱۹۳۹ء اور ۴۱-۱۹۴۰ء میں برطانوی ہند سے برآمد کی گئیں۔

اشیاء	۳۹-۱۹۳۸ء	۴۰-۱۹۳۹ء	۴۱-۱۹۴۰ء	۴۱-۱۹۴۰ء میں تجارت کی جملہ برآمد کا فی صدی تناسب
(۱) خام جوٹ	۱۳۴۰	۱۹۸۳	۷۸۵	۴٫۲۰
(۲) جوٹ کی مصنوعات	۲۶۲۶	۴۸۷۲	۴۵۳۸	۲۴٫۲۹
(۳) خام اور ناکارہ کپاس	۲۳۶۷	۳۱۰۴	۲۴۳۵	۱۳٫۰۹

(۴) سوتی مصنوعات	۷۱۲	۸۵۷	۱۶۴۹	۸ر۸۳
(۵) چائے	۲۳۲۹	۲۶۳۱	۲۷۷۴	۱۴ر۸۵
(۶) تخم	۱۵۰۹	۱۱۸۹	۱۰۰۵	۵ر۳۸
(۷) چمڑا	۵۲۷	۷۶۹	۵۹۸	۳ر۲۰
(۸) غلہ، دالیں اور آٹا	۷۵۴	۵۰۹	۵۹۱	۳ر۱۶
(۹) خام چمڑا اور کھالیں	۳۸۴	۴۱۱	۳۱۴	۱ر۹۸
(۱۰) تمباکو	۲۷۵	۲۵۳	۲۸۸	۱ر۵۴
(۱۱) میوے اور ترکاریاں	۲۲۷	۲۳۷	۲۴۴	۱ر۳۱
(۱۲) خام اور تیار شدہ اون	۳۸۵	۴۰۳	۲۳۷	۱ر۲۷
(۱۳) لاکھ	۱۲۷	۱۹۱	۲۲۵	۱ر۲۱
(۱۴) خام ربر	۷۱	۹۴	۹۲	ر۴۹
(۱۵) کھلی	۳۰۱	۲۰۳	۸۴	ر۴۵
(۱۶) ناریل کا ریشہ (ناره)	۹۶	۱۲۸	۷۷	ر۴۱
(۱۷) سن	۷۲	۸۶	۷۶	ر۴۱
(۱۸) مسالے	۶۸	۱۰۸	۷۵	ر۴۰
(۱۹) اشیاء خوردنی	۵۹	۷۱	۷۳	ر۳۹
(۲۰) عمارت سازی اور انجینئرنگ کے اشیاء	۱۵	۳۱	۶۳	ر۳۴
(۲۱) مچھلی	۶۹	۷۰	۶۳	ر۳۴
(۲۲) رنگسازی اور دباغت کا سامان	۵۹	۷۱	۵۴	ر۲۹
(۲۳) بوٹ و شوز	۲۲	۲۹	۵۰	ر۲۶
(۲۴) کھاد	۳۷	۴۸	۴۶	ر۲۴

(۲۵) پیرافینی موم	۳۶	۳۳	۳۵	۱۹ر
(۲۶) ادویات	۲۸	۳۳	۳۴	۱۸ر
(۲۷) دوسری متفرق اشیاء	۱۹۶۰	۱۹۶۹	۲۱۳۰	۱۱٫۳۸
کل قیمت	۱۶۲۷۹	۲۰۳۹۲	۱۸۶۸۶	۱۰۰

از ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا بابتہ ۱۹۴۰-۴۱ء

اہم اشیاء درآمد و برآمد اگرچہ کہ ہندوستان میں صنعت پارچہ بافی کی ترقی اور حالیہ سیاسی ہیجان کی وجہ سے سوتی مصنوعات کی کل درآمد کا فی صدی تناسب کچھ گھٹ گیا ہے۔ لیکن درآمدی اشیاء میں سوتی مصنوعات کی اب بھی قدر باقی ہے۔ پارچہ کی درآمد زیادہ تر لنکاشائر سے ہوتی ہے۔ موجودہ جنگ سے قبل جاپان ہندوستانی بازار پر چھا گیا تھا، اور لنکاشائر اور ہندوستانی کارخانوں کا گویا حریف بھی بن گیا تھا۔

خام کپاس کی درآمد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، کیونکہ ہمارے کارخانوں میں عمدہ لمبے ریشے والی کپاس کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ جنگ کی وجہ سے غلہ، دالیں، آٹا، مشنری اور کارخانہ کے مصنوعات کی درآمد گھٹ گئی۔

درآمد کی دوسری قابل ذکر اشیاء حسب ذیل ہیں :-

سواریاں، آلات و اوزار، اونی و ریشمی مصنوعات، رنگ، اشیائے کیمیائی، کاغذ، شیشہ، ادویات معدنی تیل، دھاتیں اور کچ دھاتیں، اشیائے دباغت

برآمدی اشیاء میں کپاس اور جوٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حالیہ جنگ سے قبل جاپان خام کپاس کا سب سے بڑا خریدار تھا، برطانیہ اور چین چھوٹے خریدار ہیں

کپاس اور جوٹ کے بعد چائے کا درجہ ہے۔ ہندوستان کی کل پیداوار کا ۸۵ فی صدی حصہ برآمد کر دیا جاتا ہے۔ چائے زیادہ تر برطانیہ کو جاتی ہے۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں کل برآمد کا ۹۰ فی صدی سے

زیادہ حصہ برطانیہ نے خریدا تھا۔

روغنی تخم کو سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء میں ہندوستان کی برآمد میں چوتھا درجہ حاصل تھا۔ السی، مونگ پھلی کھوپرا، زیادہ تر براعظم یورپ کو جنگ سے قبل روانہ کیا جاتا تھا۔ روغنی تخم کی برآمد اب بہت کچھ گھٹ گئی ہے سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں سوائے چاول کے غلہ کی برآمد میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد دھاتوں اور کچی دھاتوں کی برآمد کو اہمیت حاصل ہے۔

برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ کو چمڑے اور کھالیں روانہ کی جاتی ہیں۔ ہندوستانی چمڑے اور کھالوں کی یوروپین بازاروں میں اتنی طلب باقی نہیں رہی جیسے کہ پچھلے سالوں میں تھی۔ خام اون۔ لاکھ۔ گوند، ربڑ، کھلی، تمباکو، مسالے، میوے، ترکاریاں اور ابرک کو بھی برآمدی اشیاء میں کچھ اہمیت حاصل ہے۔

ہندوستانی تجارت کا رُخ اب ہم ہندوستان کی کل درآمدی تجارت میں بیرونی ملکوں کے فی صد تناسب پر غور کریں گے۔

برطانیہ کا حصہ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۶۴ فی صدی تھا تو سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۲ء۲۵ فی صدی ہو گیا اٹاوے کے معاہدۂ ترجیح کا مقصد برطانیہ کے حصہ میں اضافہ کرنا تھا۔ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں جاپان کا حصہ ۶ء۲ فی صدی تھا تو عالیہ جنگ سے قبل ۱۷ فی صدی ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں جرمنی کا حصہ ۷ء۹ فی صدی تھا۔ سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں ممالک متحدہ امریکہ سے ۶ء۲ فی صدی کی برآمد ہوئی تھی تو سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں ۶ء۵ فی صدی ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں بلجیم کا حصہ ۳ء۲، جاوے کا ۳ء۲ فرانس کا ۹ء اور لنکا کا ۴ء۱ فی صد تھا۔

ایشیائے برآمد کی تجارت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ برطانیہ ہمارے مال کا سب سے بڑا خریدار ہے جنگ عظیم سے قبل ہماری کل تجارت میں برطانیہ کا حصہ ۴ء۲۳ فی صد تھا۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں ۱ء۳۵ فیصد ہو گیا۔ جاپان نے کل برآمد کا ۱۵ فیصدی خریدا تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ نے ۱۲ فیصد کی خریداری کی جنگ عظیم سے قبل جاپان ۱ء۹ فیصدی اور ممالک متحدہ امریکہ ۷ء۸ فیصدی خریدا کرتے تھے۔ جرمنی سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۶ء۱۰ فیصدی خریدا کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں صرف ۷ء۴ فیصد خریدا۔ سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں لنکا نے ۸ء۳ء۰ اٹلی نے ۴ء۲ فرانس نے ۹ء۲ بلجیم

سے ۶ء ۳ اور آسٹریلیا نے ۶ء ۱ فی صدی خریدا تھا۔

۴۲-۱۹۴۱ء میں ہندوستان کی کل درآمدی تجارت میں بیرونی ملکوں کا فی صد تناسب ذیل تھا۔

(۱) برطانیہ ۲۳ فیصدی (۲) برما ۲ء ۱۸ فیصدی (۳) ممالک متحدہ امریکہ ۴ء ۱۷ فیصدی (۴) جاپان ۸ء ۱۳ فیصدی (۵) آبنائے ملاکا ۴ء ۳ فیصدی (۶) ایران، عرب، عراق، ایشائی ترکی اور سماٹرا ۳ء ۳ فیصدی (۷) کینیا و زنجبار ۲ء ۲ فیصدی (۸) کینیڈا ۹ء ۱ فی صدی (۹) چین ۸ء ۱ فیصدی (۱۰) آسٹریلیا ۶ء ۱ فیصدی (۱۱) لنکا ۴ء ۱ فیصدی۔

برآمد کا تناسب مندرجہ ذیل تھا۔

(۱) برطانیہ ۸ء ۳۴ فیصدی (۲) ممالک متحدہ امریکہ ۹ء ۱۳ فیصدی (۳) برما ۷ء ۸ فیصدی (۴) چین ۳ء ۵ فیصدی (۵) جاپان ۸ء ۴ فیصدی (۶) آسٹریلیا ۸ء ۴ فیصدی (۷) لنکا ۳ء ۳ فیصدی (۸) فرانس ۴ء ۲ فیصدی (۹) ارجنٹائن ۲ء ۲ فیصدی (۱۰) آبنائے ملاکا ۸ء ۱ فی صدی (۱۱) کینیڈا ۷ء ۱ فیصدی (۱۲) متحدہ جنوبی افریقہ ۶ء ۱ فیصدی (۱۳) ایران، عرب وغیرہ ۴ء ۱ فیصدی۔

۴۲-۱۹۴۱ء میں ہندوستانی تجارت میں مزید تبدیلیاں ہوئیں۔ فرانس اور دوسرے براعظم یورپ کے ممالک اور جاپان سے تجارت بالکل مسدود ہو گئی۔ برطانیہ عظمیٰ اور اتحادی ممالک سے خاص طور پر درآمد میں اضافہ ہوا۔ درآمد و برآمد میں ممالک متحدہ امریکہ سے بہت زیادہ اضافہ ہوا۔

بازبرآمدی چونکہ ہندوستان مشرقی نصف کرہ کے وسط میں واقع ہے اس لئے وہ سامان تجارت کے لئے تقسیمی مرکز کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ ایسے ایشیائی ممالک جہاں بندرگاہیں نہیں ہیں ان کا مال پہلے ہندوستان آتا ہے اور پھر یہاں سے ممالک غیر کو بھیجا جاتا ہے۔ یہ بازبرآمدی تجارت تیار شدہ مصنوعات خاص کر پارچہ وغیرہ کی ہوتی ہے۔ جو مغربی ممالک سے درآمد کئے جاتے ہیں۔ اس مال کے خریدار ایران، مسقط اور مشرقی افریقہ ہیں۔ مغربی ممالک

کو جو سامان باز برآمد کیا جاتا ہے اس میں خام اون کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ مال ہندوستان میں خشکی کے سرحدی راستے سے درآمد ہوتا ہے اور زیادہ تر برطانیہ عظمیٰ کو روانہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی تجارت ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۱۲ کروڑ روپے اور اس کے بالمقابل ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۴ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے کی ہوئی تھی۔

ہندوستان کا توازن تجارت | جیسا کہ اس سے قبل وضاحت کردی گئی ہے کہ ہندوستان کی خارجی تجارت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ برآمد زیادہ اور درآمد کم ہے یعنی ہم بہت زیادہ قیمت کا مال باہر بھیجواتے ہیں اور نسبتاً کم قیمت کا مال منگواتے ہیں۔ ہندوستان کا موافق توازن تجارت جنگ عظیم کے قبل کے پانچ سالوں میں ۷۸ کروڑ اور جنگ کے پانچ سالوں میں ۷۶ کروڑ اور مابعد جنگ کے پانچ سالوں میں ۵۳ کروڑ روپیہ تھا۔ اس کے بعد کی پانچ سالہ مدت میں یہ توازن ۱۱۳ کروڑ روپے تک بڑھ گیا اور اس کے بعد کے پانچ سالوں ۳۴-۱۹۳۳ء کے اختتام پر ۴۳ کروڑ روپے تک گھٹ گیا۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں توازن تجارت کا تناسب صرف تین کروڑ روپیہ تھا۔ اس کے بعد سے اس تناسب میں اضافہ ہورہا ہے۔ چنانچہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں ۷۸ کروڑ روپے تک یہ توازن پہنچ گیا۔ اشیاء درآمد کی تجارت میں اضافہ اور برآمدی تجارت میں کمی اور ہندوستان سے برما کی علیحدگی کے باعث توازن تجارت ۳۸-۱۹۳۷ء میں ۱۵ کروڑ روپے تک گھٹ گیا۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں توازن تجارت ۴۸ کروڑ روپے تھا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء سے ڈسمبر ۱۹۳۹ء کے درمیان آٹھ سالوں میں سونے کی کثیر تعداد یعنی ۳۲۸ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کی برآمد کے ذریعہ توازن تجارت کو برقرار رکھا گیا۔ اور اس طرح ہندوستان بار بار بیرونی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکا۔ برآمدی تجارت کی تجدید موجودہ زمانہ کا ایک اہم ترین معاشی مسئلہ ہے۔ تاکہ توازن تجارت برقرار رہ سکے اور ان تجارتی ذمہ داریوں کی تکمیل ہو سکے جو ممالک غیر کی طرف سے ہندوستان پر عاید ہوتی ہیں۔ ۴۴-۱۹۴۳ء میں توازن تجارت ۹۱ کروڑ روپے تھا۔ جنگ کی وجہ سے جو اثرات ہندوستان کی تجارت خارجہ پر مترتب ہوئے ہیں وہ بڑی حد

تک مقید ہیں۔ ہمارا توازن تجارت پہلے بھی موافق رہتا تھا اور دوران جنگ میں بھی رہا۔ برآمد و درآمد میں اضافہ کی وجہ سے ہماری تجارت خارجہ میں بحیثیت مجموعی اضافہ ہوا۔ برآمد میں مصنوعات کا تناسب بڑھا اور درآمد کی حد تک مصنوعات میں کمی ہوئی ان خوشگوار اثرات کے ساتھ ملک کی حیثیت پر بعض مضر اثرات پڑے۔

نظریہ مطالبات | درآمد کے مقابلہ میں ہندوستان کی کثیر برآمد نظریہ مطالبات کا موجب ثابت ہوئی اس کو کسی وقت ملک کے معاشی مباحث میں بڑی اہمیت حاصل تھی بعض لوگوں کی نظر میں برآمد کی یہ کثرت ایک قسم کا خراج تھا جو اپنے سیاسی تعلقات کی بنا پر ہندوستان۔ انگلستان کو ادا کیا کرتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان اپنے مختلف مصارف کے مقابلہ میں غیر مرئی تجارت مثل غیر ممالک سے حاصل کردہ قرض کے سود غیر ملکی عہدہ داروں کی تنخواہوں اور وظائف بنک کاروں اور بیمہ کمپنیوں کے منافع سے تھوڑا بہت معاوضہ حاصل کر لیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا یہ معاوضہ کسی صورت میں بھی کافی تصور کیا جاسکتا ہے؟ معاشیات کی اس ابتدائی کتاب میں اس موضوع کے مالہٗ و ما علیہ پر بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مطالبات وطن میں تخفیف کی جائے اور اس کا انتظام یوں کیا جائے کہ ممالک غیر میں قرضے کم حاصل کئے جائیں اور دیوانی و فوجی خدمات پر ہندوستانیوں کا زیادہ سے زیادہ تقرر عمل میں لایا جائے اور ملک ہی میں اس کی اپنی بنک کاری، جہازرانی اور بیمہ کی تنظیم کا بندوبست کیا جائے۔

سرحدی تجارت | ہندوستان کی وسیع اراضی سرحد تقریباً پانچ ہزار میل تک پھیلی ہوئی ہے اس کے باوجود اس کی سرحدی تجارت بہت محدود ہے۔ کیونکہ صرف چند درّے اور گذرگاہیں ہیں جن سے ہوکر دوسرے ہمسایہ ممالک کو جا سکتے ہیں مثلاً شمال مغربی سرحد میں درّہ بولان۔ قدیم زمانہ سے سرحد پار تجارت بعض ملکوں سے چلی آتی ہے۔ مثلاً افغانستان، وسطی ایشیا، ایران، نیپال اور تبت۔ ان ممالک سے ما میوے، ترکاریاں، مغزیات، خام اون، خام ریشم

اور پالتو جانوروں کی درآمد ہوتی ہے۔ خاص برآمدی اشیاء میں پارچہ جات، شکر، خام کپاس چائے اور چمڑے کی مصنوعات شامل ہیں۔

مملکت آصفیہ کے اہم اشیائے درآمد و برآمد مملکت آصفیہ کے درآمدی اشیاء میں حسب ذیل کو اہمیت حاصل ہے۔

(۱) پارچہ جات (۲) غلہ اور دالیں (۳) روغنیات (۴) نمک (۵) میوہ جات و سبزی (۶) سینما فلم (۷) چائے (۸) بوٹ و شوز (۹) شراب (۱۰) صابن (۱۱) دیا سلائی (۱۲) عطریات (۱۳) شکر (۱۴) موٹر کار (۱۵) ادویات (۱۶) مشنری

مملکت آصفیہ کے برآمدی اشیاء میں مندرجہ ذیل کو اہمیت حاصل ہے۔

(۱) پارچہ بافی (۲) روغن دار تخم (۳) روغنیات (۴) غلہ و دالیں (۵) کوئلہ و کوک (۶) دباغت شدہ چمڑا و کھال (۷) گرم مسالے (۸) تمباکو (۹) میوہ جات (۱۰) پیپر اور شیرخانہ جات (۱۱) دیا سلائی (۱۲) شیشہ جات۔

مندرجہ ذیل تختہ سے مملکت آصفیہ کے جملہ درآمد و برآمد کے اعداد معلوم ہو سکتے ہیں:-

	درآمد	برآمد
سنہ ۱۹۲۷ء	۱۳ کروڑ ۸۸ لاکھ	۱۲ کروڑ ۸۴ لاکھ
سنہ ۱۹۳۰ء	۱۸ کروڑ ۶۹ لاکھ	۲۰ کروڑ ۲۸ لاکھ
سنہ ۱۹۳۳ء	۱۸ کروڑ ۷۰ لاکھ	۱۸ کروڑ ۶ لاکھ
سنہ ۱۹۳۶ء	۱۳ کروڑ ۷۵ لاکھ	۱۴ کروڑ ۴۰ لاکھ
سنہ ۱۹۴۰ء	۱۶ کروڑ ۶۱ لاکھ	۱۶ کروڑ ۸۶ لاکھ

مملکت کا کل ہندوستان کی درآمد و برآمد میں خاص اشیاء کا حسب ذیل تناسب ہے۔

اشیاء	مملکت میں درآمد بحساب من	مملکت میں برآمد بحساب من	تناسب	
			درآمد	برآمد
سمنٹ	۳۸۹۲	۲۸۹۱۵۲۷	۱۸	۳
کوئلہ وکوک	۱۲۵۳۲۳۲	۱۱۲۹۸۳۹۱	۱۷	۴
کپاس	۲۷۴۳	۱۲۹۴۳۸۰	۱۶	۹
میوے	۴۶۷۸۱۶	۹۱۶۲	۴	۱۵
چاول	۱۳۰۴۸۹۶	۱۷۴۷۶	۱۱	۱۵
کھالیں اور چمڑے	۱۸۶۹	۴۵۰۶۴	۱۵	۳
لوہا وفولاد	۱۰۰۸۹۹۲	۳۰۶۳۹	۱۳	۱۷
کروسین آئیل	۴۷۱۹۹۶	۱۰۳۵	۹	۱۶
نباتاتی روغنیات	۷۱۹۰۳	۵۲۰۱۹۷	۱۵	۴
ارنڈی	۳۴	۱۰۵۰۸۷۵	۱۳	۱
بنولہ	۱۰۴۶۳	۷۹۵۰۵۷	۱۳	۳
مونگ پھلی	۹۰۶	۳۳۷۷۸۸۲	۱۸	۳
السی	۵	۱۴۹۵۴۰۸	۱۸	۳
سرسوں	۷۹۱	۲۱۸۶۸۱	۱۷	۴
نمک	۱۶۱۷۰۳۰	۲۲۹۶	۶	۱۴
ساگوان	۱۳۲۳۳۳	۵۲۳۹۰	۴	۷

داخلی تجارت

ساحلی تجارت | داخلی تجارت کے دو حصے ہیں ایک ساحلی تجارت دوسرے اندرونی تجارت۔
۱۹-۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی کل ساحلی تجارت ۲۲ کروڑ ۹۵ لاکھ روپیہ کی ہوئی۔ ۳۰-۱۹۲۹ء میں ۲۷ کروڑ ۹ لاکھ روپیہ تک گھٹ گئی کیونکہ برما ہندوستان سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ خارجی اور ساحلی تجارت کے لئے ہندوستان کی خاص بندرگاہیں بمبئی، کلکتہ، کراچی، مدراس، کوچین، ٹٹی کورن اور اسحٰق پٹن ہیں۔ اول الذکر چار بندرگاہیں زیادہ اہم ہیں۔

اندرونی تجارت | ارضی وسعت، کثیر آبادی، وسیع اور مختلف ذرائع اور اپنی آب و ہوا کے اختلافات کی بناء پر سلطنت برطانیہ کے برخلاف ہندوستان خارجی تجارت کے مقابلہ میں اپنی داخلی تجارت کی جانب زیادہ متوجہ ہے۔ حمل و نقل اور آمد و رفت کے ترقی یافتہ ذرائع تجارت کے فروغ میں اضافہ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ سرکاری اشاعت موسومہ ہندوستان کی داخلی تجارت بابتہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے بموجب کل تجارت تقریباً ۱۵ کروڑ روپے کے مالیت کی تھی۔ ۳۰-۱۹۲۹ء میں بعض اہم اشیاء کی اندرونی تجارت بلحاظ مقدار ۴۰ کروڑ ۴۰ لاکھ من اور ۳۴-۱۹۳۳ء میں ۶۲ کروڑ ۴۰ لاکھ من تھی۔

اندرونی تجارت کی اہمیت کبھی بھی واجبی طور پر تسلیم نہیں کی گئی اور خارجی تجارت پر غیر متناسب توجہ منعطف کی گئی ہے جہاں تک داخلی تجارت کا تعلق ہے۔ ایک وسعت پذیر پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ہماری خارجی تجارت بڑی حد تک گھٹ چکی ہے۔ اور جس کے اتار چڑھاؤ پر ہمارا کچھ قابو نہیں ہے۔

ہندوستان کے خاص تجارتی مراکز | چار بڑی بندرگاہوں کلکتہ، بمبئی، کراچی اور مدراس کے علاوہ حسب ذیل بڑے تجارتی مراکز ہیں۔

کانپور، دہلی، احمد آباد، امرتسر، آگرہ، لاہور، بنارس، لکھنؤ، ناگپور، جبل پور، مرزاپور

مدورا، گوالیار، ڈھاکہ، سری نگر، شولا پور، امراؤتی، حیدرآباد دکن، الہ آباد، جے پور، بڑودہ، بنگلور اور میسور۔

تجارتی اطلاعات | ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان میں تجارتی اطلاعات بہم پہونچانے کا طریقہ اور تجارتی تنظیم کچھ اچھی حالت میں نہیں ہے۔ بہرحال اب اس جانب زیادہ توجہ کی جارہی ہے۔ سرکاری جانب سے تجارتی اطلاعات اور اعداد و شمار کا سررشتہ قائم ہے۔ لندن ہمبرگ، میلان، نیویارک، ممبوسا (جنوبی افریقہ) اسکندریہ، سڈنی (آسٹریلیا) اور کولمبو میں ہندوستانی ٹریڈ کمشنر مقرر ہیں کابل (افغانستان) میں ہندوستانی ٹریڈ ایجنٹ مامور ہے۔ ان کے علاوہ غیر سرکاری مجالس بھی موجود ہیں۔ مثلاً یورپین اور ہندوستانی چیمبرس آف کامرس یہ مجالس ملک کی صنعتی اور تجارتی ترقی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ملکی اور غیر ملکی بازاروں کے متعلق صحیح اور مکمل معلومات تجارت اور پیداوار کی تشہیر ہماری تجارت اور صنعت میں توسیع کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

مملکت آصفیہ میں بھی سررشتہ اعداد و شمار ۱۹۱۸ء سے قائم ہے۔ یہ سررشتہ تجارتی و زرعی اعداد و شمار شائع کرتا ہے جو مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے بازار کے اتار چڑھاؤ کی بنا پر نرخوں کے اعداد و شمار کی بڑی مانگ ہے۔

حیدرآباد میں بھی چیمبر آف کامرس قائم ہے جو تجارت پیشہ طبقہ اور ملکی صنعت کے مفاد کے تحفظ کا ضامن ہے۔ بہرحال تجارت میں حیدرآباد اس اعلیٰ پیمانہ پر منظم نہیں ہے۔ جیسا کہ اسے ہونا چاہئے لیکن اس کے باوجود بھی ہم شاہراہ ترقی پر منزل کی طرف گامزن ضرور ہیں۔

چھٹواں باب

زر، قیمتیں، اور بنک کاری

ہندوستانی زر

روپیہ کی مختصر سرگذشت ۱۸۳۵ء میں تمام برطانوی ہند میں مقررہ روپیہ بطور واحد زر قانونی جاری ہونے سے قبل سونے اور چاندی کے سکّے ہندوستان میں رائج تھے۔ اس طرح ہندوستان میں ایک عرصہ تک دونوں دھاتوں یعنی سونے اور چاندی کے سکوں کا طریق جاری رہا۔

مسلمانوں کے عہد میں شمالی ہند میں بڑی حد تک چاندی کا اور جنوبی ہند میں سونے کا سکہ رائج تھا۔ مثلاً صوبہ مدراس میں طلائی پگوڈا رائج تھا۔ بہر حال شمالی ہند میں بھی طلائی اشرفیوں کا محدود طور پر چلن تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں مرکزی حکومت کمزور ہو جانے کی وجہ سے ملک بھر میں جگہ جگہ سونے اور چاندی کے متعدد سکے رائج تھے۔ رفتہ رفتہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے زر کا انتظام شروع کیا اور ۱۸۳۵ء میں تمام برطانوی ہند میں روپیہ کا ایک ہی سکہ جاری ہوا اس روپے کا کل وزن ۱۸۰ گرین تھا جس میں گیارہ حصے یعنی ۱۶۵ گرین خالص چاندی اور ایک حصہ یعنی ۱۵ گرین کھوٹ شامل کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ سونے کے سکوں کا استعمال بند کر دیا گیا۔ اور ہر دارالضرب میں چاندی کے سکّے ڈھلوانے کا ہر شخص مجاز تھا۔ اس طرح ہندوستان کے زر کا معیار چاندی پر قائم ہو گیا۔ سونے اور چاندی کے سکے جو پہلے پہلو بہ پہلو زر قانونی کی حیثیت سے چلتے تھے اب وہ طریقہ مسدود کر دیا گیا۔

۱۸۹۳ء میں ہرشل کمیٹی کی سفارشات پر روپے کی آزاد تسکیک روک دی گئی۔ حکومت ہند نے اپنی مالیاتی مشکلات سے تنگ آکر یہ صورت اختیار کی کیونکہ ۱۸۷۱ء سے چاندی کی قدر سونے کے لحاظ سے گھٹ رہی تھی اور جیسے جیسے چاندی کی قدر گھٹتی گئی ہندوستانی زر دیے

کی قدر میں بھی اسی مناسبت سے تخفیف ہونے لگی۔ اس سے انگلستان میں مطالبات وطن کی ادائی میں سخت نقصان ہونے لگا۔ ۱۸۷۱ء میں روپے کی قیمت دو شلنگ تھی لیکن ۱۸۹۲ء میں روپے کی قیمت ایک شلنگ دو پنس رہ گئی تھی۔ روپے کی قدر میں تخفیف ہونے سے خارجی تجارت اور ہندوستان میں مشغول بیرونی سرمایہ پر بہت برا اثر پڑا چونکہ ۱۸۹۳ء سے روپے کی آزاد تسکیک روک دی گئی تھی اس لئے رفتہ رفتہ ۱۸۹۸ء تک روپے کی قیمت ایک شلنگ چار پنس ہوگئی۔ فاولر کمیٹی نے بھی اسی شرح مبادلہ کی سفارش کی ۱۸۹۹ء میں ہندوستان میں برطانوی ساورن کو زر قانونی قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ روپے اور ساورن کی شرح مبادلہ ایک شلنگ چار پنس فی روپیہ یا پندرہ روپے فی پونڈ مقرر کی گئی۔

معیار مبادلہ طلا

فاولر کمیٹی نے ہندوستان کے لئے زر طلا کا معیار اور ساورن کا دار الضرب قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔ لیکن زر طلا کا معیار قائم کرنے کے بجائے مختلف وجوہ کے باعث حکومت نے صرف معیار مبادلہ طلا کا طریقہ جاری کیا۔ روپے کی شرح مبادلہ بدستور ایک شلنگ چار پنس قائم رکھی گئی۔ "کونسل بل" کو حکومت ہند کے نام وزیر ہند لندن میں فروخت کرتا ہے اور "ریورس کونسل" حکومت ہند فروخت کرتی ہے جس پر لندن میں اسٹرلنگ یا سونا حاصل ہوتا ہے۔ کونسل بل اور ریورس کونسل کی فروخت عموماً ایک شلنگ چار پنس کے حساب سے عمل میں آتی تھی۔

حکومت کے پاس دو طرح کے محفوظات زر موجود تھے۔ ایک تو محفوظات طلا جو ۱۹۰۰ء میں قائم ہوا۔ یہ رقم تسکیک کے منافع سے حاصل ہوتی تھی اس محفوظ کی بڑی مقدار لندن میں اسٹرلنگ تمسکات کی خریدی کے لئے جمع رہتی تھی۔ سکوں کے تبادلہ کے سلسلہ میں ۱۹۰۸ء میں جو بحران پیدا ہوا تھا اس وقت اس محفوظ کی طمانیت پر ریورس کونسل فروخت کئے جاتے تھے تاکہ روپے کی ساکھ باقی رہے۔ دوسرا ذخیرہ محفوظ زر کاغذی کی ساکھ قائم کرنے کے لئے قائم کیا گیا جس کا کچھ حصہ ہندوستان میں اور کچھ لندن میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ کونسل بل کچھ تو محفوظ زر کاغذی کی طمانیت اور کچھ حکومت ہند کی نقد فاضلات کی طمانیت پر فروخت ہوتے

تھے۔ چمبرلین کمیشن (۱۴-۱۹۱۳ء) نے معیار مبادلہ طلا کے جاری رکھنے کی سفارش کی اگرچہ کہ ہندوستانی رائے عامہ معیار زر طلا کی خواہشمند تھی۔

جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے زمانہ میں ہندوستانی زر کے نظام میں بہت کچھ تغیرات رونما ہوئے۔ چاندی کی قدر اسٹرلنگ معیار کے اعتبار سے اتنی بڑھ گئی تھی کہ روپیہ کا گلا دینا مفید ثابت ہونے لگا۔ اسلئے حکومت نے رفتہ رفتہ ڈسمبر ۱۹۱۹ء تک روپیہ کی شرح مبادلہ ۲ شلنگ ۴ پنس مقرر کردی۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۸۹۳ء سے روپیہ زر وضعی رہا۔ اسکی قدر ذاتی اس کی قدر قانونی سے ایک شلنگ چار پنس کم تھی۔ جنگ سے قبل اس کی قدر ذاتی تقریباً دس شلنگ اور اس کی قدر قانونی ۱۶ شلنگ تھی۔ اس کے بعد چاندی کی قدر میں مزید تخفیف ہوئی اور روپے کی قدر ذاتی تقریباً ۸ پنس ہوگئی۔

۱۹۱۹ء میں بیبنگٹن اسمتھ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس نے شرح مبادلہ دو شلنگ فی روپیہ مقرر کرنے کی سفارش کی۔ اس کمیشن کی یہ رائے تھی کہ چاندی کی بڑھیا قیمت مستقلاً قائم ہو چکی ہے اس لئے روپے کو زر وضعی برقرار رکھنے کیلئے اسکی مجوزہ بڑھیا شرح نہایت ضروری ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں حکومت نے دو شلنگ فی روپے کی شرح سے ریورس کونسل فروخت کرنے شروع کئے لیکن حکومت کو اس سے سخت نقصان ہوا۔ ریورس کونسل کی فروخت بند کردی گئی اور روپے کی شرح کو اس کی حالت پر کچھ عرصہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

معیار خشت طلا | ۱۹۲۵ء میں ہلٹن ینگ کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ اس کمیشن نے معیار مبادلہ طلا کے بجائے معیار خشت طلا اختیار کرنے کی سفارش کی۔ حالانکہ حکومت ہند کے محکمہ مالیات اور کمیشن مذکور کے کئی ہندوستانی گواہوں نے بھی اس کی مخالفت کی تھی کمیشن نے اس کا بھی مشورہ دیا کہ روپے کی شرح بہ اعتبار طلا ایسی مقرر کی جائے جس سے روپیہ ایک شلنگ چھ پنس کے مساوی ہو جائے۔ بحالیکہ ملک کی رائے عامہ ایک شلنگ چار پنس کی تائید میں تھی کمیشن نے اس امر کی بھی سفارش کی کہ مجوزہ ریزرو بینک کا بینک آف انگلینڈ

کی طرح یہ فرض بھی ہو کہ وہ ایک معینہ شرح سے سونا خریدے اور فروخت کرے بشرطیکہ مقدار خرید و فروخت بہ یک وقت چار سو اونس یا ۱۰۶۵ تولے سے کم نہ ہو۔ اس طرح ہر فرد ۲۲ ۶۲۹ روپے ریزرو بنک میں لے جا کر چار سو اونس سونا بصورت خشت حاصل کر سکتا تھا (سونے کی شرح تقریباً ۲۱ روپے ۷ آنے ۹ پائی فی تولہ ہوتی تھی اس میں لندن کو سونے کی روانگی کے اخراجات شامل تھے)۔

ہلٹن ینگ کمیشن کی سفارشات کی بموجب مارچ ۱۹۲۷ء میں ایک نیا قانون زر منظور ہوا۔ اور ایک شلنگ چھ پنس کی شرح مقرر ہوئی۔ ریزرو بنک کے قیام تک حکومت ہند کو اس بات کا مجاز کیا گیا کہ وہ انتظام زر کی نگراں رہے نیز اس کو ۲۱ روپے ۳ آنے دس پائی فی تولہ کی شرح سے سونا فروخت کرنے کا بھی مجاز کیا گیا۔ شرط یہ لگائی گئی کہ خرید و فروخت میں سونے کی مقدار چار سو اونس سے کم نہ ہو یا چاہیے تو اسٹرلنگ سے مبادلہ کر سکتی تھی اور اس کی شرح ایک شلنگ ۵ $\frac{49}{64}$ پنس تھی اس میں بمبئی سے لندن کو سونے کی روانگی کے اخراجات بھی شامل تھے۔ چالیس تولہ یا پندرہ اونس سونے کی مقدار کے مقابلہ میں حکومت ہند روپیہ اور زر کاغذی ادا کرنے کی بھی مجاز قرار دی گئی۔ اگرچہ کہ حکومت ہند نے ہر ساورن پر تیرہ روپے پانچ آنے چار پائی ادا کرنے کی ذمہ داری لی لیکن ساورن زر قانونی کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ اس طرح معیار خشت طلا کا فوری انتظام عمل میں آگیا۔ لیکن ریزرو بنک کے قیام تک اس کا مکمل نفاذ ملتوی کیا گیا۔ اس وقت تک حکومت کو اختیار دیا گیا کہ ہندوستان میں سونا دینے کے بجائے لندن میں حاصل کرنے کے لئے اسٹرلنگ فروخت کرے اس حد تک یہ طریقہ معیار مبادلہ طلا کی حیثیت سے باقی رہا۔

روپیے اور اسٹرلنگ کی شرح تبادلہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۱ء تک معیار مبادلہ طلا کے اس طریقہ کی پابندی ہوتی رہی۔ اس تاریخ کو انگلستان نے معیار طلا کا طریقہ منسوخ کر دیا ہندوستان نے بھی اس کی پیروی کی ساتھ ہی وزیر ہند نے اعلان کیا کہ روپیہ اور اسٹرلنگ کے مابین

ایک شلنگ چھ پنس کی شرح سے تعلق قائم کیا گیا ہے۔ آج تک بھی یہی سرکاری شرح ہے۔ ریزرو بنک کے قانون بابتہ ۱۹۳۴ء میں اس شرح کو قانونی قرار دیا گیا ہے۔ اور بنک کو فی روپیہ ایک شلنگ چھ پنس کی شرح قائم رکھنے کا ذمہ دار گردانا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ریزرو بنک ایک شلنگ ۶ $\frac{3}{16}$ پنس فی روپیہ سے زیادہ شرح پر ہندوستان میں اسٹرلنگ نہیں خرید سکتا اور لندن میں ادا کرنے کے لئے ایک شلنگ ۵ $\frac{49}{64}$ پنس فی روپے کی شرح پر اسٹرلنگ فروخت کرتا ہے دونوں صورتوں میں اسٹرلنگ کی رقم دس ہزار پونڈ سے کم نہ ہونا چاہیئے۔ غرض ہندوستان کے زر کا موجودہ نظام معیار مبادلہ اسٹرلنگ پر قائم ہے

بہر حال ریزرو بنک کے قانون میں ریزرو بنک پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مناسب حال معیار زر کی نسبت اس وقت جبکہ بین الاقوامی زر کی حالت درست اور مستحکم ہو جائے بنک کی جانب سے رپورٹ پیش کی جائے۔

شرح مبادلہ کا اختلاف اسٹرلنگ اور روپے کے مابین صحیح شرح مبادلہ کے مسئلہ پر اختلاف کا ایک وسیع سلسلہ بڑے عرصہ سے چلا آرہا ہے۔ ہلٹن ینگ کمیشن نے یہ استدلال پیش کیا کہ اس کی مجوزہ شرح مبادلہ (ایک شلنگ چھ پنس) کے مطابق ہندوستان میں اشیاء کی قیمتوں کو عالمی قیمتوں کے ساتھ کامل توازن حاصل ہو چکا ہے اس لئے اگر شرح مبادلہ میں کوئی تبدیلی کی جائے تو اس سے وسیع معاشی مشکلات پیدا ہو جائینگے۔ کمیشن کے پیش کردہ استدلال کو عام طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے لیکن اس مسئلہ میں رائے کا اختلاف اصول پر نہیں بلکہ واقعہ پر مبنی ہے۔ ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ کمیشن کا پیش کردہ کامل توازن کا مفروضہ وجود میں نہیں آسکا۔ اگر وسیع معاشی مشکلات کا سدباب مقصود ہے تو قدیم شرح ایک شلنگ چار پنس ہی قابل ترجیح ہے۔ اس مسئلہ میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے کسی متفقہ فیصلہ کے پہنچنے کا امکان نہیں ہے۔ سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر کوئی شرح ایک عرصہ سے قائم ہے تو اجرتوں اور قیمتوں کا اس سے توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں شرح میں تبدیلی پیدا کرنا دانشمندی نہیں ہے تاوقتیکہ

ایسے حالات نہ پیدا ہوجائیں جن کے باعث دوسری شرح اختیار کرنا ضروری ہو۔ دوسری چیز یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ شرح مبادلہ میں کسی تبدیلی کا اچھا یا برا نتیجہ عام تصور کے خلاف محض عارضی ہوتا ہے ۱۹۳۰ء میں مجلس قانون ساز کے غیر سرکاری اراکین نے کوشش کی تھی کہ روپے کے شرح تبادلہ میں تبدیلی کی جائے لیکن ان کی کوششیں ناکام رہیں۔

طلا کی برآمد اور اسٹرلنگ سے تعلق | مسئلہ زر سے متعلق دو امور کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے پہلا اسٹرلنگ کے ساتھ روپے کا مسئلہ ہے جس کی اجمالی تاریخ کا ذکر اوپر گزر چکا۔ معیار مبادلہ اسٹرلنگ کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے زر کا تعلق کسی خاص ملک کے نظام زر کے ساتھ وابستہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر اس ملک میں معاشی تغیرات پیش آئیں تو ان کے اچھے یا برے اثرات سے دوسرے ملک کو لامحالہ متاثر ہونا پڑے گا۔ اسٹرلنگ معیار (ایک شلنگ چھ پنس) کی نسبت یہ بحث بھی کی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستانی بازاروں میں انگلستانی مصنوعات کو ترجیح حاصل ہوجاتی ہے۔ اور ہندوستان کو اس کے اس اختیار سے محروم کردیتا ہے جو اس کو اپنے زر کی شرح مبادلہ اسٹرلنگ اور دوسرے زروں کے بالمقابل تخفیف قیمت کے سلسلہ میں مقرر کرنے کی نسبت حاصل ہونا چاہیئے اگر یہ اختیار حاصل ہو تو ایسی صورت میں زرعی آبادی کے مفاد کی خاطر روپیہ کی قدر میں اضافہ کیا جاسکیگا۔ اسٹرلنگ معیار کی حمایت میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ ہندوستان ایک قرضدار ملک ہے۔ مطالبات وطن اور دیگر رقوم کی ادائی کی جو ضرورت پیش آتی ہے اس کے باعث اس کو اسٹرلنگ کی صورت میں رقوم ادا کرنے پڑتے ہیں اس لئے روپے کا تعلق اسٹرلنگ سے قائم رکھنا ضروری ہے اس کے علاوہ اسٹرلنگ معیار کا قیام تجارت خارجہ کے لئے بھی سہولت کا باعث ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی بیشتر تجارت ان ملکوں سے ہوتی ہے جہاں اسٹرلنگ کا رواج ہے۔ بہرصورت معیار مبادلہ اسٹرلنگ عارضی انتظام تصور کیا جاتا ہے اور اسی وقت تک برقرار رہے گا۔ جب تک کہ دنیا کی مالی حالت تغیر پذیر رہیگی۔

دوسرا اختلافی مسئلہ ہندوستان سے طلا کی برآمد کا ہے ستمبر ۱۹۳۱ء سے جبکہ برطانیہ نے

معیار طلا ترک کر دیا جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تک ۱۵۱ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کا سونا برآمد ہو چکا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے۔ کہ سونا کی برآمد کس حد تک دوسرے برآمدی اشیا کی جگہ لے سکی۔ اور موافق توازن تجارت کو برقرار رکھنے میں اس سے کچھ مدد حاصل ہوئی۔ جو بیرونی مطالبات کی تکمیل کے پیش نظر ضروری بھی ہے۔ روپے کے حساب سے سونے کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ سونے کی برآمد سے قبل اس کی قیمت ۲۲ روپے فی تولہ تھی لیکن ۱۹۴۲ء میں اس کی قیمت ۹۲ روپے فی تولہ تک بڑھ گئی۔ اس صورت حال نے سونا پس انداز کرنے والوں میں اس کے فروخت کرنے کی خواہش پیدا کر دی۔ سونے کی قیمتوں میں کثیر اضافہ کے باعث بھی اسکی برآمد ہونے لگی۔ معاشی کساد بازاری کی وجہ سے بھی بہت سے افراد سونے کے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ معاشیات کے بعض ماہرین طلا کی برآمد پر سخت اندیشہ کا اظہار کر رہے ہیں

اور ان کا مطالبہ ہے۔ کہ طلا کی برآمد پر ٹیکس عائد کیا جاتا یا خود اس کی برآمد قطعاً بند کر دی جائے تاکہ سونا ملک میں رہے۔ اور ہندوستانی ریزرو بنک کے ذخیرہ محفوظ کو اس سے تقویت پہنچے۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ موجودہ اعلیٰ شرح سے سونے کی خریدی بہت گراں ثابت ہو گی اور یہ صورت حال بڑی حد تک سٹہ بازی کی ترویج کا سبب بنے گی۔

زر کاغذی اب ہندوستان میں زر کاغذی کے رائج ہونے کا اجمالی طور سے تذکرہ کیا جاتا ہے قانون زر کاغذی بابتہ سنہ ۱۸۶۱ء کی رو سے زر کاغذی کے جاری کرنے کا حکومت نے اپنے لئے اجارہ حاصل کر لیا اور عند الطلب حامل نوٹ کو رقم ادا کرنے کی ذمہ داری لی گئی۔ اس سے پہلے تینوں پریسیڈنسی بنکوں (مدراس، بمبئی اور کلکتہ) کو نوٹ اجرا کرنے کا حق حاصل تھا اور عند الطلب حامل نوٹ کو رقم ادا کرنی ہوتی تھی لیکن بہت محدود علاقوں میں ان کا چلن تھا۔ حکومت نے اپنے زر کاغذی کو پانچ، دس، پچاس، سو، پانچ سو، ایک ہزار اور دس ہزار روپے کی قیمت کا قرار دیا ملک کو سات حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (کلکتہ، بمبئی، مدراس، کانپور، لاہور، کراچی اور رنگون)

اور جس حلقہ میں نوٹ جاری کئے جاتے تھے وہ صرف اسی حلقوں میں زر قانونی تھے اور دفاتر خزانہ میں بھنائے جا سکتے تھے رفتہ رفتہ ان کو عام کر دیا گیا اور تمام ہندوستان میں ان کو زر قانونی کی حیثیت حاصل ہوئی۔ موجودہ زمانہ میں دس ہزار کے سوا بقیہ تمام نوٹ عام ہیں۔ ان نوٹوں کو تمام سرکاری خزانوں اور امپیریل بنک کی شاخوں میں بھنانے کی سہولتیں بہم پہونچائی گئی ہیں

محفوظ ذخیرہ زر کاغذی

سنہ ۱۹۲۰ء تک محفوظ ذخیرہ زر کاغذی کا انتظام ایک مقررہ محفوظ امانتی طور پر کیا گیا۔ جو سنہ ۱۸۴۴ء میں برطانیہ میں رائج تھا۔ گذشتہ جنگ عظیم سے قبل زر محفوظ کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو کفالتوں میں لگائی جا سکتی تھی چودہ (۱۴) کروڑ روپے تھی اس چودہ کروڑ روپے کے منجملہ دس کروڑ روپے کے حکومت ہند کے تمسکات اور چار کروڑ کے برطانیہ کے اسٹرلنگ تمسکات حاصل کئے گئے تھے۔ مابقی محفوظ کچھ تو بہ شکل سکہ جات نقرہ اور کچھ بہ شکل طلاء محفوظ رکھا گیا۔ سونا تو لندن میں اور تمام ڈھلے ہوئے سکے ہندوستان میں رکھے جاتے تھے۔ گذشتہ جنگ عظیم سے قبل جاری شدہ کل نوٹوں کی مالیت ۶۶ کروڑ ۱۲ لاکھ روپے تھی۔ جنگ کے زمانہ میں اس میں بہت زیادہ اضافہ ہوا سنہ ۱۹۱۹ء کے اختتام پر اس کی مالیت ۱۸۰ کروڑ روپے ہوگئی تھی یہ اضافہ ان اسٹرلنگ تمسکات کی طمانیت پر عمل میں آیا جو لندن میں وزیر ہند کے نام ان مصارف جنگ کی ادائی کے سلسلہ میں تبدیل کر دیئے گئے تھے جو برطانوی دفتر جنگ کی طرف سے حکومت ہند نے برداشت کئے تھے۔ ستمبر سنہ ۱۹۱۹ء میں مشغول ذخیرہ محفوظ کی مقدار ۱۲۰ کروڑ روپے قرار پائی جس میں ایکسو کروڑ روپے کی مالیت کے ٹریژری بلس موجود تھے۔ بابنگٹن اسمتھ کمیٹی کی سفارش پر سنہ ۱۹۲۰ء میں بحصہ متناسبہ ذخیرہ محفوظ کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اسی سال قانون زر کاغذی کے بموجب رائجہ زر کاغذی کے مقابلہ میں پچاس فیصدی رقم محفوظ رکھنا قرار پایا۔ اسی قانون کی رو سے ناگہانی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بالخصوص اس وقت جبکہ کاروباری چہل پہل کی وجہ سے زر کی زیادہ طلب ہوتی ہے۔ بعض خاص تمسکات کی طمانیت پر پانچ کروڑ روپے کی مالیت تک زر کاغذی کی اجرائی کا اختیار دیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اس کی مقدار ۱۲ کروڑ روپے کر دی گئی۔

ریزرو بنک میں اجرائی نوٹ کی منتقلی | اپریل ۱۹۳۵ء میں ریزرو بنک کا افتتاح ہوا۔ ہیلٹن ینگ کمیشن کی سفارش پر زر کاغذی کی اجرائی اور اس کا انتظام ریزرو بنک کے تفویض کر دیا گیا۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں ریزرو بنک کے نوٹ اجرا ہوگئے۔ اور پانچ روپے والے نوٹ دستیاب ہونے لگے فبروری میں دس روپے والے نوٹ اور مئی ۱۹۳۸ء میں ایک سو اور ہزار والے نوٹ جاری ہوئے ستمبر ۱۹۴۳ء تک جملہ اجرا شدہ نوٹوں کی مقدار ۳۱۷۶ء۲ کروڑ روپیہ تھی اور ویرگشت نوٹوں کی مقدار ۳۵۲ء۵۷ کروڑ روپے رہی۔ ذخیرہ محفوظ میں سونے اور خشت طلار کی مقدار ۴۴ء۴ کروڑ روپے تھی۔ تمسکات اسٹرلنگ کی مقدار ۱۱۶۰ء۹ کروڑ روپے تھی۔ روپے کے سکہ جات کی مقدار ۱۴ء۸ کروڑ تھی۔ بنک نے اس بات کا تصفیہ کیا کہ پچاس اور پانچ سو روپے والے نوٹ اجرا نہ کئے جائیں کیونکہ ان کا رواج بہت ہی کم ہے حکومت کے موجودہ نوٹوں کے بجائے بالآخر ریزرو بنک کے نوٹ جاری ہونگے۔ جن کی حکومت ہند ضامن ہے۔ اور حکومت کے قدیم نوٹوں کی طرح یہ بھی عند الطلب بھنائے جا سکتے ہیں۔ محفوظ معیار طلاء اور محفوظ زر کاغذی پہلے علیحدہ علیحدہ جمع رہتے تھے اب ان کو باہم ضم کرکے محفوظ زر کی شکل دیدی گئی ہے۔ اور اسکو ریزرو بنک کے شعبۂ اجرائی کے تفویض کر دیا گیا ہے۔ ریزرو بنک کے قانون بابتہ ۱۹۳۴ء میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے۔ کہ زر کاغذی کی طمانیت کے لئے جو رقم محفوظ کی جاتی ہے اس اثاثہ کا کم از کم چالیس فیصد حصہ طلائی سکوں، خشت طلار یا اسٹرلنگ تمسکات پر مشتمل ہونا چاہئے طلائی سکے اور خشت طلار کی مالیت چالیس کروڑ روپے سے کم نہ ہونی چاہیئے اور یہ کہ حکومت ہند کے روپیہ کے تمسکات ۲۵ فیصدی یا ۵ کروڑ روپے سے زاید نہ ہوں۔ بقیہ اثاثے روپے کے سکے، تجارتی ہنڈیوں اور ہندوستان میں ادا ہونے والے پرامیسری نوٹوں کی شکل میں رکھے جا سکتے ہیں اور یہ کہ طلار جو ہندوستان میں محفوظ رکھا جائے۔ وہ اپنے مجموعہ کے ۱۷/۲۰ حصے سے کم نہ ہونا چاہیئے ریزرو بنک کو اس امر کا مجاز گردانا گیا ہے کہ بعض خاص حالات کے تحت محفوظ طلار کی مقدار چالیس فیصد سے بھی کم کر دیئے لیکن کمی کی صورت میں ٹیکس ادا کرنا لازمی قرار دیا گیا۔

اعلان جنگ سے قبل یعنی اگست ۱۹۳۹ء کے اختتام پر ہندوستان میں جملہ ۲۰۵٫۹۴ کروڑ روپے کے نوٹ جاری کئے گئے تھے جن کے منجملہ ۲۹٫۰۷ اکروڑ روپے کے نوٹ دیرگشت تھے۔ لقیہ ۶۵ د ۴۳ کروڑ روپیوں کے ہم قدر ضمنت طلا اور طلائی سکے رکھے گئے تھے اور اسٹرلنگ کے تمسکات ۵۹٫۵۰ کروڑ کے تھے سنہ ۱۹۴۰ء میں ایک روپے کے نوٹ اجرا کئے گئے۔ زر کی مقدار میں بہت ہی نمایاں اضافہ ہوا۔ ذخیرہ محفوظ میں سونے کی مقدار وہی ۴۴٫۴۲ کروڑ روپیہ رہی اس کی وجہ سے سونے اور زر کاغذی کا تناسب ۷٫۴ ہوگیا۔ اس کمی کو تمسکات اسٹرلنگ کے اضافہ سے پورا کیا گیا۔ آغاز جنگ کے وقت ان تمسکات کی مقدار ۵۹٫۵ کروڑ روپے تھی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں یہ مقدار ۲۸۲٫۸۳ کروڑ ہوگئی۔

ذیلی سکے | ہندوستان کے سکے جنکو زر قانونی کی حیثیت حاصل ہے روپیہ اور اٹھنی ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں بعض ذیلی سکے بھی ہیں مثلاً چاندی اور نکل کے آمیزے کی چونی نکل کی اکنی اور تانبے کے مختلف سکے۔

ہندوستانی زر پر موجودہ جنگ کے اثرات | موجودہ عالمی جنگ نے زر کے نظام پر بھی اثر ڈالا ہے جس کو گرانی کی شکل میں ہندوستانی معاشرہ کے سب طبقات خاص طور پر متوسط الحال اور غریب طبقہ بہت زیادہ محسوس کر رہا ہے۔ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء تک قیمتوں میں تدریجی اضافہ کا دور ختم ہوا اور اس کے بعد سے قیمتوں کی سطح بہت تیزی سے بلند ہونا شروع ہوئی۔ قیمتوں کا اس طرح تیزی سے بڑھنا "افراط زر" کہلاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں قیمتوں میں اضافہ اس نسبت سے نہیں ہوا ہے جس نسبت سے زر کی مقدار بڑھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زر کی گردش پہلے کے مقابلہ میں کم ہوگئی ہے۔ لوگ ذخیرہ کے طور پر زر کو رکھ رہے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بنکوں کی امانتوں میں اضافہ ہوگیا ہے .... اور ان امانتوں سے پوری طرح سے کام نہیں لیا جارہا ہے، اسٹرلنگ کی ایک کثیر مقدار ہندوستان کے نام لندن میں جمع ہوگئی ہے ملک کے مختلف ایوان ہائے تجارت اور ماہرین معاشیات نے حکومت کی توجہ نئے حالات کی طرف

بیند ول کرائی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ افراط زر کے حالات کو روکنے کے لئے خاص تدابیر اختیار کی جائیں۔ لیکن حکومت اس بات سے قطعی طور پر انکار کرتی رہی کہ ہندوستان میں افراط زر کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے۔

جنوری ۱۹۴۳ء کے بعد سے حکومت نے اپنی غلطی کو محسوس کیا۔ حالات پر قابو پانے کے لئے حکومت بعض خاص تدابیر اختیار کرنے کا اعلان کر چکی ہے۔ زائد منافع پر محصول کی شرح بڑھاکر ۶۶ فیصد کر دی گئی ہے۔ اور اس کے ایک حصہ کو علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ جنگ کے بعد اس کو واپس کر دیا جائے سرمایہ کاری پر تسلط اس طرح سے قائم کیا گیا ہے کہ بغیر حکومت کی اجازت کے کوئی نئی کمپنی قائم نہیں کی جا سکتی۔ سٹہ بازوں کے خلاف مہم جاری کی گئی اور بعض اشیاء کی اعلیٰ ترین قیمتیں مقرر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مزید برآں حکومت نے حال میں ایک ماہر معاشیات کا تقرر اس غرض سے کیا ہے۔ کہ وہ ملک کا دورہ کر کے مختلف اداروں اور افراد سے تبادلہ خیال کریں اور افراط زر کو روکنے کے لئے تدابیر بتلائیں۔

افراط زر کی وجہ سے معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان قومی دولت کی تقسیم بہت کچھ بدل جاتی ہے امیروں کی دولت میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور غریبوں کی غربت کی شدت بڑھ جاتی ہے قیمتوں کا بڑھنا ہر شخص کو یکساں طور پر متاثر نہیں کرتا۔ غریب اور متوسط الحال طبقہ کی حالت سب سے زیادہ تباہ ہو جاتی ہے ان طبقات میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جنکی آمدنیاں معین ہیں۔ قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کی آمدنیاں نہیں بڑھتیں۔ منظم صنعتوں کے مزدوروں کی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ان صنعتوں کو ترقی ضرور ہو رہی ہے اور مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ ضرور ہوا ہے لیکن یہ اضافہ قیمتوں میں اضافہ کا ساتھ نہیں دے سکتا ہنگامی مزدوروں، خانگی کام کرنے والوں اور گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت کو جنگ نے بہت زیادہ تباہ کر دیا ہے۔ دیہی آبادی کا تقریباً نصف حصہ افراط زر سے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھا رہا ہے۔ صرف بڑے بڑے کاشتکاروں کو افراط زر سے فائدہ

اٹھانے کے مواقع ہاتھ آئے ہیں۔ سرمایہ دار، تاجر اور سٹہ کرنے والے ہی جماعت کے چند افراد ہیں جو اکثریت کی مصیبت کے دوران میں فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

افراط زر کی وجہ سے اسٹرلنگ کی ایک کثیر مقدار ہندوستان کے نام لندن میں جمع ہوگئی ہے اس سے ہندوستان کا وہ قرضہ جو برطانیہ کو واجب الادا تھا بالکلیہ ادا کر دیا گیا ہے۔ افراط زر کا یہ ایک اچھا اثر ہے۔ ہندوستان کے ذمہ ۱۹۳۶ء میں ۳۷۶ ملین پونڈ واجب الادا تھے لیکن ۱۹۴۳ء میں یہ رقم ادا کر دی گئی ہے۔ اگر اسٹرلنگ کا صحیح استعمال کیا جائے تو یہ ذخیرہ مابعد جنگ کی تعمیر میں ہندوستان کیلئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوسکتا ہے۔

حیدر آبادی زر: ۱۸۳۵ء میں برطانوی ہند میں ایک ہی سکہ جاری ہوا جو تمام برطانوی ہند کے لئے زر قانونی قرار پایا۔ لیکن ہندوستانی ریاستیں اپنا سکہ علحدہ ڈھالتی تھیں۔ اولاً ان سے یہ خواہش کی گئی کہ انگریزی دارالضرب میں اپنا سکہ ڈھلوائیں۔ اسکے بعد یہ کیا گیا کہ سکہ پر نہ صرف ریاست کی بلکہ برطانوی حکومت کی علامت بھی قائم کی جائے۔ بعد ازاں سوائے مملکت حیدر آباد کے تمام ہندوستانی ریاستوں میں بھی انگریزی سکہ بڑی حد تک رائج ہوگیا۔

بقول پروفیسر ریلی سرکار آصفیہ نے اس موقع پر بڑی دور اندیشی سے کام لیا اور اپنے زر کا انتظام حکومت ہند کے سپرد نہیں کیا اپنے زر کی اصلاح اور انتظام پر خود آمادہ ہوگئی۔۔۔ ۱۸۵۵ء میں سالار جنگ اول نے تمام خانگی دارالضرب بند کر دینے کے احکام جاری کئے بلدہ حیدر آباد میں سرکاری دارالضرب کو ترقی دینے کا ارادہ کیا اور ہر قسم کی ٹیکنک اسی کے توسط سے عمل میں لانے کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۵۵ء میں یہ دارالضرب میر جملہ کے تالاب کے کنارے محلہ سلطان شاہی میں قائم ہوا۔ سرکاری دارالضرب میں جو روپیہ تیار ہونا شروع ہوا وہ اصطلاحاً حالی سکہ کہلایا۔ اس روپے کا وزن ۱۱ ماشہ برقرار رہا یعنی ۹ ماشہ چاندی ۲ ماشہ کھوٹ۔ سرکار ہند کی طرح سرکار آصفیہ کے دارالضرب میں بھی روپیہ کی ٹکسیک آزاد تھی یعنی لوگ اپنے طور پر چاندی داخل کر کے سرکاری دارالضرب میں روپیہ ڈھلوا سکتے تھے اور صرف

دو فیصدی مصارف تسکیک ادا کرنے پڑتے تھے۔

کرنسی کمیشن | سرکار آصفیہ نے ۱۸۹۳ء میں نواب محسن الملک کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ نئے حالات کے مدنظر زر کی اصلاح و ترمیم کی مناسب تجاویز پیش کرے۔ اس کمیشن کے مندرجہ ذیل سفارشات قابل ذکر ہیں۔

(۱) حکومت ہند کی طرح سرکار آصفیہ بھی اپنے روپے کی تسکیک محدود کر دیے۔

(۲) حکومت ہند نے جس طرح کلدار روپے اور ساورن کی شرح مبادلہ معین کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ سرکار آصفیہ بھی حالی اور کلدار روپے کی شرح معین کرنے کا ذمہ لے۔

(۳) دارالضرب میں دستکاری کی بجائے کلوں کے ذریعے سے روپیہ تیار ہونا چاہیے اور اسکی شکل و صورت کو بھی بہتر بنانا چاہیے تاکہ مصنوعی روپیہ تیار ہونا مشکل ہو علاوہ برایں قدیم روپے واپس لے کر ان سے نئے روپے تیار کیے جائیں۔

(۴) چھوٹے چھوٹے ذیلی نقرئی اور مسی سکے بطور اجرا روپیہ جاری کیے جائیں۔

(۵) مزید احتیاط کی غرض سے چاندی پر دس یا پندرہ فیصدی محصول درآمد بڑھا دینا چاہیے تاکہ مصنوعی روپیہ بنانے میں لوگوں کو منافع کی گنجائش نہ رہے۔

سرکار عالی نے مندرجہ بالا سفارشات منظور کر لئے۔ آخرالذکر سفارش کی بابت حکومت ہند سے بھی مشورہ کرنا پڑا۔ ۱۸۹۴ء میں حکومت ہند نے اس تجویز سے اس شرط پر اتفاق کیا کہ سرکار ہند کے کلدار روپے کی درآمد پر کبھی کوئی محصول نہ لگایا جائے بلکہ ممالک محروسہ کے لوگ اپنی خواہش سے کلدار روپیہ استعمال کرنا چاہیں تو ان کو اس سے منع نہ کیا جائے باقی تجاویز سرکار عالی کے اندرونی انتظامات سے متعلق تھیں ان کی تعمیل شروع ہو گئی۔ ۱۸۹۴ء سے سرکار آصفیہ نے بھی حالی روپے کی تسکیک محدود کر دی۔

لیکن چند دن کے انتظام کے بعد بدنظمی پھر پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے مصنوعی روپیہ بنانے اور چلانے شروع کر دیئے۔ سرکار آصفیہ کے زر کے حق میں یہ وقت بہت نازک تھا۔ لیکن سرکار آصفیہ

ہمت نہ ہاری چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں سخت ممانعتی احکام اجرا کئے گئے کہ سرکار عالی کے سوا کبھی کسی کے واسطے دار الضرب میں روپیہ تیار کیا نہ جائے۔ روپے کے نقش و نگار میں بھی ترمیم اور چار میناری روپیہ منظور کیا گیا۔ سب سے بڑھکر یہ کہ اعلیٰ پیمانہ پر جدید دار الضرب قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں جدید دار الضرب حسین ساگر کے کنارے تعمیر ہوا اور اس جدید دار الضرب میں ٹکسال شروع ہو گئی۔ اس دار الضرب میں برابر توسیع اور ترقی ہو رہی ہے۔

مبادلات خارجہ کا انتظام سنہ ۱۹۰۴ء میں سرکار عالی نے مبادلات خارجہ کی شرح استقامت پیدا کرنے کی غرض سے حسب ذیل انتظام کیا۔

(۱) عام لوگوں کو کلدار روپے کے معاوضہ میں سرکار عالی حالی روپیہ مہیا کرے گی اس صورت میں شرح مبادلہ ایک سو پندرہ روپیہ حالی کے لئے ایک سو کلدار ہوگی۔

(۲) حالی روپے کے معاوضہ میں سرکار عالی کلدار روپیہ مہیا کرے گی اس صورت میں شرح مبادلہ ایک سو بیس روپے حالی کے لئے ایک سو روپے کلدار ہوگی۔

سرکار عالی نے حالی اور کلدار کی شرح مبادلہ معین کرنے کے واسطے جو کچھ انتظام کیا وہ مشابہ ہے اس انتظام کے جو حکومت ہند نے کلدار اور پونڈ کی شرح مبادلہ قائم کرنے کے واسطے مقرر کیا تھا۔ دونوں انتظامات کے اصول یکساں ہیں۔

ذیلی سکے اور طلائی اشرفی کرنسی کمیشن کی سفارش کے مطابق سنہ ۱۹۰۵ء میں مسی فلوس دو پائی اور نقروی چوانی کے سکے جاری ہوئے سنہ ۱۹۰۶ء میں نقروی دوانی اور مسی نصف آنے کے سکے جاری ہوئے سنہ ۱۹۰۹ء تک اشرفی کی ٹکسال آزاد رہی۔ لیکن اس کے بعد سے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ سرکار عالی اپنے طور پر اشرفیاں تیار کرا کر مناسب نرخ پر فروخت کیا کریگی۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں نقروی اٹھنی جاری ہوئی۔

حیدرآباد کے مبادلات خارجہ پر جنگ یورپ کا اثر سنہ ۱۹۱۴ء سے زر کے معاملات میں حکومت ہند اور حکومت سرکار عالی یکساں دقتوں میں مبتلا نظر آتی تھی اور مبادلات خارجہ کو

سنبھالنے کے واسطے یکساں تدابیر اختیار کرتی تھیں۔ جنگ کے پہلے تین سال تو شرح مبادلہ سرکار عالی کے قابو میں رہی پہلے دو سال تو معمولی طور پر حالی سکہ کی رسد پوری رہی۔ تیسرے سال قرضہ سے مدد لی گئی اور رسد بھی محدود رکھی گئی لیکن طلب کا دہ زور بندھا کہ تنگ آکر سرکار عالی نے مبادلا کے انتظام سے علٰحدگی اختیار کر لی۔ شرح مبادلہ ایک سو سولہ کے بجائے ایک سو آٹھ اور ایک سو نو کے درمیان قائم ہوگئی اور کبھی کبھی ایک سو روپے تک بھی چڑھ گئی۔ یہ غیر معمولی صورت پیش آئی۔ اس کے چند اسباب تھے مثلاً درآمد کی کمی بیشی۔ چاندی کی گرانی اور روپے کی قلت اور سب سے بڑھ کر سٹہ بازی یعنی محض نفع کمانے کی خاطر لوگوں کو مبادلات خارجہ میں حصہ لینا۔

زر کاغذی کا اجرا ۱۹۱۸ء میں زر کاغذی کا قانون منظور ہوا اور اس کا باضابطہ انتظام ہوگیا۔ نوٹوں کی طباعت کا انتظام لندن میں کیا گیا۔ چنانچہ اول سو سو روپے کے نوٹ اور دس دس روپے کے نوٹ خزانہ سے جاری ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں پانچ پانچ روپے اور ایک ایک روپیہ کے نوٹ بھی جاری ہوگئے۔ لیکن چند دن کے بعد ایک روپے کے نوٹ واپس لے لئے گئے۔ از روئے قانون ذخیرہ زر کاغذی کا دو ثلث نقد بشکل حالی یا کلدار روپیہ یا بشکل نقرہ و طلا محفوظ رہنا لازم ہے البتہ بقیہ ایک ثلث سرکار عالی یا حکومت ہند کے تمسکات میں مشغول رہ سکتا ہے۔ ذخیرہ کے نقد حصہ میں کلدار روپے کی جو رقم شریک رہتی ہے۔ وہ بقدر گنجائش امپیریل بنک میں بطور امانت قلیل المدت جمع رہتی ہے اور اس پر جو کچھ سود وصول ہوتا ہے البتہ حالی روپے کی رقم بالکل ذخیرہ میں محفوظ رہتی ہے۔

موجودہ جنگ کی وجہ سے زر فلزی اور زر کاغذی کی مقداروں میں بہت اضافہ ہو رہا ہے زیر گشت زر کی مقدار ۸۳ء۱۷ کروڑ تھی جس میں زر کاغذی کی مقدار ۶ کروڑ ۸۳ لاکھ اور زر فلزی کی مقدار ۱۱ کروڑ تھی۔ بہرحال حیدرآباد بھی افراط زر سے محفوظ نہ رہ سکا ہے مگر ہندوستان کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے حیدرآباد میں حالات البتہ نازک نہیں ہوتے ہیں۔ مارچ ۱۹۴۳ء تک زر کی مقدار ۱۸ء۲۹ کروڑ ہوگئی ہے جس میں زر کاغذی کی مقدار ۱۸ کروڑ ۱۰ لاکھ اور زر فلزی [illegible]

مقدار ۱۲ کروڑ ہے۔ ایک روپیہ کے نوٹ جاری ہوئے ہیں جن کی طباعت دارالطبع سرکار عالی میں عمل میں آرہی ہے۔

۴۱-۱۹۴۰ء میں سو تولے سونا سکہ سازی کے لئے ۵۰ ہزار روپے میں خرید اگیا۔ اس سال سلاخی چاندی نہیں خریدی گئی صاف شدہ اور معیاری چاندی جو وصول کی جاکر حسابات میں جمع کر لی گئی علی الترتیب ۳ر ۲۵ تولے اور ۲۰ر۸۱ ۱۶۹۷ اتھی۔ تانبا ۵۲۵۶۲۳ تولے خرید اگیا اس سال قلعی اور جست کی کوئی مقدار نہیں خریدی گئی اور نہ کوئی کالشنے کا سکہ ڈھالا گیا ۴۱-۱۹۴۰ء میں اٹھنیاں، چونیاں، نکل کی اکنیاں جنکی قیمت پچیس پچیس ہزار روپے تھی۔ استعمال کے لئے جاری کئے گئے۔

ہندوستان میں قیمتیں

ہندوستان میں قیمتوں کے تغیرات ذیل کی جدول میں ۱۸۶۱ء سے ہندوستان میں قیمتوں کی ایک عام کیفیت کو ظاہر کیا گیا ہے جس میں ۱۸۷۳ء کو بنیادی سال قرار دیا گیا ہے۔ اشاری عدد (INDEX NUMBER) ۱۳۹ اشیاء کی تھوک فروش قیمتوں پر مبنی ہے۔ (۲۸ برآمدی اور ۱۱ درآمدی اشیاء)۔

ہندوستان کی قیمتوں کا اشاری عدد

۱۸۷۳ء میں قیمت = ۱۰۰

سال	۱۳۹ اشیاء کے انڈکس نمبر	سال	۱۳۹ اشیاء کے انڈکس نمبر	سال	۱۳۹ اشیاء کے انڈکس نمبر
۱۸۶۱	۹۰	۱۸۷۰	۱۰۲	۱۸۸۰	۱۰۴
۱۸۶۵	۱۰۷	۱۸۷۵	۹۴	۱۸۸۵	۸۷

۱۸۹۰	۱۰۰	۱۹۲۰	۲۸۱	۱۹۳۲	۱۲۶
۱۸۹۵	۱۰۴	۱۹۲۱	۲۳۶	۱۹۳۳	۱۲۱
۱۹۰۰	۱۱۶	۱۹۲۲	۲۲۲	۱۹۳۴	۱۱۹
۱۹۰۵	۱۱۰	۱۹۲۳	۲۱۵	۱۹۳۵	۱۲۷
۱۹۱۰	۱۲۲	۱۹۲۴	۲۲۱	۱۹۳۶	۱۲۵
۱۹۱۳	۱۴۳	۱۹۲۵	۲۲۷	۱۹۳۷	۱۳۶
۱۹۱۴	۱۴۷	۱۹۲۵	۲۱۶	۱۹۳۸	۱۳۲
۱۹۱۵	۱۵۲	۱۹۲۷	۲۰۲	۱۹۳۹	۱۴۲
۱۹۱۶	۱۸۴	۱۹۲۸	۲۰۳	۱۹۴۰	۱۶۳
۱۹۱۷	۱۹۶	۱۹۲۹	۲۰۲	۱۹۴۱	۱۷۴
۱۹۱۸	۲۲۵	۱۹۳۰	۲۷۳	۱۹۴۲	۲۳۸
۱۹۱۹	۲۷۶	۱۹۳۱	۱۲۷	۱۹۴۳	۳۲۵

سنہ ۱۸۶۱ء تا سنہ ۱۸۹۳ء کے مابین قیمتوں کے تغیرات کی خصوصیات ذیل میں بیان کیجاتی ہیں:-

(۱) قیمتوں کا چڑھاؤ۔ (سنہ ۱۸۶۱ء تا سنہ ۱۸۶۵ء) امریکی خانہ جنگی لنکا شائر کے کارخانوں میں کپاس کی قلت کا باعث ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں قیمتی دھاتوں کی زیادہ درآمد اور روپیہ کی وسیع تسکیک ہونے لگی۔ اسکی وجہ سے مسئلہ مقدار زر کے بموجب قیمتوں میں اضافہ ہوا۔

(۲) قیمتوں کا اُتار سنہ ۱۸۶۶ء سے سنہ ۱۸۸۳ء تک قیمتیں مسلسل گرتی رہیں لیکن سنہ ۱۸۷۶ء سے سنہ ۱۸۷۹ء تک زبردست قحط رہا جسکی وجہ سے عارضی طور سے اشیاء خوردنی کی قیمتیں چڑھ گئیں اس دوران کے ابتدائی سالوں میں قیمتوں میں عام تخفیف کو پچھلے سالوں کی بڑھیا قیمتوں کا ردعمل اور سالہائے مابعد میں مغربی ممالک میں قیمتوں میں جو کمی ہو رہی تھی اس

کا جواب تصور کرنا چاہئے اس صورت حال کو سونے کی پیدائش میں کمی پر محول کیا جاتا ہے جو عین اس وقت واقع ہوئی جبکہ سونے کی مانگ بڑھتی جارہی تھی اور پیدائش دولت کو فروغ ہونے کی وجہ سے تجارت کو ترقی ہورہی تھی۔

(۳) قیمتوں کا چڑھاؤ (۱۸۸۳ء تا ۱۹۱۳ء) چاندی کی قیمت میں تخفیف ہونے کیوجہ سے ہندوستان میں قیمتیں چڑھ گئیں اس کی وجہ روپے بمقدار کثیر تسکیک کرنا پڑا اور بالآخر روپیہ کی قیمت میں تخفیف ہوگئی۔ چاندی کی رسد اشیار کی پیداوار کے مقابلہ میں بہت بڑھ گئی اور ایک ایسا زمانہ آگیا۔ جبکہ قیمتوں میں مسلسل (اضافہ ہوتا رہا جو ۱۹۲۰ء تک برابر قائم رہا۔ (سوائے ۱۸۹۹-۱۹۱۲ء کی ایک قلیل مدت کے جس میں دارالضرب کے بند ہونے کیوجہ قیمتیں کچھ گر گئیں تھیں

چڑھتی ہوئی قیمتیں ۱۸۹۰ء تا ۱۹۱۲ء | ان حالات کی تحقیقات کے لئے جو قیمتوں میں اضافہ کا باعث ہوئے حکومت ہند نے ۱۹۱۲ء میں مسٹر کے۔ ایل ڈاٹا کو مقرر کیا۔ چنانچہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۲ء تک کی تحقیقات کی گئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ قیمتوں میں عام اور مسلسل اضافہ ہوتا رہا خصوصاً ۱۹۰۵ء کے بعد سے تو قیمتیں بہت بڑھ گئیں تھی۔ قیمتوں کا اشاری عدد (۱۸۹۰-۹۴ء بنیادی سال = ۱۰۰) ۱۹۰۵ء میں ۱۱۶ اور ۱۹۱۲ء میں ۱۴۱ تک بڑھ گیا۔ اس زمانہ میں تمام دنیا میں قیمتوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں دیگر ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ اضافہ عمل میں آچکا تھا۔

(۱) ہندوستان میں قیمتوں کے اضافہ کے خاص اسباب :۔ قیمتوں کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے بموجب ہندوستان میں قیمتوں کے اضافہ کے خاص وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(ا) زرعی پیداوار اور خام اشیار کی رسد میں کمی۔ (ب) ان اشیار کی طلب میں اضافہ۔ (ج) ہندوستان میں ریلوے اور دوسرے ذرائع آمد و رفت کی ترقی جس کے نتیجہ کے طور پر ایک حصہ ملک میں قیمتوں کا اضافہ دوسرے اقطاع ملک میں محسوس ہونے لگا۔ (د) زر اور بنک کاری میں اصلاح اور ساکھ کا بڑھنا۔ (ی) زر کی گردش میں ترقی۔ افراط زر (معیار

مبادلہ طلا کے تحت) کی وجہ سے ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۷ء میں روپیہ کی تسکیک میں اضافہ ہوا تاکہ وزیر ہند نے جو کونسل بل فروخت کئے تھے۔ اس کی رقم ادا کی جائے۔ ہندوستان میں قیمتوں کے اضافہ کا یہ بھی ایک بڑا سبب ہے۔

(۲) عالمی اسباب۔ ہندوستان میں قیمتوں میں اس وجہ سے بھی اضافہ ہوا کہ تمام دنیا میں مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر اس زمانہ میں قیمتیں چڑھ گئی تھیں۔

(ا) دنیا کے بازاروں میں خام اشیاء کی طلب میں اضافہ اور ان کی رسد میں کمی۔ (ب) دنیا کے معدنوں سے سونے کی بڑھتی ہوئی فراہمی (ج) ساکھ میں ترقی (د) تخریبی جنگیں اور مستقل افواج وبحریہ کا قیام۔

جنگ کے زمانہ میں قیمتیں قیمتوں میں اضافہ کا جو رجحان پہلے سے موجود تھا اس میں ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۰ء میں جنگ کے حالات کی وجہ سے بہت اضافہ ہوگیا۔ تمام دنیا میں بھی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں افراط زر کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان میں بھی بڑی مقدار میں جدید روپیہ اور کرنسی نوٹ جاری ہوئے تاکہ توازن تجارت ہندوستان کے موافق قائم رہے۔ اور حکومت کی جانب سے عائد شدہ اخراجات جنگ کی پابجائی ہوسکے۔ ۱۹۱۴ء میں اگر بنیادی قیمت کو ۱۰۰ فرض کیا جائے تو کلکتہ کی تھوک فروش قیمتوں کا اشاری عدد ۱۹۲۰ء میں ۲۰۱ ہوگیا تھا۔ جرمنی۔ فرانس، اور انگلستان میں تو قیمتوں میں اس سے زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں قیمتوں میں نسبتاً ہو کمی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں افراط زر زیادہ نہیں تھا۔ اتحادیوں کی جانب سے اضافہ طلب کی بنا پر غلّہ اور خام پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ قیمتیں اس وجہ سے بھی زیادہ ہوگئی تھیں کہ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں غلّہ کی قلت ہوگئی تھی۔ درآمدی اشیاء مثلاً پارچہ اور شیشہ کی قیمتوں میں اس وجہ سے اضافہ ہوا کہ ان اشیاء کی درآمد میں کمی واقع ہوگئی تھی۔

قیمتوں میں تخفیف سنہ ۱۹۲۰ء میں قیمتیں اپنی انتہا کو پہنچ جانے کے بعد ۱۹۲۱ء سے

ہندوستان اور تمام ممالک میں زر کی قلت، پیدائش دولت میں اضافہ اور تجدید تجارت کے باعث قیمتوں میں تخفیف ہونے لگی۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں امریکہ میں وال اسٹریٹ کے بحران کی وجہ سے قیمتوں میں کمی ہوگئی جس کو دنیا کی گذشتہ طویل معاشی کساد بازاری کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ قیمتوں میں اس عالمگیر تخفیف کو سونے کی کمی اور اس کی غیر مساوی تقسیم پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ساکھ بگڑ گئی اور زر میں کمی واقع ہوگئی نیز اس کی وجہ یہ تھی کہ معمولاً جس قدر مصنوعات دنیا کے بازارات میں کھپ سکتے تھے اور جس قدر زرعی پیداوار صرف ہوسکتی تھی اس سے بڑھکر پیداوار ہونے لگی اس کے اثرات صنعتی ممالک مثلاً انگلستان سے زیادہ زرعی ممالک مثلاً ہندوستان میں نمودار ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں اگر بنیادی قیمت ۱۰۰ فرض کی جائے تو کلکتہ کی تھوک فروش قیمتوں کا اشاری عدد ستمبر ۱۹۲۹ء میں ۱۴۳ ہوگیا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں جب انگلستان نے معیار طلا ترک کیا تو یہ اشاری عدد ۹۱ تک گھٹ گیا یعنی جنگ سے قبل کی سطح سے بھی کم ہوگیا۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں چونکہ روپیہ کا تعلق اسٹرلنگ سے قائم ہوگیا تھا۔ اس لئے انڈکس نمبر ۹۰ تک کا خفیف اضافہ ہوا لیکن یہ برقرار نہیں رہا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں اشاری عدد ۸۸ ہوگیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں ۸۳ تک گھٹ گیا لیکن اس کے بعد قیمتیں ایک سطح پر قائم رہیں اور دسمبر ۱۹۳۳ء میں انڈکس نمبر ۸۹ ہوگیا اس کے بعد دو سال تک قیمتوں میں تغیرات ہوتے رہے اس کے بعد ان میں ترقی ہوئی کیونکہ دنیا میں اسلحہ سازی کی مہم آغاز ہو چکی تھی ۱۹۳۷ء میں اشاری عدد ۱۰۵ ہوگیا اس کے بعد سے قیمتوں میں تخفیف ہونے لگی اور ۱۹۳۸ء میں اشاری عدد ۹۴ ہوگیا اپریل ۱۹۳۹ء میں انڈکس نمبر ۹۹ ہوا اور اس کے بعد کسی قدر اضافہ ہونے لگا اور مئی ۱۹۳۹ء میں اشاری عدد ۱۰۱ ہوا۔

حالیہ جنگ اور قیمتوں کا مسئلہ اس کے بعد جنگ کی وجہ ستمبر ۱۹۳۹ء سے قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ جنگ کے شروع کے مہینوں میں قیمتیں بہت چڑھ گئی تھیں لیکن یہ اضافہ بحرانی کیفیت اور سٹہ کرنے والوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ سٹہ کرنے والے زیادہ قیمت پر فروخت کر کے

زائد منافع کمانے کی امید میں اشیا کے ذخیرہ کر رہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد حالات سدھرنا شروع ہوئے اور جنوری ۱۹۴۰ء سے قیمتیں گرنے لگیں۔ قیمتوں کے گرنے کا سلسلہ تقریباً مئی ۱۹۴۱ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد سے قیمتوں میں تدریجی اضافہ شروع ہوا۔ تدریجی اضافہ کا دور اپریل ۱۹۴۳ء تک قائم رہا۔ اپریل ۱۹۴۳ء سے قیمتوں میں اضافہ بہت تیزی سے ہو رہا ہے کیونکہ جنگ کی وجہ سے درآمد کی موقوفی بالخصوص چاول کی رسد میں کمی ہوگئی۔ جاپان کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لئے ہندوستان کو مرکز بنا دیا گیا۔ انگریزی اور امریکی افواج کے خوراک کے انتظام کے لئے وسیع پیمانہ پر حکومت نے خوردنی اجناس کی خریداریاں کیں جو قیمتوں میں اضافہ کا موجب بنیں۔ نقل و حمل کی دشواریوں ملایا اور برما کے تخلیہ کنندگان اور جنگی قیدیوں کو ہندوستان میں رکھنے کی وجہ سے ملک کے غذائی وسائل پر بار پڑا اور نتیجتہً اشیائے مایحتاج کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔

حیدرآباد اور قیمتوں کی نگرانی حالیہ جنگ کے اثرات کا اندازہ کرنے کے لئے اگر شہر حیدرآباد کے لئے اگسٹ ۱۹۳۹ء کو بنیادی سال قرار دیں اور قیمتوں کو ۱۰۰ فرض کرلیں تو اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۱ء تک قیمتیں بہت زیادہ نہیں بڑھی تھیں لیکن اگسٹ ۱۹۴۲ء میں اشاری عدد ۱۵۲ تک پہونچ گیا۔

حیدرآباد میں نگرانی نرخ اشیا کی کمیٹی کا قیام ستمبر ۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا۔ اس کمیٹی کے قیام کی غرض یہ تھی کہ اشیائے مایحتاج کی درآمد و برآمد اور ان کی قیمتوں پر نگرانی رکھنے کی تجاویز پر غور اور سفارشات پیش کرے۔ دو سال تک سرکار عالی نے اس کمیٹی کے مشورے سے قیمتوں کی نگرانی اور ان پر قابو رکھنے کے لئے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ ذی اثر تجّار کا تعاون عمل حاصل کرکے باہمی سمجھوتہ اور ترغیب کے ذریعہ ان کو اس امر پر آمادہ کیا کہ قیمتوں کو نامناسب حد تک بڑھنے نہ دیا جائے جب جنگ کے ابتدائی زمانہ میں قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا تو خیال تھا کہ کاشتکار اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ حکومت کے اس طرز عمل سے کاشتکاروں کو ضرور فائدہ پہنچا مگر اس

کے ساتھ ساتھ کاشتکاروں سے کہیں زیادہ درمیانی اشخاص نے فائدہ حاصل کیا۔ بالآخر حکومت کو نگرانی نرخ اشیاء کی حکمت عملی اختیار کرنی پڑی اور یہ مسئلہ گیہوں کی قیمت کے تعین سے شروع ہوا۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں نگرانی نرخ اشیاء کا صیغہ جو نظامت صنعت و حرفت سے متعلق تھا معتمدی مالگذاری میں منتقل ہوا اور زائد معتمد مال کو افسر نگرانی نرخ اشیاء مقرر کیا گیا۔ نگرانی نرخ اشیاء کا کام زیادہ تر ان اشیاء سے متعلق ہوگیا جو ضروریات زندگی سے تعلق رکھتی تھیں مثلاً اشیائے خوردنی جلانے کی لکڑی، کوئلہ، کاغذ، روغن گیاس، دیا سلائی۔ پارچہ اور سوت افسر نگرانی نرخ اشیاء نے جن اشیاء کے قیمت کی نگرانی کی وہ حسب ذیل ہیں۔ شکر، گیہوں، جوار، چاول، باجرہ دیگر باریک دانے والے اجناس خوردنی، مونگ پھلی، چنا، تور، مسور، اڑد، کرڈ، گھی اور گڑ۔

اجناس خوردنی کے ذخائر اور ان پر موثر نگرانی کی غرض سے تھوک فروش بیوپاریوں پر اجازت ناموں کا حصول لازمی قرار دیا گیا۔ جون ۱۹۴۲ء میں ارزاں فروشی غلہ کے دوکانات کا قیام عمل میں آیا تاکہ مقررہ قیمتوں پر اشیاء کی فروخت عمل میں آئے اور عوام کو اپنی ضروریات کی اشیاء حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حکومت کی جانب سے حیدرآباد کمرشیل کارپوریشن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تاکہ پیدا کنندگان اور صارفین کے درمیان ربط قائم کیا جائے اور جہاں تک ہوسکے ارزاں قیمت پر غرباء کو غلہ بہم پہنچایا جائے۔ حکومت خود اپنی ضروریات کی اشیائے خوردنی اس کارپوریشن کے توسط سے خریدتی ہے۔ اگر فاضل غلہ ہو تو بیرون ملک اس کی برآمد کارپوریشن کے توسط سے کی جاتی ہے۔ اور جن اشیائے خوردنی کی حیدرآباد میں قلت ہے وہ بیرون حیدرآباد سے کارپوریشن درآمد کرتا ہے۔

حال ہی میں معتمدی رسد کا قیام عمل میں آیا ہے کاشتکاروں کو ساہوکاروں کے پنجے سے آزاد کرنے اور صارفین کو حریص تجار سے نجات دلانے کے لئے ایک اسکیم "مشترکہ ادائی حصہ پیداوار اجناس خوردنی" عمل میں لائی گئی ہے کاشتکاروں سے پیداوار کی خریدی اور دیگر متعلقہ کاروبار

کے لئے ہر موضع میں ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ ان کی امداد باہمی کے اصولوں پر تنظیم عمل میں لائی جا رہی ہے غلہ کو ذخیرہ کرنے کی مناسب سہولتوں کو مہیا کرنے اور امداد باہمی کے اصولوں پر گودام قائم کرنے کے ایک "گودام ٹرسٹ فنڈ" کا قیام عمل میں آیا ہے اس فنڈ کا سرمایہ پچاس لاکھ روپیہ ہے اس ٹرسٹ کا کام یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں موزوں گودام تعمیر کرے تاکہ کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کے لئے ترقی یافتہ اقسام کی کھاد اور تخم ذخیرہ کئے جائیں اور انھیں اپنی پیداوار کو امداد باہمی کے اصولوں پر گوداموں میں رکھنے اور فروخت کرنے کا موقع دیا جائے۔

ہندوستان میں بنک کاری

ہندوستانی بازار زر کے عناصر ہندوستان کے بازار زر[1] اور بنک کاری کے اصلی عناصر حسب ذیل ہیں

(۱) ہندوستانی ریزرو بنک (۲) امپیریل بنک آف انڈیا (۳) مبادلات خارجہ کے بنک۔ (۴) ہندوستانی مشترک سرمایہ دار بنک (۵) دیسی بنک کار جو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں سے موسوم ہیں (مثلاً صراف، ملتانی، بنیا، مارواڑی، مہاجن، ساہوکار) اس بنک کاری کے ابتدائی چار شعبے یورپین طریقہ کا بازار زر ہیں اور سب سے آخری دیسی بازار زر ہے امداد باہمی کے بنکوں کو درمیانی مقام حاصل ہے۔ ہندوستانی بازار زر کے دوسرے چھوٹے عناصر ڈاک خانہ کے سیونگ بنک، زمین گروی بنک، صنعتی بنک اور ملکی قرضوں کے ادارہ جات مثلاً بنگال میں لون آفس اور مدراس میں چٹھی فنڈ ہیں۔ اب ہم ہندوستانی بازار زر کے سب سے اہم عناصر پر غور کریں گے۔ لیکن آگے بڑھنے سے قبل ہندوستانی بنک کاری کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈالنی بھی ضروری ہے۔

---

[1] کسی ملک کے بازار زر سے وہ خاص تنظیم مراد ہے جو ساکھ اور اصل فراہم کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔ اور جو خاص ادارہ جات جیسے بنک، صرافہ، بٹہ کاٹنے والی کوٹھیاں، ہنڈی والوں اور سرمایہ مشغول کرنے والے بنکوں وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

دیسی بنک کاری | ہندوستانی تجارت کی طرح ہندوستانی بنک کاری بھی قدیم زمانہ سے موجود ہے۔ ہنڈی جو دیسی بنک کاروں کی ساکھ کا خاص معیار ہے کئی صدیوں سے یہاں رائج ہے۔ ہنڈی کی اس ملک میں وہی حیثیت ہے جو یورپین ممالک میں بل آف اکسچنج کی یورپ میں بنک کاری کے ارتقار سے کئی صدی قبل ہندوستان میں ملکی بنک کاری کا نظام موجود تھا۔ مغلیہ عہد میں بھی یہ کاروبار وسعت کے ساتھ جاری تھا۔ دیسی بنک کار مختلف کام انجام دیتے تھے۔ وہ امانتیں محفوظ رکھتے تھے اور قرضے بھی دیا کرتے تھے۔ ملک کے ماہران مالیات بھی یہی لوگ تھے اور دارالضرب کے عہدہ دار کی حیثیت سے کام کرتے تھے ان ہی کے ذریعہ زر اور ہنڈیوں کا مبادلہ عمل میں آتا تھا اور یہی لوگ ملک کی تجارت کا سرمایہ فراہم کرتے تھے کچھ عرصہ تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کی سرپرستی کی۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر بہت سے ایسے اسباب پیش آئے جو ان کی خوش حالی کے منافی ثابت ہوئے۔ مثلاً ملک میں سیاسی بدنظمی، کلکتہ اور بمبئی کے ان یورپین ایجنسی ہاؤس کی مسابقت جو بنک کا کاروبار کر رہے تھے اور جن کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل ہو چکی تھی۔ یورپین طرز کی پریسیڈنسی بنکوں کے قیام اور ہندوستان میں ایک ہی قسم کا زر جاری ہو جانے کی وجہ سے دیسی بنک کاروں کے کاروبار کو شدید نقصان پہنچا اور مبادلہ زر جو ان کا ایک اہم کام تھا بند ہو گیا۔ ان مشکلات کے باوجود دیسی بنک کار اب بھی اپنا کاروبار جاری رکھے ہوئے ہیں اور نوّے فیصدی باشندوں کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ہندوستانی بنک کار تقریباً ہر گاؤں، قصبہ اور شہر میں موجود ہیں۔ وہ کاشتکاروں، چھوٹے صناعوں اور تاجروں کو رقم مہیا کرتے ہیں۔ تیار شدہ فصول کو بندرگاہوں اور دوسرے مقامات تک پہونچانے میں مدد دیتے ہیں اور ملک کے اندرونی حصّوں میں ہر قسم کی ضروری اشیار کی تقسیم میں حصہ لیتے ہیں۔ دیسی بنک کار امانتیں محفوظ رکھتے ہیں۔ لیکن جدید بنکوں کی طرح ان کے پاس امانتیں واپس حاصل کرنے کے لئے چک استعمال نہیں کئے جاتے وہ ہنڈیاں جاری کرتے اور ان کی خرید و فروخت بھی کرتے ہیں۔ جس کا مقصد ایک مقام سے دوسرے مقام کو روپے

کی منتقلی یا تجارتی اغراض میں مالی امداد ہے۔ یورپین طرز کی بنکوں سے دیسی بنک کاروں کا بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ عموماً یہ اپنے ہی سرمایہ سے کاروبار کرتے ہیں۔ اور اکثر سرمایہ دار بنکوں سے مسابقت بھی کرتے ہیں۔ کاروباری گرم بازاری کے زمانہ میں جبکہ وہ اپنا سرمایہ کاروبار پر لگا چکتے ہیں تو امپریل بنک یا شہروں کے دوسرے تجارتی بنکوں سے بڑی بڑی رقمیں، ہنڈیوں پرامیسری نوٹ یا مال و اسباب کی ضمانت پر قرض لیتے ہیں۔ امپیریل بنک اور دوسرے مشترک سرمایہ دار بنکوں نے یہ آسانیاں صرف مشہور صرافوں تک محدود رکھی ہیں جن کے نام بنکوں کے ہاں فہرست میں مندرج ہوتے ہیں۔ اب ریزرو بنک ملک کے زر اور قرضہ پر قابو رکھنے والے ادارہ کی حیثیت سے قائم ہو چکا ہے اور اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دیسی بنک کاروں سے بھی تعلق قائم رکھے تاکہ وہ ان کا مددگار ثابت ہو اور ان کی بنک کاری یا قرضہ کے کاروبار کو اپنے قابو میں رکھے جیسا کہ جدولی بنکوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہندوستانی ریزرو بنک کے قانون بابتہ ۱۹۳۴ء کے بموجب ۱۹۳۷ء میں ریزرو بنک نے اس سلسلہ میں تجاویز پیش کئے اور ذاتی سرمایہ، غیر بنک کارانہ تجارت کی موقوفی، حسابات کی نگہداشت وغیرہ کے سلسلہ میں بعض شرائط قائم کئے دیسی بنک کاروں نے انکو قبول نہیں کیا۔

حیدرآباد میں دیسی بنک کاری | ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی کے تحقیقات کے بموجب حیدرآباد میں جو ساہوکار کاروبار کر رہے ہیں سرمایہ کے لحاظ سے ان کی تعداد حسب ذیل ہے۔

وہ ساہوکار جن کا کاروبار ایک کروڑ سے زاید ہے ۵
" پچاس لاکھ سے زاید مگر ایک کروڑ سے کم ۵
" دس لاکھ سے زاید مگر پچاس لاکھ سے کم ۲۰
" ایک لاکھ سے زاید مگر دس لاکھ سے کم ۲۰

اب دو ایک دیسی بنک کاروں کے حالات بیان کئے جاتے ہیں جن سے ان کے کاروبار کا اندازہ ہو سکے گا۔

موتی لال بنسی لال کی فرم حیدرآباد میں ۱۸۳۱ء سے قائم ہے۔ اس فرم کی ابتدا غلہ فروشی سے ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ زر کا کاروبار آغاز کیا گیا۔ موجودہ زمانہ میں مملکت کی سب سے بڑی فرم ہے اور اس کی دولت کا اندازہ تقریباً پانچ کروڑ روپیہ ہے کاشتکاروں کو قرضہ دینے کیلئے ممالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع میں اس فرم کی چار شاخیں ہیں۔ اس فرم کا اصلی کاروبار چھوٹے ساہوکاروں اور ضرورتمند اشخاص خصوصاً نوابوں اور جاگیرداروں کو قرضے دینا اور ہنڈیاں اجرا کرنا ہے صرف ساہوکاروں سے قلیل مدت کے لئے امانتیں قبول کی جاتی ہیں۔

حیدرآباد کا دوسرا بڑا فرم رگھوناتھ مل کا ہے جو تقریباً ۵۵ سال سے قائم ہے۔ ابتدا میں غلہ کی تجارت سے کاروبار شروع کیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں حالی کلدار کا تبادلہ شروع کیا گیا ۱۹۱۸ء میں ایک چھوٹے سے پیمانہ پر جدید طریقہ پر بنک کا قیام عمل میں آیا۔ جو امانتیں قبول کرتا ہے۔ چیکوں کی اجرائی پر رقمیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس بنک کی تین شاخیں اور کئی ایجنسیاں قائم ہیں۔

مملکت کے دیسی بنک کار اپنے فرد واصل باقی شائع نہیں کرتے۔ ان کے کاروبار پردۂ اخفا میں رہتے ہیں۔ اور اپنی مالی حالت کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ بہرحال دیسی بنک کاروں کو منتظم کرنے کی ضرورت ہے۔

یورپین بنک کاری کا نظام | ہندوستان میں یورپین بنک کاری کا نظام سب سے پہلے کلکتہ کے ایجنسی ہاوس نے اپنے تجارتی کاروبار کو ترقی دینے کے مقصد سے رائج کیا۔ دی بنک آف ہندوستان جس کی داغ بیل مسرز الگزینڈر اینڈ کمپنی نے ڈالی ہندوستان میں یورپین طرز کا سب سے پہلا خالص بنک کاری ادارہ خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۸۳۰ء کے تجارتی بحران کے زمانہ میں ایجنسی ہاوس مشکلات میں پھنس گئے اور ان کا خاتمہ ہوگیا اس کے بعد یونین بنک قائم ہوا جو ۱۸۴۸ء میں بند ہوگیا۔ بعد ازآں ۱۸۶۰ء تک بنک کاری کی ترقی سست رہی۔ گو اس زمانہ میں ہی محدود ذمہ داری کا اصول تسلیم کر دیا جا چکا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں کپاس کی قیمتوں کی کمی اور روپے کی شرح مبادلہ میں تخفیف کے باعث بمبئی میں مالی بحران رونما ہوا۔ ان حالات کے تحت بنک کاری میں کوئی ٹھوس ترقی نہ ہوسکی۔

سودیشی تحریک کی وجہ سے عام لوگوں کو بیرونی سرمایہ سے قایم شدہ بنکوں میں اپنے رقمیں جمع کرانے میں تامل پیدا ہوگیا چنانچہ ۱۹۰۵ء کے بعد سے ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی لیکن بدقسمتی سے بہت سے نئے بنک ناتجربہ کار افراد کے ہاتھوں ۱۹۱۳-۱۴ء کے بنک کاری کے بحران میں تباہ ہوگئے۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوگئی۔ اس زمانہ میں ہندوستانی بنک کاری کو بہت تقویت حاصل ہوئی اور ابتدائی بنکوں کی ناکامیوں سے سبق حاصل کرکے ذمہ داریوں کے مقابلہ میں زرنقد کی ایک مناسب مقدار محفوظ رکھنے کا عمل شروع کیا گیا۔ جنگ کے بعد قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے بھی نئے بنک قائم ہوئے لیکن پھر کساد بازاری کا دورہ شروع ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں بہت سے بنک دیوالیہ ہوگئے ۱۹۲۹-۳۱ء میں متعدد صوبہ جات ہند اور مملکت آصفیہ میں بنک کاری کے کاروبار کی تحقیقات کے لئے کمیٹیاں قائم کی گئیں اور ایک مرکزی تحقیقاتی کمیٹی نے صوبہ داری کمیٹیوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ ہلٹن ینگ کمیشن نے ۱۹۲۶ء ہی میں ہندوستانی ریزرو بنک قائم کرنے کی سفارش کی تھی لیکن بڑی تاخیر کے بعد اپریل ۱۹۳۵ء میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ توقع ہے کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کے بازار زر کی جدید تنظیم ہوسکے گی اور اس کا مستقبل ماضی سے زیادہ مستحکم ہوگا۔

ہندوستانی ریزرو بنک ہندوستان کے لئے ایک مرکزی بنک قائم کرنے کا خیال ایک صدی پیشتر پیدا ہوا ایسٹ انڈیا کمپنی نے تینوں پریسیڈنسی بنک قائم کئے۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں علی الترتیب ۱۸۰۶ء، ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۳ء میں یہ بنک قائم ہوئے تاکہ ایک طرف تو ہندوستان کی روز افزوں تجارتی کاروبار اور دوسری طرف خود کمپنی کے بنک کارانہ ضروریات کی تکمیل ہوسکے کل ہندوستان کے لئے ایک مرکزی بنک قائم کرنے کی تجویز بمقام لندن ۱۸۳۶ء میں پیش ہوئی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ تینوں پریسیڈنسی بنکوں کے انضمام کے لئے سب سے پہلے ۱۸۶۷ء میں تجویز پیش ہوئی لیکن بنکوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے بعد اس مسئلہ پر وقتاً فوقتاً بحث جاری رہی۔ آخرکار ۱۹۱۳-۱۴ء میں بنکوں کی ناکامی اور ۱۹۱۴-۱۹ء کی جنگ عظیم نے ایک مرکزی بنک کے قیام کی شدید ضرورت محسوس کرائی اور قانون اپریل

بنک آف انڈیا بابتہ ۱۹۲۰ء کے بموجب تینوں پریسیڈنسی بنک ۱۹۲۱ء میں امپیریل بنک آف انڈیا میں ضم ہوگئے۔ اس کو محدود طور پر ایک مرکزی بنک کی حیثیت سے کام کرنے کا اختیار بھی عطا کیا گیا۔ حکومت ہند کے ساتھ اپنے معاہدہ کی تکمیل کی غرض سے امپیریل بنک نے ایک سو نئی شاخیں قائم کیں۔ اس کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوتا رہا چنانچہ اس وقت اس کی ۱۶۱ شاخیں موجود ہیں۔

ہلٹن ینگ کمیشن نے ایک جدید مرکزی بنک قائم کرنے کی سفارش کی کیونکہ امپیریل بنک اپنی کثیر شاخوں کے ساتھ بڑی حد ایک تجارتی بنک ہے اور یہ کہ اس کو ملک بھر میں عصری بنک کاری سہولتوں کی فراہمی کا فرض انجام دینے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس خیال کے مدنظر سر بیسل بلاکٹ نے ۱۹۲۷ء میں پہلی دفعہ ہندوستانی ریزرو بنک کا مسودہ قانون پیش کیا۔ لیکن بنک ملکیت اور مرکزی و مقامی مجالس کے دستور کے متعلق شدید اختلاف رائے پیدا ہونے کی وجہ سے دو دفعہ اس مسودہ قانون کو ملتوی رکھنا پڑا۔ آخر کار گول میز کانفرنس کی سفارش پر ہندوستانی ریزرو بنک کا قانون ۱۹۳۴ء میں مرتب کیا گیا اور یکم اپریل ۱۹۳۵ء کو اس کا افتتاح عمل میں آیا۔

ہندوستانی ریزرو بنک حصہ داروں کا بنک ہے۔ اور اس کا کامل طور سے ادا شدہ سرمایہ پانچ کروڑ روپیہ ہے۔ ہر حصہ کی قیمت سو روپئے ہے۔ اس کے دفاتر بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دہلی میں ہیں۔ ہر شاخ کے حصہ داروں کے جداگانہ رجسٹر ہیں ریزرو بنک نے لندن میں بھی اپنی شاخ قائم کرلی ہے۔ ریزرو بنک کے تمام انتظام کا کام ایک مرکزی مجلس نظما کے تفویض کیا گیا ہے۔ جس کے حسب تفصیل ذیل ۱۶ اراکین ہوتے ہیں۔ ایک گورنر اور دو ڈپٹی گورنر جن کو

ف ۔ اختلاف یہ تھا۔ (۱) ریزرو بنک اسٹیٹ بنک ہونا چاہئے یا حصہ داروں کا (۲) مرکزی اور صوبہ واری مقننہ کے اراکین ریزرو بنک کے مرکزی اور مقامی مجالس میں شریک کئے جائیں یا نہیں۔ بالآخر منظور یہ ہوا کہ ریزرو بنک حصہ داروں کا بنک ہونا چاہئے اور سیاسی اثرات سے آزاد رہے۔ ہلٹن ینگ کمیشن نے بھی اسی چیز کی سفارش کی تھی

گورنر جنرل باجلاس کونسل بنک کی مرکزی مجلس کی سفارش پر مقرر کرتے ہیں۔ چار نظماء ان کو بھی گورنر جنرل باجلاس کونسل نامزد کرتے ہیں (یہ چار نظماء ٹیکس ادا کرنے والوں کی نمائندگی کرتے اور ملک کے اہم معاشی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں)۔ آٹھ نظماء کو حصہ دار مختلف حلقوں سے منتخب کرتے ہیں ایک سرکاری عہدہ دار اس کا رکن ہوتا ہے۔ بنک کی مرکزی مجلس کو مشورہ دینے کے لئے مقامی مجالس بھی قائم ہیں۔ مرکزی مجلس کے نظماء یا مقامی مجالس بھی قائم ہیں۔ مرکزی مجلس کے نظماء یا مقامی مجالس کے اراکین مرکزی یا صوبہ داری مقننہ کے اراکین نہیں ہوسکتے۔

اب یہاں ریزرو بنک کے اغراض و مقاصد کا اجمالاً ذکر کیا جائیگا۔ ریزرو بنک بلا سودی امانتیں قبول کرتا ہے۔ صوبہ داری امداد باہمی یا جدولی[۲] بنکوں کے مصدقہ پرامیسری نوٹس اور ہنڈیوں کی خرید و فروخت کا کام انجام دیتا ہے۔ تجارتی کاروبار کی صورت میں ان ہنڈیوں اور پرامیسری نوٹس کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ تاریخ خریدی سے نوّد (۹۰) دن کی معیاد میں ادا ہوسکیں لیکن موسمی زرعی کاروبار یا غلہ کی فروخت کی صورت میں نو مہینوں کی مدت دی جاتی ہے۔ ریزرو بنک کے لئے ضروری ہے کہ جدولی بنکوں سے اسٹرلنگ کی خرید و فروخت کرے۔ ان بنکوں کے علاوہ مرکزی اور صوبہ داری حکومتوں ہندوستانی ریاستوں اور مقامی حکومتوں کو قلیل المیعاد قرضے بھی دے سکتا ہے۔ ریزرو بنک حکومت کی جانب سے چاندی، خشت طلاء اور تمسکات کی خرید فروخت کرسکتا ہے۔ ایک ماہ کی مدت یا اس سے کم مدت کیلئے جدولی بنکوں سے قرضے حاصل کرسکتا ہے۔

ریزرو بنک کو نوٹ جاری کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے جس کی رقم عندالمطالبہ اس کے پیش کرنے والے کو ادا کی جائے گی۔ اس کو یہ بھی اختیار دیا گیا ہے کہ عام بازار میں ہنڈیوں پرامیسری نوٹس یا اسٹرلنگ کی براہ راست خرید و فروخت کرے اور عوام کو قرضے دے۔ اس اختیار کے عطاء کا منشاء یہ ہے کہ قرضہ کی مقدار پر قابو حاصل رہے اور اس کے ذریعہ بنک کی ساکھ اور

---

[۲] جدولی بنکوں کی تعداد ۶۲ ہے۔ ہر ایک کا ادا شدہ سرمایہ اور ذخیرہ محفوظ پانچ لاکھ روپیہ اور اس سے زائد بھی ہے جو قانون ریزرو بنک کی ضمیمہ فہرست میں بتلائے گئے ہیں

اس کی شرح کی پالیسی کو موثر بنایا جائے۔

ہندوستانی ریزرو بنک کو بعض خاص قسم کے کاروبار انجام دینے کی اجازت نہیں ہے مثلاً اس امر کی ممانعت ہے کہ وہ خود کوئی تجارتی کاروبار چلائے یا کسی صنعتی اور تجارتی کاروبار سے براہ راست اپنا مفاد وابستہ رکھے۔ بنک کو جائداد غیر منقولہ کی ضمانت پر قرضہ دینے اور امانتوں پر سود ادا کرنے کی بھی ممانعت ہے۔ اس کے علاوہ ریزرو بنک کو معمولی تجارتی بنکوں سے مسابقت کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

اب یہاں مختصر طور پر ریزرو بنک کے ان فرائض پر نظر ڈالی جائے گی جو اسکو بطور ایک مرکزی بنک کے انجام دینا چاہیئے اس بنک کو حکومت کی جانب سے رقم وصول کرنے اور ادائی کے انتظامات عمل میں لانے ہوتے ہیں۔ مبادلہ، ترسیل زر، قرضہ عامہ اور دوسرے بنک کاری کے کاروبار کی تکمیل بھی اسی بنک کے ذمّہ ہے۔ صرف ریزرو بنک کو ہی نوٹوں کی اجرائی کے کامل حقوق حاصل ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے معاملات زر پر قابو رکھنے والے ادارہ کی حیثیت سے بنک کو ضروری ہے کہ روپے کی شرح مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس اسٹرلنگ کی شرح پر قائم رکھنے کے لئے اسٹرلنگ کی خرید و فروخت کرے۔ ہر ایک جدولی بنک کو لازم ہے کہ ریزرو بنک میں اپنی ناگزیر اور موقتی واجبات کا علی الترتیب کم از کم دو اور پانچ فیصد فاضلات فراہم رکھے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ریزرو بنک ملک کے بنک کارانہ محفوظات کو کسی مرکزی نظام کے تابع کرائے۔ اور اس طرح ان قرضہ جات پر قابو رکھا جا سکے جو جدولی بنکوں کی جانب سے اجرا ہوتے ہیں۔ جدولی بنکوں کو اس کا بھی پابند کیا گیا ہے کہ اپنے کاروبار کا ہفتہ واری تختہ ریزرو بنک میں پیش کریں۔

امپیریل بنک کو پندرہ سال کیلئے ریزرو بنک کا واحد کارندہ مقرر کیا گیا ہے تاکہ اس کی شاخوں کے ذریعہ حکومت کی جانب سے سرکاری خزانہ کے فرائض انجام دیئے۔ ریزرو بنک کو بھی گورنر جنرل باجلاس کونسل کے پاس بنک کاری اور صیغہ اجرائے نوٹ کے حسابات کا ہفتہ واری تختہ پیش کرنا پڑتا ہے

قانون ریزرو بنک کے منشاء کے مطابق بنک نے زرعی قرضہ کا ایک خصوصی شعبہ قائم کیا ہے اس کے فرائض یہ ہیں زرعی قرضے کے مسائل کا مطالعہ کرنا، حکومت اور صوبہ واری امداد باہمی کے بنکوں کو ماہرانہ مشورہ دینا، صوبہ واری امداد باہمی یا دیگر بنکوں کے ساتھ جن کا تعلق زرعی قرضہ کے مسائل سے ہو اشتراک عمل کرنا۔ اس شعبہ نے زرعی قرضے کے متعلق دو[2] رپورٹیں شائع کی ہیں اور زرعی رقبوں میں امداد باہمی قرضہ کو تقویت دینے کے سلسلہ میں متعدد سفارشات پیش کئے گئے ہیں

اب جبکہ ریزرو بنک قائم ہو چکا ہے۔ اس امر کی توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے بازار زر کی تنظیم جدید اور اس میں یکسانیت پیدا کی جائیگی۔ اس کے قدیم نقائص مثلاً بازار کے مختلف حصوں کے مابین باہمی تعلقات کا فقدان، حکومت اور امپیریل بنک کی جانب سے زر اور قرضہ کی نگرانی میں دو عملی، زر کی موقتی عدم تغیر پذیری اور اس کی اعلیٰ شرح اور ہنڈیوں کے قلیل استعمال کا ارتفاع ہو سکے گا ان کے علاوہ اس بنک کے قیام سے عام طور پر ہندوستانی بنک کاری کے طریق کو تقویت پہونچیگی۔ بشرطیکہ ریزرو بنک اور ملکی بنک کاروں کے درمیان باہمی اشتراک عمل کا انتظام کیا جائے۔ جنگ کے دوران میں ریزرو بنک کی حالت مستحکم رہی۔ امانتوں میں اضافہ ہوا۔ نقد اثاثوں میں کمی ہوئی۔ قلیل رقمی کاروبار اور تمسکات، اسٹرلنگ میں زیادہ رقومات لگائی گئیں۔ فاضلات جو بیرون ہند رکھائے گئے ان کی مقدار بڑھ گئی۔ سرکاری قرضوں میں بحیثیت مجموعی اضافہ ہوا۔ کم مالیت کی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹا گیا۔ جنگ کے چھڑتے ہی عوام میں ہراسانی پھیل گئی اور لوگ بنکوں سے اپنی امانتیں واپس لینے لگے ایسے نازک وقت میں ریزرو بنک کی وجہ سے بڑی مدد ملی۔ اس نے جدولی بنکوں کو رقم فراہم کی اور اس طرح مرکزی بنک کی حیثیت سے اس نے اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کر دکھایا۔

حیدرآباد اسٹیٹ بنک | حیدرآباد اسٹیٹ بنک کا قانون سنہ ۱۳۴۱ف میں منظور ہوا۔ ۹ ڈسمبر ۱۹۴۱ء کو حصہ داروں کا پہلا جلسۂ عام منعقد ہوا۔ حیدرآباد اسٹیٹ بنک اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ وہ ترویج زر کو منظم کرے اس کے استحکام و تحفظ کو برقرار رکھے۔ اندرون و بیرون ممالک محروسہ

ادائی زر میں سہولت پیدا کرے۔ ملک کی معاشی زندگی کو ترقی دینے کے لئے ضروری قرضے فراہم کرے اور ممالک محروسہ میں زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی میں حوصلہ افزائی کرے۔

حیدرآباد اسٹیٹ بنک حصہ داروں کے ایک بنک کی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کے قوانین میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ بنک آبادی کے تمام طبقوں کی ضروریات بنک کاری کی تکمیل اور ان کے مفاد کی حفاظت کر سکے۔ اس کا کامل طور سے اداشدہ سرمایہ ۷۵ لاکھ روپے سکہ عثمانیہ ہے ہر حصہ کی قیمت سو روپے ہے۔ ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے کے مجوزہ سرمایہ میں سے ۷۵ لاکھ روپے مجموعی رقم کے حصص جاری کئے گئے جن میں سے ۳۸ لاکھ ۲۵ ہزار روپے کے حصص حکومت کے لئے مختص کر دیئے گئے اور باقی ماندہ حصص عوام نے خریدے۔

اس بنک کی مجلس نظماء میں حکومت کے نامزد کردہ اور حصہ داروں کے منتخب کردہ دونوں قسم کے نظماء شامل ہیں اور اس انتظام کی وجہ سے یہ بنک اس قابل ہو گیا ہے کہ حکومت کی سرپرستی سے پورا فائدہ اٹھائے اور باشندوں کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملک کے معاشی وسائل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرے۔ حکومت سرکار عالی نے اس بنک کے جاری کردہ سرمایہ حصص کا ۵۱ فیصد حصہ خریدا ہے اور ایسا کرنا ضروری تصور کیا گیا کیونکہ ایک تجویز یہ بھی ہے۔ کہ حکومت کی تمام نقدی سلک بنک کے پاس امانت رکھی جائے۔ مختلف محفوظ سرمایہ کا انتظام بھی اس کے تفویض کر دیا جائے جن میں سرمایہ محفوظ زر کاغذی، قرضہ ہائے عامہ کا انتظام اور حکومت کے کارندے کے طور پر کرنسی نوٹوں اور سکوں کی اجرائی جیسے امور شامل ہیں۔

اسٹیٹ بنک کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً حکومت کے جاری کردہ اعلانوں کے ذریعہ مقرر کی ہوئی اقل ترین اور بیش ترین شرحوں پر برطانوی روپیوں کی خرید و فروخت کرے اور اس طریقہ کار کی وجہ سے یہ بنک اس قابل ہو جاتا ہے کہ شرح مبادلہ کے اتار چڑھاؤ کو حکومت کی مقرر کردہ حدود (یعنی ۱۰۰ روپے کلدار کے معاوضہ میں ۱۱۶ تا ۱۱۷ روپیہ حالی) کے اندر برقرار رکھنے پر قابو رکھ سکے۔

اس بنک کے تمام حصص پر کم از کم تین فیصدی سالانہ منافع دینا واجب ہے اور اس منافع کی مستقل ادائی کی ضمانت حکومت نے لی ہے

ممالک محروسہ کے تمام اہم تجارتی مرکزوں اور اضلاع کے صدر مقاموں میں اسٹیٹ بنک کی شاخیں قائم کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔ ورنگل۔ گلبرگہ، رائچور، لاتور، جالنہ، کپل، یادگیر، شاہ آباد اور کھمم میں اس کی شاخیں قایم ہو چکی ہیں۔

امپیریل بنک آف انڈیا | ریزرو بنک کے قیام کے بعد امپیریل بنک آف انڈیا نے ملک کے سب سے بڑے تجارتی بنک کی حیثیت کر لی ہے۔ ریزرو بنک کا واحد کارندہ مقرر ہونے کی وجہ سے یہ بنک جو عملاً حکومت کے فاضلات کی نگرانی کرتا ہے۔ ایک خصوصی قانون کا پابند ہے۔ جس کی رو سے اس کے دائرۂ عمل پر تحدیدات عاید کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بنک چھ ماہ سے زائد عرصہ کے لئے یا غیر منقولہ جائداد مثلاً زمینات کی ضمانت پر قرضہ نہیں دے سکتا۔ لیکن انگلستان میں امانتوں کو قبول کرنے اور قرضے حاصل کرنے یا ممالک غیر کے کاروبار مبادلہ اختیار کرنے کے سلسلہ میں جو قدیم پابندیاں عاید تھیں ان سے اب یہ بنک آزاد ہے۔ امپیریل بنک امانتیں قبول کر سکتا ہے۔ قرضہ پر رقمیں دے سکتا ہے حکومت کے تمسکات، اسٹیٹ ریلوے بانڈز، بلدیہ اور مقامی مجالس کے ڈبنچر یا پرامیسری نوٹ پر نقد قرضے ایصال کر سکتا ہے۔ اس بنک کو ہنڈی قبول کرنے ان پر بٹہ حاصل کرنے اور ان کو فروخت اور دوسرے قابل بیع و شریٰ تمسکات کو قبول کرنے کی اجازت ہے اور بحیثیت وصی جائدادوں کے نظم و نسق کی ذمہ داری بھی یہ بنک قبول کر سکتا ہے اور بھی چند اختیارات اس بنک کو حاصل ہیں جنکی تفصیل موجب طوالت ہے۔

امپیریل بنک کی ۱۶۱ شاخیں ہیں۔ ہندوستان میں کسی بنک کی اس قدر شاخیں نہیں ہیں پریسیڈنسی شہروں میں اس کے تین مقامی صدر دفتر قائم ہیں اور مقامی مجالس نظمار کے ذریعہ ہر شاخ کے کاروبار کی نگرانی اور انتظام کیا جاتا ہے۔ امپیریل بنک آف انڈیا کے کاروبار پر نگرانی قائم رکھنے کے لئے ایک مرکزی مجلس نظمار قائم ہے جو مقامی مجالس کے صدر اور نائب

صدروں میں سے منتخب شدہ ایک رکن ایک مینجنگ اور ایک ڈپٹی مینجنگ ڈائرکٹر جن کو مرکزی مجلس مقرر
کرتی ہے۔ دو اراکین جن کو گورنر جنرل باجلاس کونسل نامزد کرتے ہیں اور مقامی مجالس کے معتمدین پر
مشتمل ہوتی ہے۔ امپریل بنک کا سرمایہ اور محفوظ ۱۵ کروڑ روپے ہے مئی ۱۹۴۲ء میں ادا شدہ
سرمایہ ۵ کروڑ ۶۲ لاکھ اور ذخیرہ محفوظ ۵ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے تھا۔ جملہ امانتی رقم تقریباً ۱۲۷ کروڑ روپیہ
ہے بنک کے لئے لازم ہے کہ اپنے اثاثے اور ذمہ داریوں کا ہفتہ وار تختہ شائع کرے۔

امپریل بنک کی ایک شاخ حیدرآباد میں ۱۸۶۸ء میں قائم ہوئی۔ اضلاع ناندیڑ، پربھنی، نظام آباد
اور گلبرگہ میں بھی امپریل بنک کی ایجنسیاں قائم ہیں۔

مبادلہ بنک | ہندوستان میں بیس مبادلہ بنک کام کر رہے ہیں۔ ان تمام بنکوں کے صدر دفاتر
بیرون ہند میں قائم ہیں۔ یہاں ان کی شاخیں کام کرتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم برطانوی بنک ہیں
جنکی تعداد آٹھ ہے۔ دوسرے ممالک جن سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات وابستہ ہیں انھوں نے
ہندوستان میں اپنے مبادلہ بنک قائم کر رکھے ہیں۔ مبادلہ بنکوں کی سرکاری تقسیم حسب ذیل ہے۔

(۱) جو ہندوستان میں ایک قابل لحاظ پیمانہ پر کاروبار انجام دیتے ہیں اور جن کی امانتوں کا ۲۵
فیصدی ہندوستان میں محفوظ ہے۔ مثلاً نیشنل بنک آف انڈیا یا چارٹرڈ بنک آف انڈیا۔

(۲) وہ بنک جو ایسے بڑے بنکوں کی ایجنسیاں ہیں جو تمام ایشیا میں اپنا کاروبار انجام دے
رہے ہیں اور جن کی امانتوں کا ۲۵ فیصدی سے کم ہندوستان میں محفوظ ہے

مبادلات خارجہ کے کاروبار میں ہندوستانی مشترک سرمایہ دار بنکوں کا بہت کم حصہ ہے۔
اس کے وجوہ یہ ہیں۔ (۱) ضرورت کے بموجب سرمایہ کا فقدان ہے۔ (۲) بیرونی مرکزوں میں شاخوں
کی غیرموجودگی (۳) بیرونی مبادلہ بنکوں کے استحکام اور قدیم سے جاری رہنے کی وجہ سے ہندوستانی
مشترک سرمایہ دار بنک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

بہر حال پہلا ہندوستانی ایکسچینج بنک سنٹرل بنک آف انڈیا کے زیر سرپرستی لندن میں قائم ہوا لیکن
بعد میں اس کا انضمام برکلے بنک لمیٹیڈ لندن کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں عمل میں آیا۔

مبادلہ بنکوں کا اصلی کاروبار خارجی ہنڈیوں کی خریدی اور اس پر بٹہ کاٹنے کے ذریعہ ہندوستان کی تجارت خارجہ کو مالی امداد بہم پہونچانا ہے۔ یہ بنک اصل میں برآمدی ہنڈیوں پر لین دین کرتے ہیں یہ ہنڈیاں زیادہ تر وہ ہوتی ہیں جن کو ہندوستان کے ایسے تاجر جو اپنا مال باہر بھیجتے ہیں فروخت کرتے ہیں بعد ازاں یہ ہنڈیاں لندن کو ارسال کی جاتی ہیں۔ لندن کے بنک ان پر دوبارہ بٹہ کاٹتے ہیں اور اپنے اسٹرلنگ فاضلات کی طمانیت پر جس میں خارجی ہنڈیاں خریدنے کی وجہ سے اور مزید اضافہ ہوتا ہے مبادلہ بنک ہندوستانی ریزرو بنک کو اسٹرلنگ فروخت کرتے ہیں۔ ریزرو بنک اس کا اس وجہ سے ضرورت مند رہتا ہے کہ وہ اس کو مطالبات وطن کی ادائی میں وزیر ہند کو ارسال کرنے میں استعمال کر سکے۔ دوسرے اشخاص مثلاً مال بیرونی ممالک سے ہندوستان میں درآمد کرنیوالے یا طلبا جو بیرون ہند میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کے سرپرست بھی مبادلہ بنکوں سے اسٹرلنگ ڈرافٹ لندن میں ادائی کے لئے خریدتے ہیں۔ اصول توازن تجارت کے حسب ضرورت یہ بنک یا تو سونا درآمد یا برآمد کرتے ہیں۔ ہندوستان کی درآمدی تجارت کو مالی امداد بہم پہونچانے میں مبادلہ بنکوں کی شاخیں جو بیرون ہند قائم ہیں بہت اہم اور نمایاں حصہ لیتی ہیں۔ اس کاروبار میں ہندوستانی شاخوں کا پہلا کام یہ ہے کہ ادائی کے زمانہ میں درآمدی ہنڈیاں (جو ہندوستانی درآمدکنندگان کے نام تحریر کئے جاتے ہیں) اکٹھا کر کے اپنے بیرونی صدر دفاتر اور شاخوں کو ان ہندوستانی درآمدکنندگان کی حیثیت اور وسائل کی نسبت معلومات بہم پہونچائیں جن کے نام بیرونی قرض خواہ ہنڈیاں حاصل کرتے ہیں۔

مبادلہ بنک مبادلات خارجہ کے کاروبار کے علاوہ معمولی بنک کاری کے کاروبار بھی انجام دیتے ہیں اس طرح وہ ہندوستانی مشترک سرمایہ دار بنکوں سے بھی مسابقت کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بعض مبادلہ بنکوں نے اندرون ملک مثلاً کانپور اور دہلی میں بھی اپنی شاخیں قائم کی ہیں، اور اس طرح ہندوستان کی داخلی تجارت کے لئے سرمایہ فراہم کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ بنک خود ہندوستان میں بمقدار کثیر امانتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں (چنانچہ سنہ ۱۹۴۰ء میں امانتوں کی مقدار ۸۵ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے تھی)

بہرحال ہندوستانی مشترک سرمایہ داربنکوں کو داخلی تجارت اور معمولی بنک کاری کے میدان میں بھی بیرونی مہیب رقابتوں کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔

ملک کی خارجی تجارت کے کاروبار میں ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ موقع پہونچانے کے لئے مرکزی بنکنگ انکوائری کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ مبادلات خارجہ کے بنکوں پر اجازت ناموں کی قید عائد کرکے ان پر نگرانی قائم کی جائے۔ اس کی دوسری تجویز یہ ہے کہ اگر امپریل بنک مبادلات خارجہ کے کاروبار کو وسعت دینے میں ناکام رہے جس کے اختیار کرنے میں اب وہ آزاد ہے تو ایک خانگی ہندوستانی مبادلہ بنک حکومت کی امداد کے ساتھ قائم کیا جائے۔

مشترک سرمایہ دار بنک | ہندوستان میں مشترک سرمایہ داربنکوں کی حالیہ ترقی کا ذکر قبل ازیں ہوچکا ہے ان بنکوں کی نوعیت بڑی حد تک تجارتی ہے، اور صرف قلیل المیعاد قرضے ایصال کرتے ہیں۔ یہ امانتیں قبول کرتے اور مقامی ہنڈیوں پر بٹہ کاٹتے، نقد قرضے کے کھاتے کھولتے، صرافہ کے تمسکات نقلے یا کپاس کی کفالت پر قرضے دیتے، کمپنیوں کے حصے خریدتے اور اُن کو فروخت کرنے کے علاوہ متفرق بنک کاری کے کاروبار بھی انجام دیتے ہیں۔ ۳۱۔ڈسمبر ۱۹۴۴ئہ تک مشترک سرمایہ داربنکوں کی تعداد ۵۸ تھی اور جن کا اصل اور محفوظ سرمایہ پانچ لاکھ روپیے اور اس سے زائد تھا، اُن کا ادا شدہ سرمایہ ۹ کروڑ ۹ لاکھ روپیے مابقی سرمایہ بشمول مد محفوظ ۵ کروڑ ۷ ۵ لاکھ روپیے امانتیں ۱۱۳ کروڑ ۹۸ لاکھ اور نقد فاضلات کی مقدار ۲۶ کروڑ ۳۶ لاکھ روپیے تھی ۔۳۱ ڈسمبر ۱۹۴۴ئہ تک ایسے مشترک سرمایہ دار بنک جن کا اصل اور محفوظ سرمایہ پانچ لاکھ اور ایک لاکھ روپے کے درمیان تھا، اُن کی تعداد ۱۲۲ تھی۔ اُن کا اداشدہ سرمایہ ایک کروڑ ۶۷ لاکھ روپیے، مابقی سرمایہ بشمول مد محفوظ ۷۶ لاکھ روپیے، امانتیں ۱۱ کروڑ ۴ لاکھ اور نقد فاضلات کی مقدار ۲ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے تھی۔ ہندوستان کے پانچ بڑے بنک بنک آف انڈیا، سنٹرل بنک آف انڈیا، (جو ایک ایسے کامیاب بنک کی نمایاں مثال ہے جسکی ملکیت اور انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے) پنجاب نیشنل بنک، بنک آف بڑودہ، اور الہٰ آباد بنک ہیں۔

سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں بنکوں کی ناکامی کے بعد سے ہندوستان میں مشترک سرمایہ دار بنکوں میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے زیادہ توجہ مبذول کی گئی ہے

ہندوستان میں بنکوں کی ناکامی کے اسباب حسب ذیل ہیں :-

(۱) نقد فاضلات کی عدم فراہمی۔ (۲) اداشدہ سرمایہ کی قلت۔ (۳) تجربہ کار اور تربیت یافتہ مینیجروں کا فقدان۔ (۴) غیر محتاط قرضے۔ (۵) بعض صورتوں میں فریب دہی۔

مرکزی بنکنگ انکوائری کمیٹی نے ایک خاص قانون بنک کے نفاذ کی سفارش کی ہے۔ کیونکہ موجودہ ہندوستانی کمپنیوں کا قانون جو تمام قسم کے مشترک سرمایہ دار کمپنیوں پر حاوی ہے بنکوں میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ اگرچہ کہ ہندوستانی کمپنیوں کے مرمہ قانون بابتہ ۱۹۳۶ء میں بنکنگ کمپنیوں میں زیادہ باقاعدگی پیدا کرنے کے خیال سے بعض دفعات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ریزرو بنک کے زیر نگرانی ملک میں مشترک سرمایہ دار بنکوں کے قیام کی کافی وسعت ہے۔

مملکت آصفیہ میں بنک کاری | تقریباً دس سال قبل بنک کاری کی تحقیقات کے متعلق خان بہادر احمد محی الدین صاحب ڈپٹی مانیجنگ ڈائرکٹر حیدرآباد اسٹیٹ بنک نے سرکاری طور پر رپورٹ مرتب کی تھی۔ مملکت آصفیہ میں بنک کاری کی موجودہ صورت یہ ہے کہ بہت سا بیرونی سرمایہ ملک میں منافع کما رہا ہے اور باہر چلا جارہا ہے، اور خود ملک کی بڑی رقمیں باہر کے بنکوں میں بغرض حفاظت جمع ہوکر باہر فائدہ پہونچا رہی ہیں۔ یہ حالت فلاح ملک کے منافی ہے۔ ضرورت ہے کہ اعلیٰ اور متوسط طبقے سب کے اندوختے بنکوں میں جمع ہوکر قلت سرمایہ کی دشواری رفع کریں اور بنکوں کے ذریعہ کاروبار کو مالی امداد ملے۔ یہ سچ ہے کہ بنک چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن جو کام دوسرے ملکوں میں کامیابی سے انجام پارہے ہیں وہ یہاں کیوں محال سمجھے جائیں۔

سنٹرل بنک آف انڈیا کی ایک شاخ حیدرآباد میں ۱۹۳۳ء میں قائم ہوئی۔ اسکی شاخیں جالنہ۔ سیلو۔ ورنگل۔ رائچور۔ اورنگ آباد اور لاتور میں قائم ہیں۔ مملکت آصفیہ میں مشترکہ سرمایہ دار بنکوں کی تعداد ۱۹۳۹ء میں ۲۲ تھی۔ حال ہی میں ایک کروڑ روپے کے سرمایہ سے اورنگ آباد میں

ایک بنک قائم ہوا ہے۔ حیدرآباد اسٹیٹ بنک کے زیر نگرانی ملک میں مشترک سرمایہ دار بنکوں کے قیام کی کافی گنجائش موجود ہے۔

دی حیدرآباد اسٹاک ایکسچینج لمیٹیڈ حکومت سرکار عالی نے حیدرآباد میں ایک منظم اسٹاک ایکسچینج کے قیام کی ضرورت محسوس کی تاکہ مقامی اداروں سے وسیع مفاد وابستہ رکھنے والے برطانوی ہند کے سرمایہ کاروں کے علاوہ حکومت سرکار عالی اور ممالک محروسہ کے سرمایہ دار بھی بنک کاری اور صنعت و حرفت میں کثیر اصل صرف کر رہے ہیں۔ تمسکات کی منتقلی حیدرآباد میں وسیع پیمانہ پر جاری ہے۔ متعدد دلال اور بنک کار خود اپنی یا اصل کاروبار والے اشخاص کی جانب سے حیدرآباد اور بمبئی کے مارکٹوں میں یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ ان حالات کے تحت یہ محسوس کیا گیا کہ اگر یہ کاروبار کسی باقاعدہ اسٹاک ایکسچینج کے ذریعہ منظم نہیں کیا گیا تو ممکن ہے کہ عوام کے لئے اس کے نتائج بہتر نہ ہوں اور ایسی صورتیں پیدا ہو جائیں جن سے سٹہ بازی کا اندیشہ ہو۔

اس وجہ سے حکومت نے نواب کمال یار جنگ کی صدارت میں ایک کمیٹی کا اعلان کیا تاکہ ایک دستور مرتب کرے جس کے تحت حیدرآبادی صرافہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کمیٹی کی سفارشات میں ایکسچینج کے حسب ذیل مقاصد مقرر کئے گئے ہیں۔ (۱) تمسکات کے کاروبار کو بہتر طور پر منظم کرنا۔ (۲) ناپسندیدہ طریقوں کو مسدود کرنا۔ (۳) اراکین کے باہمی نزاعات اور اراکین اور ان کے انتخاب کنندوں کے درمیان نزاعات میں ثالثی کرنا اور تصفیہ کرنا۔ (۴) جب مقدار کاروبار اس کی اجازت دے تو ہنڈیاں پٹانے کے لئے حساب گھر کا انتظام کرنا۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جو قواعد و ضوابط تجویز کئے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:۔ ایکسچینج کی نگرانی ایک مجلس انتظامی کے سپرد ہوگی جس کے اراکین حکومت، اسٹیٹ بنک کمیٹی ساہوکاران ایوان تجار اور اراکین اسٹاک ایکسچینج پر مشتمل ہونگے۔ بورڈ کا فرض ہوگا کہ وہ ایسے تمسکات کی فہرست کا تعین کرے جن کے لین دین کی اجازت ہوگی۔ بورڈ دلالی کی شرح مقرر کرے گا اور ایکسچینج اور اس کے سرمایہ کے کاروبار کی نگرانی کرے گا۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد میں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے دی حیدرآباد اسٹاک ایکسچینج لمیٹیڈ کا افتتاح کیا۔ ۵۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء تک اس ادارہ کو ۲۱ ہزار نو سو تیس روپیے کی آمدنی ہوئی،

اور اخراجات گیارہ ہزار ایک سو سولہ روپے ہوئے۔ سرمایہ مشغولہ کی مقدار ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپے ہے
۵۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء کے اختتام پر اراکین کی تعداد ۴۵، ایجنٹ کی تعداد ۱۲۱ اور ذیلی برو کرس ۲۴ تھے۔
دوران سال میں اراکین کے چار باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا گیا۔

ہندوستان میں دوسرے قسم کے بنک

اس سے قبل امداد باہمی اور زمین گروی بنکوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ملک میں کسی بنک کاری کا کوئی خاص انتظام موجود نہیں ہے جو صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے مشنری کی خریدی اور کارخانوں کے تعمیری اغراض کے لئے طویل المیعاد قرضے دے۔ اس قسم کے بنکوں کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ صنعتی کمیشن اور مرکزی بنکنگ انکوائری کمیٹی نے بھی اس کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے۔ آخرالذکر کمیٹی نے صوبہ واری حکومتوں اور ایک کل ہند صنعتی کارپوریشن کی مدد سے ہر صوبہ میں ایک صوبہ واری صنعتی کارپوریشن کے قیام کی سفارش کی ہے۔ حکومت کی جانب سے مدراس، پنجاب اور بنگال میں قانون امداد صنعت کے تحت قرضے عطا کئے جاتے ہیں لیکن یہ امداد صرف گھریلو صنعتوں کی حد تک محدود ہے۔ صنعتی بنکوں کی ضرورت اب بھی برابر محسوس کی جارہی ہے تاکہ پیمانۂ کبیر کی صنعتوں کے لئے طویل المیعاد قرضے فراہم کئے جاسکیں۔ اس موقع پر ڈاک خانوں کے سیونگ بنک کا ذکر بھی ضروری ہے جو ہندوستان کے تمام حصوں میں ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء میں قائم ہوئے۔ ادنیٰ اور متوسط طبقوں کے لئے یہ بنک رقم بطور امانت محفوظ رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ حکومت رقم کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔ ڈاک خانوں کے سیونگ بنک کی تعداد ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۱۲۱۰۹، کھاتہ داروں کی تعداد ۴۲۴۰۷۹۱ اور امانتی رقوم کی مجموعی مقدار ۸۱ کروڑ ۹۴ لاکھ روپے تھی۔ سیونگ بنک امانتوں پر ۱½ فی صدی سود ادا کرتے ہیں جو کسی وقت بھی بعض شرائط کی تکمیل کے بعد بہ آسانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہر شخص سالانہ ۷۵۰ روپے جمع کراسکتا ہے۔ مجموعی امانت کی اعظم ترین مقدار جو کھاتہ میں جمع کرائی جاسکتی ہے پانچ ہزار روپے اور اقل ترین مقدار چار آنے ہے۔ ان بنکوں سے رقم ہفتہ میں صرف ایک بار حاصل کی جاسکتی ہے۔

۱۹۳۱ء میں ڈاک خانوں نے قلیل مقدار کے مدافعتی قرضوں کا بھی انتظام کیا ہے جس پر زائد

شرح سے سود ملتا ہے۔ ۴۳-۱۹۴۲ء میں اس کی مقدار ۵ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے تھی

۱۹۳۷ء کے بعد سے ڈاک خانوں میں پس اندازی کا ایک نیا طریقہ جاری ہوا ہے۔ اس کے لئے پانچ سالہ پوسٹل کیاش سرٹیفکٹس دس روپے سے لیکر دس ہزار روپے تک کے اجرا کیئے جاتے ہیں۔ ان پوسٹل کیاش سرٹیفکٹس کی مجموعی مقدار ۳۱ مارچ ۱۹۴۲ء میں ۳۹ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے تھی شرح سود کے مسلسل تخفیف کے باوجود ان سرٹیفکٹس کی طلب روز افزوں ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو سونا برآمد ہو رہا ہے اس کی فروخت کا کچھ حصہ ان سرٹیفکٹس میں لگا دیا جاتا ہے۔ کوئی شخص دس ہزار سے زائد کے سرٹیفکٹس حاصل نہیں کر سکتا۔

مملکت آصفیہ میں سیونگ بنک سرکار عالی کے ڈاکخانوں میں سیونگز بنک قائم کر کے عوام کو کفایت شعاری اور پس اندازی کی کافی ترغیب دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان سیونگ بنکوں کے قیام کی وجہ سے دور افتادہ علاقوں میں بھی بنک کاری کی سہولتیں فراہم ہو گئی ہیں، اور عام طور پر انھیں امانتیں رکھنے کا ایک محفوظ ذریعہ تصور کیا جانے لگا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں مملکت آصفیہ میں سیونگ بنک کے کھاتہ داروں کی تعداد ۹۸۱۵۰، اور ان بنکوں میں امانتی رقوم کی مجموعی مقدار ۶۶ لاکھ ۷۹ ہزار روپے تھی۔

حال ہی میں ڈاک خانوں میں کیش سرٹیفکٹ سسٹم کا طریقہ جاری کیا گیا ہے جس کے مطابق پانچ سال کی مدت کے لئے امانتیں رکھی جاتی ہیں، شرح سود کا یہ حساب ہے کہ جتنی زیادہ مدت کے لئے رقم امانت رہیگی اتنی زیادہ سود کی شرح بھی ہوگی۔ فی الحال دس روپے سے لیکر پانچ ہزار روپے تک نو مختلف اقسام کے کیش سرٹیفکٹ جاری کئے جاتے ہیں۔

پس اندازی کی عادت ہندوستانیوں کے رقم کے پس انداز کرنے کے سلسلہ میں بڑی اختلافی بحث پیدا ہو گئی ہے۔ ہندوستان قیمتی دھاتوں یعنی سونے اور چاندی کا ایک غیر محدود خزانہ خیال کیا جاتا ہے، ہندوستان کے اندوختہ کا تخمینہ ایک ارب پونڈ تک کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ صنعتی اور دیگر ملوا اغراض کے لئے سونے کا استعمال صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ طریقہ یوروپین ممالک میں بھی رائج ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان کی کثیر آبادی کے پیش نظر اندوختہ کی مجموعی مقدار کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہندوستان سے سونے کی جو کثیر برآمد ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ فروخت

وقت ہندوستانی اپنے اندوختہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ دفینہ کی شکل میں اس کو محفوظ رکھا کر ضائع نہیں کیا جاتا۔ اندوختہ عموماً کم مقدار میں ہوا کرتا ہے۔ گھریلو اور صنعتی اغراض میں سونے اور چاندی کا استعمال رسوم ورواج اور قدیم روایات کی بناء پر مروج ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں اندوختہ کرنے کی عادت موجود ہے تاہم اس میں بڑے مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اندوختہ کرنے کی عادت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ پہلے زمانہ میں جان ومال کی حفاظت سے لوگ مطمئن نہیں تھے۔ ہندوستان متعدد بیرونی حملہ آوروں کا نشانہ رہا ہے، اس زمانہ میں جو عادت پیدا ہوئی اُس کا سلسلہ امن و امان کے زمانہ میں بھی جاری ہے۔ عام طور پر یہاں کے باشندوں کا غیر تعلیم یافتہ ہونا اور بینک کاری کی مناسب سہولتوں کا فقدان بھی اس عادت کا سبب ہے۔

لوگوں کے اندوختہ کو پیدا آور اغراض میں لگانے کی ترغیب دینے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ڈاک خانوں کے سیونگ بینک اور امداد باہمی کی انجمنوں کی تعداد میں اضافہ کے علاوہ طلائی سرٹیفکیٹس کی اجرائی عمل میں لائی جائے۔ طلائی سرٹیفکٹس سے یہ مراد ہے کہ ان کی ادائی میں خود سونا دیا جائے۔ امداد باہمی اور دوسری نوعیت کے چیکوں کے استعمال اور بینک کارانہ سہولتوں میں وسعت اور قومی کفایتی اداروں کا قیام بھی ضروری ہے جن کے ذریعہ لوگوں میں کفایت شعاری کی عادت پیدا کی جائے۔ اور چھوٹی چھوٹی رقمیں پس انداز کرنے والوں کو محفوظ اور مفید امانتی ذرائع سے روشناس کرایا جائے۔ ناخواندگی کے ازالہ، تعلیم کے ذریعہ معاشرتی اور مذہبی اصلاح اور عام روشن خیالی کی ترویج بھی اس مقصد کے حصول میں مدد و معاون ہو سکتی ہے۔

مزید بنکوں کی ضرورت | ہندوستان میں بنک کاری کی آسانیاں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ تمام ہندوستان میں ۳۱ ڈسمبر ۱۹۴۷ء تک ۴۷۰۲ بنکوں کے صدر دفاتر اور شاخیں تھیں یا اس میں ایجنسیاں بھی شامل ہیں۔ ۵۵۷۴ قصبات کے منجملہ صرف چار سو قصبات میں بنکوں کی شاخیں یا ایجنسیاں ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ مشترک سرمایہ دار اور امداد باہمی کے بنکوں کے قیام کی مہم آغاز ہو اور ان کی شاخیں ہندوستانی ریزرو بینک کی نگرانی اور رہبری میں قائم کی جائیں

نیز ملکی بنک کاروں کی خدمات سے بھی پوری طرح استفادہ کرنے کی غرض سے ان کو مشترک سرمایہ دار بنکوں کے ایجنٹ مقرر کیا جانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ان بنکوں کو کاروبار باقاعدگی کے ساتھ جدید اُصول پر چلانے کی بھی ضرورت ہے۔

ساتواں باب

مالیات

تمہید موجودہ زمانہ میں ہندوستانی مالیات میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم سے قبل (۱۹۱۴-۱۸ء) سارے ہندوستان کے لئے ایک ہی موازنہ ہوتا تھا اور صرف مرکزی حکومت محصول عائد کرنے کی مجاز تھی۔ جنگ کے بعد سے عملی طور پر صوبہ واری مالیات کو مرکزی مالیات سے بالکل علحدہ کردیا گیا ہے۔ پچاس سال قبل آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ صرف مالگزاری تھا۔ اب آمدنی کے دوسرے ذرائع مثلاً کروڑگیری اور انکم ٹیکس بہت نمایاں حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں اور بعض ذرائع مثلاً افیون جن کو بڑی اہمیت حاصل تھی اب وہ کم ہوتی جارہی ہے۔ متوازن مالیاتی زمانہ میں اب ریلوے سے بھی سرکاری مالیات میں اضافہ کی توقع کی جاتی ہے۔ اب ریلیں بار نہیں رہی ہیں۔

مرکزی موازنہ حکومت ہند کا موازنہ بابتہ ۴۲-۱۹۴۱ء ذیل میں بطور تمہید درج کیا جاتا ہے تاکہ مرکزی حکومت کے اہم ترین ذرائع آمدنی اور ابواب خرچ کا علم ہوسکے:-

مرکزی موازنہ بابتہ ۱۹۴۱-۴۲ء

آمدنی	لاکھوں روپیوں میں	خرچ	لاکھوں روپیوں میں
اہم مدات آمدنی		آمدنی وصول کرنیکے اخراجات	۴۳۶
کروڑگیری	۳۵۱۱	اخراجات سرمایہ کارہائے نمک اور دوسرے اخراجات	۰۰۰
مرکزی محاصل جنگی	۱۲۱۰	سرمایہ بہ ذمہ محاصل	
کارپوریشن ٹیکس	۱۲۶۲	ریلوے: سود اور متفرق مطالبات بموجب موازنہ ریلوے	۳۰۹۱
انکم ٹیکس بہ استثنار کارپوریشن ٹیکس	۲۳۰۰	آب پاشی	۱۰
نمک	۸۳۰	ٹپہ و تار	۷۰
افیون	۵۳	قرضوں کی ادائی	۱۲۰۶
متفرق	۱۱۱	محکمہ جات سیول	۱۳۱۱
میزان اہم مدات آمدنی	۹۲۷۷	دارالضرب اور زر	۹۷
ریلوے: خالص آمدنی بموجب موازنہ ریلوے	۴۱۰۹	کارہائے تعمیرات اور متفرق ترقیات عامہ	۳۷۶
آبپاشی: خالص آمدنی	۱	متفرق	۲۸۲
ٹپہ اور تار: خالص آمدنی	۲۱۰		
قرضہ	۶۱	مدافعت	۸۴۵۷
محکمہ جات سیول	۱۱۳		
دارالضرب اور زر	۲۲۱	مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے	
کارہائے تعمیرات اور متفرق ترقیات عامہ	۲۸	متفرق حسابات	۳۰۴
متفرق	۱۳۵	غیر معمولی مدات	۲۴۴
مدافعت	۴۴	میزان اخراجات	۱۵۸۸۹
غیر معمولی مدات	۳۰۶	بچت	۰۰۰۰۰
میزان کل محاصل	۱۴۵۰۵	صدر میزان	۱۵۸۸۹
خسارہ	۱۳۸۴		
صدر میزان	۱۵۸۸۹		

جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۲۵ء سے ریلوے کا موازنہ عام موازنہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ ریلوے سے سالانہ مقررہ آمدنی مرکزی حکومت کو ادا کر دی جاتی ہے اب مرکزی موازنہ کے خاص ابواب آمدنی پر بحث کی جائیگی۔

(۱) (الف) کروڑگیری (درآمدی محصول) حالیہ زمانہ تک ہندوستان کے محاصل آزاد تجارت کے اصول پر مبنی تھے سنہ ۱۸۸۲ء سے سنہ ۱۸۹۴ء تک عملاً درآمد پر کوئی محصول عائد نہیں کیا جاتا تھا۔ سنہ ۱۸۹۴ء سے پانچ فیصدی کا ایک عام محصول بہ لحاظ قیمت تمام اشیاء درآمد پر عاید کیا گیا جس سے چند اشیاء مثلاً سوت اور پارچہ جات کو مستثنیٰ کیا گیا۔ اس محصول کا مقصد آمد حاصل کرنا تھا ملکی صنعت کی حفاظت مقصود نہ تھی۔ سنہ ۱۸۹۴ء کے ختم پر سوت اور پارچہ جات پر بھی محصول عائد کر دیا گیا۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں پارچہ جات کا محصول ۳½ فی صدی تک کم کر دیا گیا اور اسی قدر چنگی ہندوستانی کارخانوں کے ساختہ پارچہ جات پر بھی عائد کی گئی۔ ہندوستان میں چنگی کی بہت مخالفت ہوئی لیکن سنہ ۱۹۲۶ء تک یہ باقی رکھی گئی۔ جنگ سنہ ۱۹۱۴-۱۸ء کے بعد سے محاصل میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مختلف اشیاء درآمد پر مختلف مقدار کے محاصل عائد کئے گئے۔ ابتداءً محض حصول آمدنی کی غرض سے یہ محاصل عائد کئے گئے تاکہ نظم و نسق کے زائد مصارف کی پابجائی ہو سکے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں امتیازی محصول کی پالیسی اختیار کی گئی اور اس کے بموجب چند درآمدی محاصل (جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ عمل میں آرہا ہے) بعض منتخب صنعتوں پر حمایتی اغراض کے تحت عائد کئے گئے۔ اس کے بعد ہندوستان کے نظام محاصل میں شاہی ترجیح کا خیال پیدا ہوا۔ ۲۰ اگست سنہ ۱۹۳۲ء مقام اٹاوا ہندوستان اور سلطنت متحدہ برطانیہ کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا اور اس کے بعد ۲۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء کو لوہے اور فولاد کے متعلق بطور ضمیمہ ایک عارضی راضی نامہ طے ہوا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں ان معاہدات کے بجائے ایک نیا تجارتی معاہدہ ہندوستان اور سلطنت متحدہ برطانیہ کے درمیان ہوا۔ ان معاہدوں کا واضح مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی برآمدی تجارت کو خطرات سے محفوظ رکھا جائے اور کساد بازاری سے نجات حاصل ہو اور ممکنہ حد تک ترقی کی نئی راہیں کھول دی جائیں۔ ان مراعات کے معاوضہ میں جو سلطنت متحدہ برطانیہ میں بعض ہندوستانی اشیاء کو عطا کی گئیں برطانوی اشیاء کو بھی

ہندوستانی بازار میں مماثل مراعات منظور کی گئی ہیں۔ ہندوستانی تامینی محاصل جواب تک ایک طرفہ تھے اب دو طرفہ ہو گئے ہیں۔ یعنی پہلے مختلف ملکوں کی درآمد میں چند صورتوں کو چھوڑ کر کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب دو قسم کے درآمدی محصول وصول کئے جاتے ہیں۔ ایک تو اعلیٰ محصول ان اشیاء پر جو سلطنت متحدہ برطانیہ کے سوا دوسرے ملکوں سے درآمد ہوتے ہیں۔ دوسرے ادنیٰ محصول جو برطانوی مصنوعات پر عاید کیا جاتا ہے۔ وہ بعض صورتوں میں بہ لحاظ قیمت ۷۵ فی صدی تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ ایسے اشیاء کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل اشیاء قابل ذکر ہیں۔ پارچہ جات ریلوے کا ساز و سامان، شکر، دیاسلائی، موٹریں، سینما فلمیں، گھڑیالیں، ریشمی پارچہ، تمباکو، سگار سگریٹ، کروسین پٹرولیم، چاندی، شراب اور اسپرٹ۔

(ب) کروڑگیری برآمدی محصول) سنہ ۱۸۶۰ء تک عملاً تمام برآمدی اشیاء پر تین فی صدی محصول عائد کیا جاتا تھا لیکن سنہ ۱۸۶۰ء اور سنہ ۱۸۸۰ء کے درمیان اکثر اشیاء پر محصول منسوخ کر دیا گیا۔ حالیہ زمانہ میں صرف جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات اور چانول پر برآمدی محصول قائم ہے۔ جوٹ کی پیداوار کے صوبہ جات بنگال، آسام اور بہار کو جوٹ کے برآمدی محاصل سے امداد عطا کی جاتی ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد کروڑگیری کی آمدنی میں بہت ترقی ہو رہی ہے۔ چنانچہ برما کی علیحدگی کی وجہ سے آمدنی میں خسارہ کے باوجود اس کی آمدنی سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء کے مابین ۱۱ کروڑ ۱۳ لاکھ روپے سے ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۴۵ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تک پہونچ گئی۔ آمدنی میں اضافہ کے لئے کروڑگیری کی آمدنی پر انحصار کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے[1]۔ سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء کے مابین ۳۵ کروڑ ۳۵ لاکھ روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ حالیہ جنگ کی وجہ سے کروڑگیری کی آمدنی متاثر ہوئی کیونکہ محوری ممالک سے تجارت بند ہو چکی ہے، درآمد پر قیود عائد ہو چکے ہیں اور جہاز رانی گھٹ گئی ہے۔

انکم ٹیکس | ہندوستان میں مستقل طور پر انکم ٹیکس سنہ ۱۸۸۶ء سے جاری کیا گیا۔ گذشتہ جنگ سے قبل انکم ٹیکس

---

[1] محصول جنگی کو ابتدائً محصول کروڑگیری کے تحت شامل کیا گیا تھا، اب اس کو علیحدہ کر دیا گیا ہے جس کی آمدنی کا اندازہ موازنہ بابتہ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۱۲ کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں شکر اور دیاسلائی پر عاید کیا گیا اور کروسین اور موٹر اسپرٹ پر جو ہندوستان میں تیار کیا جاتا ہے محصول آبکاری عاید کیا گیا ہے۔

کے ذریعہ سے سالانہ تقریباً تین کروڑ روپے وصول ہوتے تھے۔ شرح میں مسلسل اضافہ کی وجہ سے اب تقریباً ۲۴ کروڑ روپیہ (بشمول محصول زائد منافع وزائد ٹیکس) وصول ہوجاتے ہیں۔

۱۹۱۶ء سے آمدنی کے لحاظ سے ٹیکس کی شرح مختلف کردی گئی ہے۔ بڑی آمدنیوں پر زیادہ اور کم آمدنیوں پر کم شرح سے ٹیکس عاید کیا جاتا ہے۔ معمولی انکم ٹیکس کے علاوہ سوپر ٹیکس ان لوگوں کو ادا کرنا پڑتا ہے جن کی آمدنی ۲۵ ہزار سالانہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ انکم ٹیکس کے ترمیمی قانون بابتہ ۱۹۳۹ء کی رو سے آمدنی کے ہر جز پر تدریجی طریقہ سے شرح محصول میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ لیکن قدیم نظام کے تحت جملہ آمدنی پر ایک ہی شرح سے محصول لگایا جاتا تھا اور یہ شرح آمدنی کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی۔ جدید قانون کے تحت سالانہ آمدنی کا پہلا جز بقدر ۱۵۰۰ روپے محصول سے مستثنیٰ ہے۔ ۱۵۰۰ کے بعد ۳۵۰۰ روپے آمدنی پر فی روپیہ نو پائی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد مزید پانچ ہزار روپے آمدنی پر ایک آنہ تین پائی فی روپیہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد اگر مزید پانچ ہزار آمدنی ہو تو دو آنہ فی روپیہ ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ آمدنی پر دو آنہ چھ پائی فی روپیہ محصول مقرر ہے۔

جنگ کی وجہ سے اپریل سنہ ۱۹۴۰ء سے محصول زائد منافع پچاس فی صد عائد کیا گیا۔ منافع کی اقل ترین حد ۳۶ ہزار روپے قرار دی گئی۔ سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں محصول زائد منافع بجائے پچاس فی صد کے ۶۶ ⅔ فی صد کردیا گیا۔ محصول آمدنی وسوپر ٹیکس میں ۲۵ فیصدی سے ۳۳ ⅓ فی صدی کا اضافہ کردیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء میں انکم ٹیکس وسوپر ٹیکس کی شرح بجائے سادہ رکھنے کے درجہ واری شرح مقرر کی گئی اور بڑی آمدنیوں پر زیادہ محصول لگایا گیا۔ سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء میں انکم ٹیکس میں اضافہ کیا گیا۔ پانچ ہزار تا دس ہزار کے لئے دس پائی فی روپیہ۔ دس ہزار تا ۱۵ ہزار کے لئے ۱۶ پائی فی روپیہ ۱۵ ہزار سے زائد کے لئے ۲۰ پائی فی روپیہ مقرر کیا گیا۔ اسی سال سوپر ٹیکس میں بھی اضافہ کیا گیا۔ ۲۵ ہزار اور ۳ لاکھ کی درمیانی آمدنی پر آدھ آنہ فی روپیہ مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء میں دس ہزار تا پندرہ ہزار کے لئے ۱۸ پائی فی روپیہ اور پندرہ ہزار سے زائد کے لئے ۲۴ پائی فی روپیہ محصول عائد کیا گیا۔ سوپر ٹیکس ۳۵ ہزار تا ۲ لاکھ کی آمدنی پر ایک آنہ فی روپیہ عائد کیا گیا۔

نمک | برطانوی حکومت کو نمک کی آمدنی اور دوسرے محاصل راہ داری اپنی پیش رو حکومتوں سے

ورثہ میں ملے ہیں۔ محاصل راہ داری ۱۸۴۳ء میں موقوف کر دیئے گئے لیکن محصول نمک کو قائم رکھا گیا، اور اس میں اضافہ بھی ہوا۔ ابتداً میں اس کی شرح بہت زیادہ تھی۔ ۱۸۸۲ء میں دو روپے اور ۱۸۸۸ء میں ۲ روپے آٹھ آنے فی من تھی۔ ۱۹۰۳ء سے یہ شرح بحیثیت مجموعی گھٹ رہی ہے۔ اب ایک روپیہ چار آنے فی من ہے یا اگر ۱۹۳۱ء کے زائد ٹیکس کو بھی شامل کر لیا جائے تو ایک روپیہ نو آنے ہوتا ہے۔

محصول نمک چونکہ ضروریات زندگی پر ٹیکس ہے اس لئے غیر مقبول ہے۔ رائے عامہ اس ٹیکس کو سرے سے موقوف کر دینے کی حامی ہے۔ محصول نمک کو فوراً موقوف کر دینا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس سے ہر سال آٹھ کروڑ روپے کی آمدنی کم ہو جائے گی۔

افیون | افیون کے مد سے کسی زمانہ میں سالانہ تقریباً آٹھ کروڑ روپے کی قابل لحاظ آمدنی ہوتی تھی لیکن ملک چین میں اس کے استعمال کو دور کرنے میں مدد دینے کی غرض سے حکومت ہند نے ۱۹۰۷ء میں چین سے ایک معاہدہ کیا اور پھر ۱۹۱۱ء میں یہ معاہدہ کیا گیا کہ ہندوستان سے چین کو افیون کی برآمد میں تدریجاً کمی کی جائے گی۔ ۱۹۲۶ء میں ایک اعلان ہوا کہ سوائے طبی اغراض کے افیون کی برآمد بند کر دی جائے گی۔ چنانچہ اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔ ملک میں اس کے بطور ادویہ استعمال کرنے میں بھی باضابطہ نگرانی کی جاتی ہے۔ افیون کی آمدنی نصف کروڑ روپے سے زائد گھٹ گئی ہے۔

صوبہ واری آمدنی | اب تک مرکزی حکومت کے اہم مدات آمدنی پر بحث کی گئی۔ اب صوبہ واری ابواب آمدنی پر غور کیا جائے گا۔

صفحات (۲۴۳، ۲۵۴ تا ۲۵۶) کے تختہ جات سے اصلی آمدنی اور اخراجات کے خاص ابواب پر ایک عام اندازہ اور مختلف صوبجات میں ان کی اضافی اہمیت واضح ہو سکتی ہے۔

(۱) مالگذاری۔ باب سوم میں مالگذاری پر بحث ہو چکی ہے۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں تمام برطانوی ہند سے اس مد میں ۲۷ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی۔

(۲) آبکاری۔ برطانوی ہند میں آبکاری کی آمدنی ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۱۲ کروڑ ۶۹ لاکھ روپے ہوئی جو نشہ آور مشروبات گانجہ، ادویہ، افیون وغیرہ کی فروخت اور صنعت سے حاصل ہوئی۔ اس کی صنعت پر

محصول اور فروخت پر لیسنس فیس لگائی جاتی ہے۔ آمدنی کا بڑا حصہ سیندھی اور تاڑی وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔ کسی ضلع میں ٹھوک فروشی کا حق ٹھیکہ کے ذریعہ اور چلر فروشی کا حق ہراج کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔

آبکاری کی پالیسی کا اصلی مقصد شراب نوشی کی برائیوں کا انسداد ہونا چاہیئے، اس خصوص میں حکومت نے مشروبات پر قیمت بڑھانے پر اکتفا کی ہے، مگر پیداوار کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی راست ننگ دوکانوں کی تعداد اور مسکرات کی مقدار میں تخفیف اور فروخت کے اوقات میں کمی ترک مسکرات کے دوسرے طریقے ہوسکتے ہیں۔

غیر سرکاری رائے کا رجحان یہ ہے کہ مسکرات کی مقدار اور دوکانات کی تعداد پر پابندیاں عاید کرنے کے لئے قوانین نافذ کئے جائیں اور عام طور پر سخت نگرانی رکھی جائے، نیز صوبہ واری کانگریسی وزارتوں کے طریقۂ کار کی اتباع میں کامل ترک مسکرات کی پالیسی اختیار کی جائے۔ ایسے سخت طریقہائے کار سے بہر حال اصل مقصد کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے۔ ممکن ہے کہ اشیاء کی غیر آئینی درآمد خفیہ کشید یا اسی قبیل کی دوسری مضر عادتیں اختیار کرلی جائیں۔ یہ تمام خطرات اور مشکلات ایک عملی مدبر کے پیش نظر ہونا چاہیئے اور ان کو حل کرنے میں جرأت اور احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اس کو چاہیئے کہ آبکاری کی پالیسی کے اخلاقی پہلو پر زیادہ زور دے۔ اس سلسلہ میں اہم اور عملی اصلاحات کو محض اس لئے نظر انداز کردیئے کہ اس سے حکومت کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

۱۹۳۸ء میں حکومت مدراس کی جانب سے سیلم میں، اور حکومت بمبئی کی جانب سے احمدآباد میں ترک مسکرات کی تحریک کا نفاذ عمل میں آیا۔ حکومت بمبئی اور بہار نے بھی ترک مسکرات کی اسکیم جاری کی تھی۔

(۳) آمدنی کے دوسرے مدات ۱۹۳۹-۴۰ء میں حسب ذیل تھے:۔

عدالتی و تجارتی اسٹامپ (۱۰ کروڑ ۴۲ لاکھ روپے) فیس برائے رجسٹری دستاویزات (ایک کروڑ ۱۸ لاکھ روپے)۔ جنگلات (۳ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے) جو چوبینہ کی فروخت، چراگاہوں کی فیس وغیرہ سے حاصل ہوئی۔ بعض خاص محاصل (۴۵ لاکھ روپے) جیسے تفریحی ٹیکس، فروخت ٹیکس، پیشہ ورانہ ٹیکس

اور جائداد غیر منقولہ پر ٹیکس وغیرہ جو اصلاحات بابتہ ۱۹۱۹ء کے تحت صوبہ جاتی حکومتوں نے اپنے صوابدید سے عائد کئے ہیں۔

مملکت آصفیہ اور مالیات

۱۸۵۳ء سے قبل مملکت آصفیہ کی مالیاتی حالت ابتر تھی، نہ تو کسی خزانہ کا وجود تھا اور نہ کوئی باضابطہ حساب رکھا جاتا تھا۔ مملکت کی آمدنی قلیل تھی اور خرچ زیادہ تھا، سرکاری ساکھ بہت کم تھی اس لئے قرضہ صرف معقول ضمانت اور بھاری شرح سود پر مل سکتا تھا۔

اس زمانہ میں بھی آمدنی کا بڑا ذریعہ مالگذاری اراضی تھا جس سے تقریباً ایک کروڑ روپے وصول ہوتے تھے۔ آبکاری کی آمدنی ایک لاکھ روپے سے کم تھی۔ محصول نقل و حمل جو وقتاً فوقتاً لگایا جاتا تھا اس سے تجارت میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی تھی۔ کسی قسم کے ٹیکس کے تشخص اور وصول کرنے کا کوئی باضابطہ قاعدہ مقرر نہ تھا۔ اور یہی حالت مالگذاری اراضی کی تشخیص اور وصول کی تھی۔ چونکہ مملکت کی ساکھ باقی نہ تھی اس لئے قرضہ کی ضمانت میں اضلاع کی آمدنی مکفول کی جاتی تھی اور بعض اوقات اضلاع ہی کو ساہوکاروں کے انتظام میں دیدیا جاتا تھا۔

اخراجات میں سب سے زیادہ فوجی مصارف تھے جس میں مالگذاری اراضی کی تقریباً جملہ آمدنی کھپ جاتی تھی۔ قلیل رقم مفاد عامہ کے سررشتوں پر صرف کی جاتی تھی۔ تعلیمات پر سالانہ صرف چند سو روپیہ صرف کئے جاتے تھے اور اسی کے مساوی رقم حفظان صحت اور دوا خانوں پر خرچ کی جاتی تھی۔ انتظام ملکی پر رقم چند ہزار سے بڑھنے نہیں پاتی تھی۔ تعمیرات کے ہر قسم کے کاموں کے لئے سالانہ بیس ہزار کی رقم علیحدہ رکھی جاتی تھی۔ پایۂ تخت کے علاوہ کسی اور مقام پر باضابطہ پولیس کا انتظام نہ تھا۔ انتظام عدالت پر پچاس ہزار روپے صرف کئے جاتے تھے

۱۸۵۳ء میں جب سالار جنگ اول مدار المہام مقرر ہوئے تو آپ نے سب سے پہلے آمد و خرچ کا توازن قائم کرنے کی کوشش کی جس سے مملکت کی ساکھ بڑھ گئی۔ اس کے بعد جدید قرضے واجبی شرح سود پر لینے کا انتظام کیا گیا اور بھاری شرح سود پر جو قرضے پہلے سے چلے آرہے تھے اُن کی ادائی اس رقم سے کی گئی۔ عام نظم و نسق اور انتظام فینانس کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ حسابات کے ترتیب دینے اور اُس کی

جانچ کئے جانے کے طریقے میں بھی رفتہ رفتہ اصلاح عمل میں آئی۔ موازنہ کا طریقہ ابواب اور ذیلی مدات کی پوری ترتیب کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ اور اس سے گویا مملکت کے انتظام فینانس کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

سرسالارجنگ کے دور وزارت میں مملکت کی مالی حالت جس حد تک ترقی پذیر ہوئی اُس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک مثال پیش کرنی کافی ہوگی کہ ۱۲۔۱۸۱۱ء کی ششش ماہی اول میں صرف آٹھ لاکھ کی رقم حیدرآباد کے خزانۂ عامرہ میں وصول ہوئی تھی جو مملکت میں اس وقت ایک ہی خزانہ تھا اس مدت کے اختتام پر صرف ۱۳ ہزار کی سلک باقی رہی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں جو سرسالارجنگ کے دور وزارت کا آخری سال تھا خزانۂ عامرہ اور اُس کی دوسری شاخوں میں مجموعی وصولات کی مقدار ۳ کروڑ گیارہ لاکھ تھی اور رقم سلک کی مقدار ۱۸ لاکھ تھی۔

مملکت کی مالی حالت ۱۸۹۹ء کے قحط عظیم تک قابل اطمینان رہی جبکہ ۱۴۲،۲۷ لاکھ کی کمی آگر پڑی۔ اور اخراجات قحط کے لئے حکومت ہند سے ۳۰،۴ لاکھ روپے کلدار کا قرض لینا پڑا۔

۱۱-۱۹۰۲ء کے دہ سالہ زمانہ میں آمدنی اور خرچ کا اوسط علی الترتیب ۳ کروڑ ۴۹ لاکھ روپے اور ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے رہا۔ دہ سالہ آئندہ یعنی ۲۱-۱۹۱۲ء میں آمدنی کا اوسط ۵ کروڑ ۴ لاکھ اور خرچ کا اوسط ۵ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے رہا۔ اس زمانہ میں اخراجات کے اضافہ کے بڑے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مختلف سررشتہ جات کی تنظیم جدید اور تنخواہوں کی بڑھی ہوئی شرح کی منظوری۔

(۲) ضروریات زندگی کی گرانی کے باعث جنگ عظیم کے زمانہ میں الونس کی اجرائی۔

(۳) جدید سررشتہ جات مثلاً آثار قدیمہ، انجمن ہائے امداد باہمی، زراعت، صحت عامہ و حفظان صحت صنعت و حرفت، اعداد و شمار، سکۂ قرطاس، آرائش بلدہ اور ترقیات عامہ کا قیام

(۴) جنگ عظیم کی امداد اور جنگ کے دوسرے اخراجات۔

(۵) قیام جامعۂ عثمانیہ و توسیع تعلیم و قیام مدارس ابتدائی۔

سررشتہ داری سیبل بندی | مملکت حیدرآباد کے مالیات کی ایک نمایاں خصوصیت جس کی وجہ سے حیدرآبادی

مالیہ کو ایک امتیازی شان حاصل ہوئی وہ اسکیم ہے جو سہ سالہ تعہدات پر مبنی تھی۔ اس اسکیم کو سررشتہ داری سبیل بندی سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس طریقۂ مالیہ کا مفہوم یہ ہے کہ تین سال کے اعداد آمدنی و خرچ کا اغلب اندازہ حتی الامکان احتیاط اور صحت کے ساتھ قائم کیا جاتا ہے۔ ہر دوران تعہد جو سالانہ گنجائشیں سررشتہ جات کے لئے مہیا کی جاتی ہیں وہ سال کے اختتام پر سوخت نہیں ہوتی جو رقم غیر متصرفہ باقی رہ جاتی ہے وہ بحق سررشتہ جات جمع کردی جاتی ہے اور بوقت ضرورت استفادہ کے لئے موجود رہتی ہے۔ البتہ جو گنجائشیں جو تعہد سہ سالہ کے آخری دن تک غیر متصرفہ رہی ہوں ان کی تنصیف عمل میں آتی ہے اور نصف حصہ بحق سررشتہ جات متعلقہ جمع کردیا جاتا ہے اور باقی نصف محاصل میں بازگشت ہو جاتا ہے۔

سررشتہ داری سبیل بندی کی ابتدا ۱۹۲۳؁ء میں ہوئی جبکہ سر اکبر حیدری نواز جنگ نے بہ حیثیت صدرالمہام فینانس پہلا موازنہ پیش کیا اس طریقۂ مالیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کفایت شعاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے منظم طور پر اخراجات کئے جا سکتے ہیں محکموں کو اس بات کی ترغیب نہیں ہوتی کہ گنجائش سوخت ہو جانے کے خوف سے ختم سال سے قبل ہی خواہ مخواہ اخراجات کریں۔ سہ سالہ بجٹ کو یکمشت کسی ضروری اور اہم مد پر خرچ کرنا بدرجہا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ عجلت میں رقمیں غیر ضروری مدات پر لٹا دی جائیں۔ اس تنظیم مالیہ کے تحت ہر محکمہ کو اپنی کارگذاری دکھانے کا موقع ملتا ہے۔

سررشتہ داری سبیل بندی اسکیم کے تحت اگرچہ کہ محکمہ فینانس نے اپنے لئے یہ حق محفوظ کر رکھا تھا کہ مالیہ کی سقیم حالت کی صورت میں تعہد کے دوران میں بھی محکمہ فینانس مختلف سررشتہ جات کی گنجائشوں کو گھٹا سکتا ہے مگر گذشتہ اکیس سال میں اس کی نوبت کبھی نہیں آئی بلکہ برعکس اس کے متعدد سررشتہ جات کو ان کی منظورہ گنجائش سے زیادہ رقمی منظوریوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا چیدرآبادی مالیات پر اور بھی خوشگوار حیرت ہوتی ہے جبکہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بغیر نئے ٹیکس عاید کئے یا تنخواہوں میں تخفیف کئے ہوا کس طرح بازاری کے زمانہ میں۔

کے موازنہ سال بہ سال متوازن رہے باوجود اس کے کہ قحط سالی میں قابل لحاظ معافیاں کی گئیں اور کروڑ گیری میں بھی بعض مواقع پر تخفیف کی گئی حکومت نے اپنے خزانے سے جملہ رقم ادا کر کے کمپنی سے ۱۱½ کروڑ روپئے میں ریلوے خرید لی اس کے علاوہ حکومت ہند کے ۷½ کروڑ کلدار کے سرکاری تمسکات بھی خرید لئے گئے۔ نصف کروڑ سے زیادہ روپیہ کاروباری کمپنیوں میں لگایا گیا۔ ریلوے بسیں خرید کی گئیں۔

جدید اصول ترتیب موازنہ وقواعد منتقلی گنجائش

حکومت سرکار عالی کی مالیاتی پالیسی کی بنیاد ۲۱ سال سے طریقہ سبیل پر مشتمل تھی۔ اب ان اصولوں کو جدید العہد مالیاتی اصولوں اور تجربات کی روشنی میں جانچ کر ایک ایسا طریقہ وضع کیا گیا جس میں سبیل بندی سررشتہ داری کی تمام خوبیاں تو موجود رہیں مگر ایسے نقائص جو گذشتہ اکیس سال کے تجربہ سے ظاہر ہوئے ان کا ازالہ ہو سکے۔

طریقہ سبیل بندی کے تحت جو جزوی آزادی سررشتہ جات کو میسر آئی تو اس نے ان میں یہ عجیب وغریب ذہنیت پیدا کر دی کہ موازنہ میں ایک مرتبہ جو رقم کسی سررشتہ کے لئے رکھدی گئی وہ بالکلیہ اسی کی ملک ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اسے صرف کریں۔ سررشتہ جات کو بچتوں سے استفادہ کا موقع دینے کا مقصد تو یہ تھا کہ حوصلہ مندانہ اور سود مند اسکیمیں تیار کی جائیں تو فراہمی رقم میں دشواری نہ ہو مگر بجائے اسکیموں کے یہ بچتیں شخصی مفاد اور غیر ضروری مصارف کی محرک ثابت ہوئیں۔ بچتوں کی موجودگی اور متوقعہ بچت سے منظوریات کے سلسلہ نے جس کی نظیر ایک مرتبہ قائم ہوجانے کے بعد روک تھام مشکل ہوگئی تھی مالیاتی نگرانی اور ذمہ داری کی اساس کو مشکل کر دیا طریقہ سبیل بندی میں عملی دشواریوں کے علاوہ بعض اندرونی نقائص بھی تھے جو موجودہ اور آئندہ ہونے والے دستوری تغیرات کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ مثلاً آئینی مشاورتی کمیٹی مالیہ کو موازنہ کے بعض امور کے بارے میں بھی مشورہ دینے کا حق دیا گیا ہے۔ اب اگر حکومت موازنہ کی گنجائشوں کا تعین تین تین سال کے لئے کر دیا کرے تو مشاورتی کمیٹی کے لئے کسی مد میں کمی یا زیادتی کا مشورہ دینے کا سال بہ سال کوئی موقع ہی باقی نہ رہے گا اور اسکی افادیت متاثر ہوگی

۴۴-۱۹۴۳ء سے موازنہ سالواری بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ چونکہ قومی تعمیر کے سررشتہ جات ملک کی ترقی میں خاص اہمیت ہوتی ہے اور ان سررشتہ جات کی اسکیمیں بالعموم طویل المدت مسلک پر منحصر ہوتی ہیں اس لئے اس قسم کے ابواب خرچ کے لئے ایک سے زائد سال کے لئے مقررہ گنجائش فراہم کی جائیں گی جن کو غیر سوخت شدنی گنجائش کہا جاتا ہے۔ آئندہ سے سررشتہ داری محفوظات نہ رکھے جائیں گے البتہ جملہ سررشتہ جات کی زیر غور اور غیر متوقعہ ضروریات کے لئے ایک عام محفوظ رکھا جائیگا اور تمام سررشتہ جات اس سے سررشتہ فینانس کی منظوری سے استفادہ کر سکیں گے۔

محصول زائد منافع گذشتہ سال تک ہمارے کارخانہ داروں اور کاروباری اشخاص کو ایک بڑی سہولت یہ حاصل تھی کہ انھیں برطانوی ہند کے کارخانہ داروں کی طرح متعدد محاصل خصوصاً انکم ٹیکس اور موجودہ حالات میں زائد منافع کا محصول جنگی محاصل دینے نہیں پڑتے تھے اس طرح حالیہ جنگ کے ابتدائی سالوں میں یہاں کے کارخانہ داروں نے ان موافق حالات میں کافی منافع حاصل کیا۔ لیکن حکومت حیدرآباد نے یہ محسوس کیا کہ جو کارخانہ دار اور تاجر جنگ کے پیدا کردہ حالات سے فائدہ اٹھاکر کثیر منافع حاصل کررہے ہیں اور اس طرح عوام کو نقصان پہونچاکر دولت مند بن رہے ہیں انھیں یقیناً ان اخراجات کا کچھ حصہ ادا کرنا چاہئے جو حکومت غریب تر طبقوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے برداشت کررہی ہے اس اصول کے مدنظر حکومت سرکارعالی نے محصول زائد منافع عائد کیا ہے۔ یہ اسکیم صرف تجارت اور کاروبار سے متعلق ہے۔ اور ان میں بھی ایسے منافع جو ۲۴ ہزار سے کم ہو قابل ٹیکس نہیں ہے۔ زائد نفع میں سے چالیس فیصد کا مطالبہ ٹیکس کی بابتہ اور بیس فی صدی امانت کے بابت ہوگا۔ رقم امانت کسی وقت بھی موجودہ جنگ کے ختم ہونے کے تین سال بعد بشرح دو فیصد قابل واپسی ہوگی۔ یہ امانتی اسکیم اس قانون کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ کہ ایسی لازمی بچت زمانہ مابعد جنگ میں صنعتوں اور کاروبار کی ترقی کے لئے حاصل رہے گی۔

محصول زائد منافع حیدرآباد کے خاص حالات ضروریات اور موزونیت کے لحاظ سے مرتب

کیا گیا ہے۔ یہاں برطانوی ہند کی طرح انکم ٹیکس کا نفاذ نہیں ہے یہاں کی شرح محاصل برطانوی ہند کے مقابلہ میں بہتر ہے اور اس طرح حیدرآباد میں قایم شدہ صنعتوں کے جائز مفاد کا تحفظ ہو سکے گا۔ یہ وصول شدہ ٹیکس زیادہ تر ملک کے غریب تر طبقے اور کم مواجبی ملازمین سرکار کی حالت بہتر بنانے اور اشیاء خوردنی اور دیگر ضروریات زندگی کی مناسب قیمت پر فراہمی میں صرف کیا جائے گا۔

<u>مملکت آصفیہ کا موازنہ</u> | مملکت آصفیہ کا موازنہ بابتہ ۱۳۵۲ف مطابق ۴۳-۱۹۴۲ء ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے مملکت آصفیہ کے حقیقی ذرائع آمدنی اور حقیقی ابواب خرچ کا علم ہو سکے گا۔

صدر مدات جمع		صدر مدات خرچ	
مالگذاری	۳ کروڑ ۲۶ لاکھ ۲۰ ہزار روپے	مالگذاری	۶۰ لاکھ ۱۶ ہزار روپے
چہیتا التصولی مال	۲ لاکھ ۱۴ " "	مالگذاری آبپاشی	۷ لاکھ ۶۱ " "
چوبینہ	۳۶ لاکھ ۸ " "	چوبینہ	۱۰ لاکھ ۱۲ " "
کروڑگیری	ایک کروڑ ۴۳ لاکھ ۳۶ " "	کروڑگیری	۱۹ لاکھ ۴۰ " "
آبکاری	دو کروڑ ۴۵ لاکھ ۲۸ " "	آبکاری	۳۲ لاکھ ۹۰ " "
افیون و گانجہ	۲۰ لاکھ ۶۶ " "	افیون و گانجہ	۷۴ " "
کاغذ مختوم	۲۱ لاکھ ۵۰ " "	کاغذ مختوم	۵۸ " "
جسٹریشن	۴ لاکھ ۳۸ " "	جسٹریشن	ایک لاکھ ۶۶ " "
معدنیات	۷ لاکھ ۱۹ " "	معدنیات	ایک لاکھ ۱۶ " "
محصول پٹرول	۳ لاکھ ۵۹ " "	محصول پٹرول	۳ لاکھ ۵۹ " "
ٹیکس سواری (موٹر)	۳ لاکھ ۳۶ " "	ٹیکس سواری (موٹر)	۳ لاکھ ۴۶ " "
محصول دیاسلائی	۱۷ لاکھ ۱۱ " "		
محصول شکر	۹ لاکھ ۹۹ " "	میزان	ایک کروڑ ۴۱ لاکھ ۴۳ ہزار روپے

مد	رقم
محصول تمباکو	ایک لاکھ ۵ ہزار روپے
میزان	۸ کروڑ ۴۳ لاکھ ۴ ہزار روپے
پٹہ برار	۲۹ لاکھ ۱۶ ہزار روپے
سود	۳۷ لاکھ ۵۳ ہزار روپے
دارالضرب	۱۱ لاکھ ۳۲ " "
سکہ قرطاس	۴۵ لاکھ ۸۱ " "
ہنڈاون بٹاون	۷۸ " "
میزان	۵۷ لاکھ ۹۲ ہزار روپے
ٹپہ خانہ	۱۵ لاکھ ۶۵ ہزار روپے
آب پاشی	۴۳ ہزار روپے
ریلوے	ایک کروڑ ۳۷ لاکھ ۳۲ " "
برقی	۴ لاکھ ۹۵ " "
ٹیلیفون	۹۷ " "
صنعت وحرفت	۴۸ " "
میزان	ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ۸ ہزار روپے
انتظام مملکت	۶۲ ہزار روپے

مد	رقم
سود	۴۵ لاکھ ۴۴ ہزار روپے
سنکنگ فنڈ ادائی قرضہ	۲۸ لاکھ ۴۲ " "
میزان	۷۳ لاکھ ۸۶ ہزار روپے
دارالضرب	۳ لاکھ ۷۲ ہزار روپے
سکہ قرطاس	۴ لاکھ ۱۵ " "
ہنڈاون بٹاون	۱۵ " "
میزان	۸ لاکھ ۳ ہزار روپے
ٹپہ خانہ	۱۴ لاکھ ۲۶ ہزار روپے
امداد برائے ہوائی ڈاک	۴ " "
واجل حضور پرنور بندگانعالی	۵۰ لاکھ روپے
اخراجات سفر و ملٹری سکریٹری اعلیحضرت بندگانعالی	۴۳ ہزار روپے
اخراجات شہزادگان بلند اقبال	۱۰ لاکھ ۹۸ ہزار روپے
اخراجات صاحبزادگان	۶۵ ہزار روپے
انتظام مملکت	۴۵ لاکھ ۱۸ " "
اخراجات سیاسی	۱۰ لاکھ ۸۸ " "
ایجنٹ برار	۹۵ " "
وظائف حسن خدمت و عایتی	۵۴ لاکھ ۹۴ " "
منصب	۱۷ لاکھ ۲۷ " "

اخراجات سیاسی	۲۷ ہزار روپے
منصب	۴۵ ″ ″
فوج	۵۸ ″ ″
عدالت	ایک لاکھ ۶۰ ″ ″
مجالس	دو لاکھ ۳۲ ″ ″
کوتوالی	۳۷ ″ ″
تعلیمات	۷ لاکھ ۲۱ ″ ″
طبابت	۹۷ ″ ″
مذہبی	۱ ″ ″
زراعت	۹۸ ″ ″
علاج حیوانات	۴۲ ″ ″
انجمن ہائے امداد باہمی	۱۶ ″ ″
دفاتر خرد	۴۳ ″ ″
عمارت و شوارع	ایک لاکھ ۶۶ ″ ″
میزان	۱۷ لاکھ ۹۱ ہزار روپے
متفرقات	۴ لاکھ ۳۷ ہزار روپے
اخراجات جنگ	۱۴ لاکھ ۲۷ ″ ″
تمدنی تعاون	۱ ″ ″
	۱۸ لاکھ ۶۶ ہزار روپے
صدر میزان	۱۱ کروڑ ۹۸ لاکھ روپے
جمع	۹۸ ہزار روپے

جمعیت	۵۸ لاکھ ۶ ہزار روپے
عدالت	۲۳ لاکھ ۱۲ ″ ″
مجالس	۶ لاکھ ۶۸ ″ ″
کوتوالی	۶۰ لاکھ ۸۹ ″ ″
تعلیمات	ایک کروڑ ۱ لاکھ ۹۷ ″ ″
طبابت	۳۵ لاکھ ۹۹ ″ ″
مذہبی	۹ لاکھ ۹۶ ″ ″
زراعت	۹ لاکھ ۵۶ ″ ″
علاج حیوانات	۵ لاکھ ۸۷ ″ ″
انجمن ہائے امداد باہمی	۴ لاکھ ۶۷ ″ ″
دفاتر خرد	۵ لاکھ ۷۲ ″ ″
صفائی و صحت عامہ	۲۳ لاکھ ۵۹ ″ ″
عمارات و شوارع	۸۱ لاکھ ۷ ″ ″
آبپاشی	۱۳ لاکھ ۵۳ ″ ″
ریلوے	۱ لاکھ ۹۸ ″ ″
برقی	۷ ″ ″
طباعت	ایک لاکھ ۱۶ ″ ″
صنعت و حرفت	۳ لاکھ ۴۴ ″ ″
منتقل شدہ محفوظ قحط	۱۵ لاکھ روپے
متفرقات	۶ لاکھ ۸۳ ہزار روپے
اخراجات جنگ	ایک کروڑ ۵ لاکھ ۶۶ ″ ″
الونس گرانی	۵۷ لاکھ ۷ ″ ″
تمدنی تعاون	۶ ″ ۳ ″ ″
اسٹیٹ بنک	۱ ″ ۷۰ ″ ″
صدر میزان	۱۰ کروڑ ۹ لاکھ ۵۷ ہزار روپے

اب اخراجات سے بحث کی جائے گی اور مرکزی و صوبہ واری اخراجات کے مدات پر غور کیا جائے گا۔

عام مرکزی اخراجات موجودہ صدی کے آغاز سے اور بالخصوص گذشتہ پچیس سال سے ہندوستان کے عام اخراجات میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر مرکزی اور صوبہ واری مجموعی اخراجات کی مقدار ۱۳-۱۹۱۲ء میں ۱۲۴ کروڑ روپے تھی ۴۱-۱۹۴۰ء میں ۲۲۱ کروڑ روپے ہوگئی۔ دور جدید میں جبکہ حکومت کے فرائض میں بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ عام اخراجات میں نمایاں اضافہ دوران جنگ ۱۵-۱۹۱۴ء اور زمانہ مابعد جنگ میں ہوا۔ فوجی اخراجات جو ۱۴-۱۹۱۳ء ہی میں ۲۹ کروڑ ۸۴ لاکھ روپے تک بڑھ گئے تھے ۲۱-۱۹۲۰ء میں ۸۷ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے تک پہونچ گئے اس کے بعد سے مسلسل تخفیف کی وجہ سے ۳۹-۱۹۳۸ء میں فوجی اخراجات تقریباً ۴۵ کروڑ تک گھٹ گئے۔ اب بھی عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مناسب کفایت کے لئے مزید امکانات موجود ہیں لیکن قومی تحفظ فی الحقیقت بہت ہی اہم مسئلہ ہے اور اس کے سلسلہ میں ہر قسم کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہونا چاہئے لیکن اس کے ساتھ اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اسلئے اخراجات میں کفایت اور احتیاط ہر طرح عمل میں لانا چاہئے غیر پیدا آور مصارف سے کہ جو بالکل غیر ضروری ہوں حتی الامکان احتیاط لازمی ہے ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت نے ۸۰ لاکھ روپے برطانوی افواج کے اخراجات کے لئے منظور کئے گئے جو ہندوستان میں مقیم ہوں۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت نے سالانہ ایک لاکھ پونڈ اس شرط سے منظور کئے کہ اس سے ہندوستان کی مدافعت کے لئے ایک شاہی بحری بیڑا مہیا کیا جائے۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ کے آغاز کی وجہ سے ملک کے مدافعت کے اخراجات میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ ۴۳-۱۹۴۲ء میں فوجی اخراجات ۲۱۳ کروڑ روپے کے ہوگئے۔ جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستانی فوج کو عصری بنانے کی سفارشات جو چیٹ فیلڈ کمیٹی نے کی تھیں منظور کرلی گئیں۔

دیوانی نظم ونسق کے مصارف میں غیر معمولی اضافہ حکومت کے خلاف ایک دوسری شکایت

ہے۔ ہندوستانی نظم ونسق پر دنیا بھر میں سب سے زیادہ مصارف عاید ہوتے ہیں۔ دستوری اصلاحات سے بھی نظم ونسق کے مصارف میں کثیر اضافہ ہوتا رہا ہے فوجی اور دیوانی دونوں شعبہ ہائے نظم ونسق میں عملہ کی تخفیف اور تدریجی طور سے ہندوستانی افراد کو اس میں شامل کرکے مناسب کفایت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ قومی تعمیری سررشتوں مثلاً تعلیم زراعت، صنعت وحرفت اور آبپاشی وغیرہ پر کافی اور بڑی فیاضی کے ساتھ رقم صرف کرنی چاہئے تاکہ لوگوں کی معاشی ترقی ہوسکے۔ موجودہ زمانہ میں ان سررشتوں پر بہت ہی قلیل رقم صرف کی جاتی ہے جیسا کہ تختہ نمبر ۲ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

محاصل کا بار ٹیکس کے لحاظ سے ہندوستان میں حکومت کی آمدنی کا تناسب بعض دوسرے ممالک مثلاً سلطنت متحدہ برطانیہ کے مقابلہ میں کم ہے[1]۔ یہ تناسب جنگ سے قبل سلطنت متحدہ برطانیہ میں ۲۲ فیصدی سے زیادہ اور ہندوستان میں ۶ فیصدی تھا۔ لیکن لوگوں کی غربت کا لحاظ کیا جائے تو ٹیکس کے بار کو ہلکا نہیں سمجھا جاسکتا۔ اگر مصارف حقیقت میں قوم کے لئے سودمند ہیں تو ٹیکس کو حق بجانب تصور کیا جاسکتا ہے لیکن اس خصوص میں حالات اطمینان بخش نہیں ہیں۔

گذشتہ جنگ عظیم سے قبل مختلف جماعتوں کے مابین ٹیکس کی تقسیم غیر مساوی تھی غریب طبقہ مالگذاری، محصول نمک، چنگی، کاغذ مہور وغیرہ کے سلسلہ میں ٹیکس کا بار بہت زیادہ برداشت کرتا تھا۔ زمانۂ جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۸ء) اور اس کے بعد حالیہ جنگ میں محاصل میں تبدیلیوں کی وجہ سے اس نظام میں تھوڑی بہت مساوات قائم ہوگئی ہے۔ کیونکہ تدریجی انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس کے علاوہ تعیشاتی اشیاء پر بھی خاص محصول درآمد لگایا جاتا ہے۔ جس کا بار مالدار طبقہ پر پڑتا ہے۔ لیکن اب بھی بڑی حد تک عدم مساوات باقی ہے۔ غریب طبقہ پر جو

---

[1] ۱۹۲۸-۲۹ء میں برطانوی ہند میں ٹیکس کا بار (مرکزی اور صوبہ جاتی بشمول مالگذاری) فی شخص چار روپے دس آنہ دس پائی تھا۔ سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کی رائے میں ٹیکس کا بار فی شخص ۱۸۷۲ء میں ایک روپیہ ۱۳ آنے ۹ پائی ۱۹۰۱ء میں دو روپیہ ۶ آنے ۲ پائی ۱۹۱۱ء میں ۲ روپیہ ۴ آنے ۵ پائی اور ۱۹۲۲ء میں چھ روپیہ ایک آنہ آٹھ پائی تھا۔

غیر متناسب ٹیکس کا بار ہے اس میں تخفیف اور مالدار طبقہ پر زاید ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت ہے۔

جدید ہندوستانی مالیات جیسا کہ توقع تھی گذشتہ جنگ عظیم نے تجارت اور صنعت و حرفت کے علاوہ مالی نظام کو بھی بدل دیا۔ جنگ سے قبل موازنہ میں بچت ہوا کرتی تھی۔ جنگ کے بعد مرکزی اور صوبہ واری موازنوں میں خسارہ آنے لگا۔ تخفیف مصارف کی کمیٹی بابتہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی سفارشات کے بموجب کفایت کے مختلف طریقے اختیار کئے گئے جس کے نتیجے کے طور پر ۲۴-۱۹۲۳ء سے کچھ عرصہ تک موازنوں میں پھر بچت ہونے لگی۔ لیکن ۲۸-۱۹۲۷ء کے بعد موازنہ کا توازن درہم برہم ہوگیا۔ دنیا کی معاشی کساد بازاری کی وجہ سے بہت سے مدات آمدنی مثلاً کروڑگیری اور انکم ٹیکس بری طرح متاثر ہوگئے۔ تجارتی سررشتوں جیسے ریلوے ڈاک اور تار کی آمدنی بھی بہت گھٹ گئی۔ موازنہ میں خسارہ کی تلافی زاید کثیر محاصل سے کرنی پڑی جس کا تخمینہ تین سال ۳۳-۱۹۳۰ء میں ۴۵ کروڑ روپے ہوا۔ بہرحال اس تدبیر کی بدولت مرکزی موازنہ میں کسی قدر بچت ہونے لگی ۳۶-۱۹۳۴ء کے درمیان موازنوں کی بچت میں قابل لحاظ اضافہ عمل میں آیا۔ جس کی وجہ سے محاصل یعنی انکم ٹیکس میں تھوڑی سی تخفیف ممکن ہوسکی کروڑگیری اور انکم ٹیکس جیسے محاصل میں انحطاط کے باعث ۳۷-۱۹۳۶ء میں ایک کروڑ ۸۷ لاکھ روپے کا خسارہ رونما ہوا یہی وجہ ہے کہ شکر کی چنگی میں اضافہ کی ضرورت پیش آئی چنانچہ اس اضافہ کے بعد موازنہ کی حالت میں اصلاح ہوئی لیکن حالیہ جنگ کی وجہ سے موازنہ کی حالت میں بڑی تبدیلی رونما ہوگئی۔ اسکو بہت کو غیر معمولی اخراجات برداشت کرنے پڑے۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں پہلا جنگی موازنہ مرتب کیا گیا۔ ریلوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا مگر دفاع کے اخراجات میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے موازنہ میں خسارہ رونما ہو رہا ہے۔ اس لئے نئے محاصل لگا کر یا محاصل میں اضافہ کرکے اخراجات کی پابجائی کی جا رہی ہے۔ انکم ٹیکس، سوپر ٹیکس اور محصول زاید منافع میں اضافہ کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل اس سے قبل

بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ذرائع کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ شکر پر محصول درآمد
جنگی بجائے ڈیڑھ روپے کے تین روپے فی ہنڈرڈ ویٹ کر دیا گیا ہے۔ موٹر اسپرٹ کا محصول بجائے
دس آنے کے ۱۲ آنے فی گیلن ہو گیا ہے۔ سامان کے حمل و نقل ذریعہ ریلوے کی شرح میں $12\frac{1}{2}$
فی صد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مسافروں کے شرح ٹکٹ میں فی روپیہ ایک آنہ اضافہ ہوا ہے۔ دیاسلائی
پر صد فی صد محصول عاید کیا گیا ہے۔ مصنوعی ریشم و ریشمی دھاگے پر محصول بجائے تین آنے فی پونڈ
کے پانچ آنے فی پونڈ کیا گیا ہے۔ ٹائر و ٹیوب پر محصول جنگی دس فیصدی عائد ہوا ہے۔

۱۹۴۳-۴۴ء میں تمباکو پر محصول جنگی عاید کیا گیا جس سے تقریباً دس کروڑ روپے کی آمدنی
کی توقع کی گئی۔ ٹیلیفون، ڈاک اور تار کی شرح میں اضافہ کیا گیا۔ اندرونی ڈاک کے ہر تولہ پر
آدھ آنے، اندرونی پارسل کے لئے ہر چار تولہ کے بعد سے چار آنہ کے بجائے چھ آنے
اور ٹیلیفون کے استعمال کرنے کی اجرت پر سرچارج بجائے $\frac{1}{6}$ کے $\frac{1}{3}$ لگایا گیا۔

۱۹۴۴-۴۵ء میں چھالیہ، کافی، اور چائے پر دو آنہ فی پونڈ کی شرح سے محصول عائد
کیا گیا۔

مختلف صوبہ داری حکومتوں کی آمدنی بابتہ سال ختم ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء لاکھوں روپیوں میں

ابواب آمدنی	مدراس	بمبئی	بنگال	صوبہ متحدہ	پنجاب	کورگ	بہار	صوبہ متوسط	شمال مغربی سرحدی صوبہ	آسام	اڑیسہ	سندھ	میزان صوبہ داری حکومتیں
خاص ابواب آمدنی کروڑ گیری	-	-	۲۱٫۹۷	-	-	-	۱۹٫۲۴	-	-	۱۲٫۳۹	٫۹۲	-	۲۵۵٫۶۲
محصول آمدنی	۴۱٫۸۵	۵۵٫۸۰	۵۵٫۸۰	۴۱٫۸۵	۲۲٫۳۲	-	۳۲٫۷۰	۱۳٫۹۵	۳٫۷۹	۶٫۴۱	۵٫۵۸	۵٫۵۸	۲۸۵٫۶۳
مالگذاری	۵۱۶٫۸۴	۳۳۳٫۲۰	۳۸۶٫۱۰	۵۸۶٫۹۲	۳۳۴٫۳۰	۳٫۰۴	۱۲۱٫۲۸	۳۶۲٫۰۴	۱۸٫۵۹	۱۳۶٫۹۰	۴۶٫۹۳	۳۶٫۸۵	۲۰۰۶٫۶۵
آب کاری	۳۳۶٫۲	۳۰۲٫۱۳	۱۶۵٫۲۸	۱۱۵٫۰۴	۱۰۴٫۹۸	۲٫۰۶	۱۱۰٫۸۹	۵۶٫۳۶	۸٫۸۴	۳۲٫۹۶	۲۹٫۸۱	۳۶٫۳۳	۱۲۰۳٫۴۳
اسٹامپ	۱۶۴٫۲۶	۱۳۸٫۹۲	۱۵۶٫۴۴	۱۳۰٫۱۰	۶۴٫۵۵	٫۴۸	۱۰۵٫۰۴	۳۶٫۸۰	۷٫۰۵	۱۶٫۹۳	۱۹٫۱۲	۱۶٫۱۶	۹۶۸٫۵۶
جنگلات	۴۴٫۳۴	۳۰٫۶۱	۴۳٫۹۸	۵۲٫۶۶	۲۵٫۴۰	۳٫۲۴	۸٫۳۶	۵۰٫۴۴	۵٫۱۲	۱۶٫۳۹	۶٫۵۳	۷٫۰۶	۳۸۲٫۵۱
رجسٹریشن	۳۲٫۹۶	۱۳٫۶۷	۲۶٫۳۳	۸٫۹۱	۸٫۵۰	٫۰۶	۱۳٫۲۸	۵٫۲۵	٫۶۹	۲٫۰	۲٫۳۸	۲٫۰۴	۱۱۶٫۱۶
آمدنی تحت قانون سواری ہائے موٹر	۸۰٫۵۱	۴٫۶۸	۲۱٫۳۱	۱۲٫۱۶	۱۳٫۴۹	٫۹۳	٫۳۱	۳٫۵۶	۲٫۳۸	۴٫۰۹	۱٫۰۴	۲٫۶۸	۱۸۵٫۳۶
متفرق ٹیکس	۶۹٫۲۸	۱۹۴٫۰۳	۴۶٫۶۱	۵۰٫۹۱	۱۱٫۴۳	-	۲٫۱۱	٫۵۶	۱٫۱۳	۳٫۳۸	-	۶٫۲۶	۴۰۳٫۱۲
میزان	۱۳۰۶٫۵۸	۱۰۳۴٫۲۴	۱۲۰۴٫۸۱	۱۰۰۶٫۷۶	۹۴۶٫۸۶	۱۰٫۸۴	۴۲۴٫۳۱	۴۴۱٫۹۸	۵۶٫۰۳	۲۳۲٫۳۴	۱۱۰٫۰۳	۱۱۵٫۰۹	۶۴۱۶٫۹۰
ریلوے	-	-	٫۱۴	-	-	-	-	-	-	-	-	-	٫۱۴

کارپوریشن ٹیکس میں ایک آنہ کی بجائے ڈیڑھ آنہ فی روپیہ اضافہ ہوا ہے۔

زاید محاصل کا بار تمام طبقوں پر پڑا۔ ریلوے ٹکٹ میں اضافہ، محصول ڈاک میں اضافہ، محاصل درآمد و برآمد میں اضافہ، نئے محاصل اور چنگی کی وجہ سے غریبوں پر بار پڑا۔ امیر طبقہ بھی متاثر ہوا ہے کیونکہ انکم ٹیکس کی شرح میں ۶۶ فی صدی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح نئے محاصل کے ذریعہ حکومت نے آغاز جنگ سے ۱۹۴۳ء تک جملہ ۱۴۲ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے وصول کیا ہے۔

ہندوستان میں قرضہ عامہ | ہندوستانی قرضہ عامہ کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی کی لڑائیوں کے زمانہ سے ہوتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے حکومت ہند پر منتقل شدہ قرضہ غیر پیدا آور تھا۔ ۱۸۶۷ء کے بعد ریلوے اور کارہائے آبپاشی و نہرہ کی تعمیر کے لئے جو پیدا آور قرضہ حاصل کیا جانا شروع ہوا اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم سے قبل ہندوستان کے قرضہ عامہ کا ایک بڑا حصہ انگلستان سے حاصل کیا گیا تھا۔ دوران جنگ میں حصول قرضہ میں غیر متوقع طور پر حکومت کی سعی جو مشکور ہوئی اس سے ہندوستان کے بازار زر کی قوت کا اندازہ ہوا چنانچہ عام قرضے اب زیادہ تر ہندوستان ہی میں حاصل کئے جاتے ہیں۔ ہمارے قرضہ کا بڑا حصہ اس لحاظ سے خارجی ہے کہ وہ غیر ہندوستانیوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ بہرحاصل یہ امر باعث مسرت ہے کہ اب قرضہ عامہ کی بڑی مقدار پیدا آور ہے جو زیادہ تر ریلوے اور کارہائے آبپاشی کی تعمیر کے لئے حاصل کئے گئے ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۲ء تک حکومت ہند کا مجموعی قرضہ عامہ ۱۱۲۲ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے تھا جس میں ۸۰ کروڑ اسٹرلنگ کا قرضہ انگلستان میں ۹۴۲ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کا قرضہ ہندوستان میں حاصل کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۴ء کے ختم پر انگلستان کا اسٹرلنگ قرضہ بیباق کر دیا گیا ہے۔ اخراجات جنگ کی پابجائی کے لئے ہندوستان میں دفاعی قرضے لئے گئے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ (۱) سہ سالہ غیر سودی دفاعی تمسکات (۲) چھ سالہ دفاعی تمسکات (۳) طویل مدتی دفاعی قرضے (۴) دس سالہ دفاعی سیونگس سرٹیفکیس (۵) پانچ سالہ غیر سودی انعامی تمسکات۔

مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے مابین مالیاتی تعلقات

۱۸۳۳ء سے ۱۸۷۱ء تک تمام مالیاتی اقتدار حکومت ہند کے ہاتھ میں تھا جو صوبوں کے معمولی اخراجات کی بھی نگرانی کرتی تھی۔ لارڈ میو نے نافذ الوقت مالیاتی نظام میں تھوڑی سی لامرکزیت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی تاکہ آمدنی میں اضافہ کرنے اور اخراجات میں ممکنہ کفایت برتنے کے خیال سے صوبہ جاتی حکومتوں کی توجہ حاصل ہونے کے علاوہ باہمی اشتراک عمل بھی پیدا کیا جائے۔ چنانچہ لارڈ میو نے ۱۸۷۱ء میں صوبہ واری انتظام کا طریقہ جاری کیا جس کے تحت بعض مصارف کے مدات جنکی نوعیت مقامی تھی صوبہ جات کے تفویض کر دئے گئے۔ ان امور کے انتظام کے لئے صوبہ جات کو سررشتہ واری آمدنی کے علاوہ سالانہ یکمشت رقمی امداد بھی دی جاتی تھی۔ صوبہ واری حکومتوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ اپنے صوبوں کی کمی دور کرنے کے لئے مقامی محاصل عاید کریں۔

لامرکزیت کے اس طریقہ میں مسلسل اصلاح ہوتی گئی چنانچہ ۱۹۱۹ء سے قبل اس نظام کی حالت حسب ذیل تھی۔

آمدنی کے سلسلہ میں مرکزی حکومت نے تمام آمدنیوں کو جو کسی ایک صوبہ پر تقسیم نہیں ہو سکتی تھیں اپنے لئے محفوظ کر لئے تھے۔ ان کو شاہی مدات آمدنی کہا جاتا تھا مثلاً افیون، ریلوے، کروڑگیری، نمک، پٹہ اور تار کی آمدنی بعض مدات آمدنی بالکل صوبہ واری تھے جیسے جنگلات، آبکاری (بمبئی اور بنگال میں) رجسٹریشن بعض سررشتوں کی آمدنی مثلاً تعلیمات، عدالت اور پولیس بعض مدات آمدنی میں مرکزی اور صوبہ واری دونوں حکومتوں کا حصہ ہوتا ہے جیسے مالگذاری، محصول آمدنی، آبکاری، آبپاشی اور کاغذ مہور۔

جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے اسی قسم کا ہی ایک نظام مروج تھا البتہ قحط کے اخراجات کے لئے بالکل جداگانہ انتظام تھا جس میں مرکزی حکومت بھی حصہ لیا کرتی تھی۔

۱۹۱۹ء کے اصلاحات کے بعد سے جسکی اہم خصوصیت مالی خود اختیاری تھی منقسمہ مدات خارج کر دیئے گئے تھے اور آمد و خرچ کی نئی تقسیم حسب طریقہ ذیل کی گئی تھی۔

(۱) شاہی مدات آمدنی۔ افیون، نمک، کروڑگیری، محصول آمدنی، ریلوے، پٹہ، تار،

اور فوج (۲) صوبہ واری مدات آمدنی - مالگزاری (بشمول آبپاشی) اسٹامپ (عدالتی اور تجارتی) رجسٹریشن
آبکاری اور جنگلات

صوبہ واری عطیے | مفقود ابواب آمدنی کے نکل جانے اور بعض ذرائع آمدنی مثلاً مالگذاری اور کاغذ
مہور صوبہ جات کے تفویض کرنے کی وجہ سے مرکزی موازنہ پر بہت بڑا نقصان عاید ہوا ۱۹۲۰ء میں
مسٹن کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے عاید شدہ خسارہ کی تلافی کے لئے مرکزی حکومت کے لئے صوبوں
سے مالی اعانت کی ایک اسکیم مرتب کی - اس اسکیم کے مطابق صوبوں کے ابتدائی اقساط اس اصول
کے تحت مقرر کئے گئے کہ وہ خسارہ اٹھائے بغیر یا جدید محاصل عاید کئے بغیر ادا کر سکتے تھے - یہ قرار دیا گیا کہ
یہ ابتدائی اقساط ہر صوبہ کی حیثیت کے مطابق مستقل طور سے معیاری قرار دے دیئے جائینگے - مگر مسٹن کمیٹی
کے اس فیصلہ پر کسی نے رضامندی کا اظہار نہیں کیا اور اس کی مسدودی کا مسلسل مطالبہ ہونے لگا - مرکزی
حکومت کی مالی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہونے کے بعد ۲۶-۱۹۲۵ء اور بعد کے سالوں میں مرکزی حکومت
اقساط کی ادائی میں معافی عطا کرنے کے قابل ہوئی - ۲۹-۱۹۲۸ء سے صوبہ واری پیش کش کا طریقہ
بالکل ترک کر دیا گیا - اس کے باوجود صنعتی صوبہ جات خاص کر بمبئی اور بنگال کے اصلی شکایات
باقی رہے یعنی مستقل ضرورتوں کے لئے مرکزی حکومت کے ذرائع آمدنی مثلاً انکم ٹیکس اور کروڑگیری
میں کافی لچک ہے اس کے خلاف صوبہ واری حکومتوں کو جن ضرورت تیزی کے ساتھ وسیع ہو رہی ہیں
ذرائع آمدنی مثلاً مالگزاری اور آبکاری حاصل ہیں ان سے ضروریات کے مطابق آمدنی کا حصول بہت
مشکل ہے - ان حالات کے تحت صوبہ جات نے محصول آمدنی سے ایک خاص حصہ حاصل کرنے کے
لئے سخت جدوجہد کی بنگال اور بمبئی جیسے صنعتی صوبوں نے اس کا بطور خاص مطالبہ کیا تھا چنانچہ
محصول آمدنی سے تھوڑا سا حصہ صوبہ جات کو عطا کرنا منظور کر لیا گیا -

ہندوستان میں وفاقی مالیات کا مسئلہ | مرکزی حکومت اور صوبہ جات یعنی قائم ہونے والے وفاق کی وحدتوں کے مابین
آمدنی کی تقسیم کے اہم مسئلہ پر مختلف کمیٹیوں اور کمیشنوں نے غور کیا ہے مثلاً
سائمن کمیشن کی تین رپورٹ گول میز کانفرنس کی وفاقی مالیات کی ذیلی کمیٹی اور پیسی کمیٹی -

حکومت ہند کے قانون ہند بابتہ ۱۹۳۵ء میں جو جدید وفاقی دستور کا مبدا ہے حسب ذیل امور مقرر کئے گئے ہیں جو کل جماعتوں کے متفقہ فیصلوں پر مبنی ہیں۔

حسب ذیل محاصل وفاقی حکومت کی جانب سے عاید اور وصول کئے جائینگے۔

(۱) زرعی زمین کے سوا ورثہ جائداد حاصل کرنے پر محاصل۔

(۲) محاصل اسٹامپ، ہنڈی، چک، پرامیسری نوٹ، حوالے نامے، اعتباری کاغذات بیمہ کی پالیسیاں، عیوضی نامے اور قبض الوصول کے بارے میں۔

(۳) منتہائی محصولات، اشیاء یا مسافروں کا ریل یا ہوائی جہاز کے ذریعہ پہونچنا۔

(۴) ریلوے کے کرایہ اور سامان کے نقل و حمل پر ٹیکس۔

مندرجہ بالا محاصل کی خالص آمدنی اور ٹیکس وفاقی حکومت کی آمدنی کا جزو نہیں ہے بلکہ بعض اصول کے تحت یہ آمدنی صوبہ جات اور وفاقی ریاستوں میں منقسم ہوگی جہاں مذکورہ بالا محاصل اور ٹیکس وصول کئے جائینگے لیکن وفاقی مقننہ کو اجازت حاصل ہے کہ وفاقی مقاصد کی خاطر ان محاصل پر مزید آمدنی وصول کرے۔

آمدنی پر ٹیکس (باستثنار کارپوریشن ٹیکس[۱]) وفاقی حکومت زرعی آمدنی کو مستثنیٰ کر کے آمدنی پر محاصل عاید کرنے کے علاوہ وصول بھی کریگی۔ اس آمدنی کا ایک خاص فی صد جو بہ حکم کونسل معین کیا جائیگا صوبہ جات اور وفاقی ریاستوں کو دے دیا جائے گا کہ جہاں اس قسم کا ٹیکس ایک مقررہ سال کے دوران میں کونسل کے مجوزہ طریقہ کے مطابق وصول کیا جائے گا۔

وفاقی مجلس مقننہ کسی وقت بھی اس قسم کے ٹیکس میں وفاقی مقاصد کی غرض سے مزید اضافہ کر سکتی ہے نمک، اور برآمدی محاصل، نمک پر محصول، چنگی، وفاقی اور برآمدی محاصل وفاقی حکومت کی جانب سے عاید اور وصول کئے جائینگے لیکن وفاقی مقننہ قانون منظور کر سکتی ہے کہ اس قسم کے وفاقی محاصل کی خالص آمدنی میں سے کچھ حصہ یا تمام رقم صوبہ جات کو دی جائے۔

---

[۱] ۔ کارپوریشن ٹیکس سے مراد کمپنیوں کے منافع پر ٹیکس ہے

جوٹ یا جوٹ کی پیداوار کی برآمدی محصول کی صورت میں کم از کم خالص آمدنی کا نصف ان صوبہ جات کو دیا جائے گا جہاں جوٹ کی کاشت ہوتی ہے۔ تقسیم جوٹ کی پیدائش کے تناسب کے لحاظ سے عمل میں آئے گی۔

وفاقی مقننہ میں کوئی مسودہ قانون یا اس میں کوئی ترمیم گورنر جنرل کی قبل از قبل منظوری کے بغیر پیش نہ ہو سکے گی جو

(۱) کسی صوبہ کی مفوضہ کل خالص آمدنی یا اس کے جزو پر کوئی محصول یا چنگی عاید کرے یا

(۲) زرعی آمدنی کے مفہوم کو جس کی توضیح قانونی اغراض کے لئے ہندوستانی انکم ٹیکس کے بارہ میں کی گئی ہو تبدیل کرے یا۔

(۳) ان اصولوں کو متاثر کرے جن کے تحت رقوم صوبہ جات یا ریاستوں میں تقسیم شدنی ہوں یا

(۴) حسب صراحت بالا کوئی وفاقی زاید محصول لگاتا ہو۔

فیصلہ نیمیر | وزیر ہند نے برطانیہ کے ایک قابل مالیاتی عہدہ دار سر اوٹو نیمیر کو مقرر کیا تھا تاکہ حکومت ہند کے قانون بابتہ ۱۹۳۵ء کے مجوزہ مالیاتی موقف کی تحقیقات کرے۔ ان کی مرتبہ رپورٹ جس میں مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے درمیان مالیاتی امور کی قرار داد کی گئی ہے منظور کرلی گئی۔ اس رپورٹ میں انکم ٹیکس کی تقسیم کا اصول بہ طور خاص معین کیا گیا۔

نیمیر رپورٹ میں تین طریقوں سے صوبہ جات کی مالی اعانت کی سفارش کی گئی۔

(۱) بعض صوبہ جات کو سالانہ نقد امداد مثلاً صوبہ متحدہ، آسام، اڑیسہ، شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور آسام۔ (۲) یکم اپریل ۱۹۳۶ء کے قبل کے قرضے معاف کر دیئے جائیں۔ (۳) ساڑھے بارہ فی صدی جوٹ کا محصول جوٹ پیدا کرنے والے صوبہ جات (بنگال، آسام اور بہار) پر تقسیم کیا جائے۔ اڑیسہ کو مزید غیر متوالی ۱۹ لاکھ روپے اور سندھ کو پانچ لاکھ روپے امداد دی جائے گی۔ مرکزی حکومت کو متوالی اخراجات کے لئے ایک کروڑ ۱۲ لاکھ روپے دئے جائیں گے۔

صوبجات کو انکم ٹیکس کی حوالگی:۔ یہ مسئلہ نیمیر تحقیقات کے اہم مسائل میں سے تھا۔ رپورٹ میں محصول آمدنی کا اندازہ برما کی علٰحدگی کے بعد ۱۲ کروڑ روپے سالانہ کیا گیا ہے جس کا نصف (چھ کروڑ) صوبہ جات

کے حوالے کیا جائے گا لیکن سر آٹو نیمیر کی سفارش کے مطابق ابتدائی پانچ سالوں تک یہ آمدنی مرکزی حکومت کے حق میں محفوظ رہے گی تاکہ وہ اپنی مالی حالت مستحکم کر سکے بعد کے پانچ سالوں کے دوران میں انکم ٹیکس کی آمدنی تدریجاً صوبہ جات کے لئے قابل حصول ہوگی - اس طرح دس سال کے بعد صوبہ جات انکم ٹیکس میں اپنا پورا حصہ حاصل کر سکیں گے - سررشتہ ریلوے کے عطیات کو شامل کر کے اگر تقسیم شدنی رقم کا کوئی حصہ مرکزی حکومت کے پاس ۱۳ کروڑ روپے سے کم رہے تو انکم ٹیکس کی آمدنی صوبہ جات میں تقسیم نہیں کی جائے گی * صوبہ جات کو جزوی منافعہ حاصل ہونے تک کافی وقفہ گذر جائے گا اور اپنے کامل حصے کو حاصل کرنے کے لئے اس بھی زیادہ مدت درکار ہوگی لیکن خوش قسمتی سے مرکزی آمدنی میں اضافہ اور ریلوے بچت کی وجہ سے ۳۷-۱۹۳۶ء کے مالیاتی سالوں کے درمیان مرکزی حکومت کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ نیمیر سفارشات کی بموجب انکم ٹیکس میں سے ایک حصہ صوبہ جات کے حق میں منتقل کرے ۴۲-۱۹۴۱ء اس طرح منتقل شدہ جملہ رقم کا اندازہ چار کروڑ ۷۰ لاکھ روپے کیا گیا -

* [illegible]

سر اوٹو نیمیر کی سفارشات بہت سے متضاد نظریوں میں توازن پیدا کرتی ہے اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ وہ وفاقی مالیات کے کسی نظریہ کے بجائے عملیت اور حقیقت کے ساتھ وابستہ ہیں - نیمیر رپورٹ پر تقریباً عام طور سے بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا - تاہم اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ کوئی معقول اسکیم نہیں ہے کسی صوبہ کے حق میں اس کے اندر ایسی تبدیلی ناممکن ہے جو دوسرے صوبہ کو قابل اعتراض نہ ہو - اس کے ساتھ ساتھ صوبہ جات کے لئے آمدنی کے وسیع ذرائع مہیا کرنے چاہئیں تاکہ وہ قومی تعمیر کی خاطر نئی اسکیم جاری کر سکیں -

۱۹۴۰ء میں نیمیر اسکیم میں چند ترمیمات جنگ کی وجہ سے عمل میں آئے - صوبہ واری حکومت خود اختیاری کے قیام کے بعد سے صوبہ جات کی آمدنی اور اخراجات میں بہت اضافہ ہو گیا ہے صوبہ جات کو محصول آمدنی میں سے عطیہ مل رہا ہے - جوٹ کا محصول جوٹ پیدا کرنے والے صوبہ جات پر تقسیم ہو رہا ہے - بعض متفرق محصولات مثلاً محصول فروخت اشیاء، پیشہ وارانہ ٹیکس، شہری جائداد غیر منقولہ کا ٹیکس بھی صوبہ جات کو مل رہا ہے - تاکہ یہ رقم تعلیم اور قومی مفاد

کے سررشتہ جات پر صرف کی جائے۔

شرف الدین صاحب معتمد نمائش کمیٹی جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق فرزند ہیں، ایک طرف وہ کامل مصروفیت سے ملازمت سرکاری بجا لاتے ہیں تو دوسری طرف حیدرآباد کے عظیم کارگذار ادارہ مجلس نمائش کے روز افزوں فرائض ذمہ دارانہ احساس خدمت ملک کے ساتھ سات سال سے بجا لا رہے ہیں، اور اس کے بعد بھی اپنا وقت تالیف کے لئے بھی نکال لیتے ہیں۔

کتاب برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کی معاشی زندگی سے متعلق اجمالی حالات ایک جگہ جمع کر دئے گئے ہیں، جو مستند کتابوں سے ماخوذ ہے۔ کتاب بڑی دلچسپ اور معلومات سے لبریز ہے۔ معاشیات کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے انتہائی دلچسپ و کارآمد ہوگی۔ مؤلف نے اردو میں اچھی کتاب تالیف کی ہے۔

اخبار "صحیفہ"

میرے عزیز شاگرد شرف الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ) قابل مبارکباد ہیں کہ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ مجلس نمائش کی معتمدی کے اہم فرائض انجام دیتے ہوئے انھوں نے "ہندوستانی معاشیات کے مبادی" کے عنوان سے ایک اچھی کتاب تالیف کی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف اردو داں پبلک کے لئے مفید ہے بلکہ امتحانی نظر سے طلبا اس سے بہت کچھ استفادہ کرسکتے ہیں۔

اس تالیف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ حیدرآباد کا جابجا حوالہ دیتے ہوئے معاشیات ہند کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ فقط۔

میر محمود علی صاحب ایم اے (عثمانیہ)
ریڈر جامعہ عثمانیہ

ملنے کا پتہ

دفتر انجمن امداد باہمی بلاسودی طیلسانیین عثمانیہ

نمائش گاہ۔ باغ عام۔ حیدرآباد دکن